

کراچی کے انٹرنیٹ کے اسٹارٹ اپ کے سب سے بڑے

ماہنامہ
سے افق



URDU

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdufiles.com

aanchalpk.com aanchalnevel.com

Digitized by Google

رنگارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ جریہ

ان فاق

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیئر آف کامرس

پاکستان (فی پرچہ) 50 روپے

پاکستان (سالانہ) 600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com

aanchalnovel.com

naeyufaonline magazine

aanchalpk.com/blog

editorufaq@aanchal.com.pk

مدیر ایصال
محمد علی امجدی
مدیر
اقبال پبلی
گروپ ایڈیٹر
سید امجدی
نواب

جلد 42

شمار 09

اکتوبر 2018

NAEYUFAQ
PUBLICATION

12

گفتگو

اقبال بیٹی

10

دستک

مشتاق احمد قریشی

22

حصار

امجد جاوید

20

اقراء

طاہر قریشی

68

عکسِ ذات

محمد عرفان رامے

58

زندگی

مہتاب خان

114

وہ تیس دن

عمارہ خان

102

بہروپیہ

خلیل جبار

134

پروڈکشن ہاؤس

بلال شیخ

پبلشر مشتاق احمد ترمیٹی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ انجمن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹینڈیم کراچی
دفتر نمبر 77 منیرہ جیمبر ز عبد اللہ ہارون روڈ کراچی

166

چاہ عمل

ماہرِ ارباب

142

مستقبل کے لکھاری

زرین قمر

186

فن پارے

ادارہ

170

چاہت

صبا احمد خان

236

ذوق آگہی

سیاس گل

220

ابن صفی کے کردار

عابی خاں

244

مرشد

ساحر حمیل سید

240

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

000

کترینیں

ادارہ

خلافت کتابت کتبناہنا سے اف پی پی سی 874 لاہی 74400 فون نمبر 2/356203771-021

لیکس 021-356203773 کے ذریعہ معلومات سے اف پی سی کی شہنشاہی سیل info@anchal.com.ph

بہان متی نے کنبہ جوڑا

ایکشن تمام ہوئے جو ہوتا تھا وہ ہو چکا کرنے والوں نے جو کرنا تھا جیسے کرنا تھا کر لیا اب مار پیچے پکار کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تمام غیر متوقع طور پر شکست خوردہ جماعتوں نے ایک آل پارٹی کانفرنس کا انعقاد کیا مکمل تک جو ایک دوسرے کے نیچے ادھیڑ رہے تھے وہ اب ایک جا ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور آنے والی حکومت جس تک ان تمام کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا ان کے لیے اقتدار کے انگوڑے کھٹے ہو گئے ہیں لیکن اب سب مل جل کر ان کھٹے انگوڑوں پر ہی جھپٹا مارنے کی فکر میں ہیں کہ کیسے آنے والوں کے اقتدار میں اڑچن ڈالی جائے پہلے تو انتخابات کو یکسر روک دینے کا اعلان فرمایا گیا اسمبلی میں نہ جانے نہ حلف اٹھانے کی تدبیر بنائی گئی پھر سوچا ایسا نہ ہو کہ دوسرا معرے اڑالے ہم پیچھے رہ جائیں پھر اس ستر در کردہ انتخابات کے نتیجے میں کامیاب ہونے والی جماعتوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اسمبلی میں جانا ہے اور حلف بھی اٹھانا ہے لیکن اپنی اوقات کے مطابق پھر احتجاج ہر طرح سے ہر طرف سے کرتا ہے ابھی تو ابتدائے عشق ہے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

نئی حکومت بنانے والی جماعت تحریک انصاف کے سربراہ جناب عمران خان صاحب تو متوقع وزیر اعظم ہو سکتے ہیں انہوں نے حکمرانی کے بارے میں جو خواب دیکھے ہیں اور ان خوابوں کو قوم تک پہنچایا بھی خودیوں کو کیسے تعبیر ملے گی یہ ایک مشکل سوال ہے عمران خان صاحب جو کل تک بر ملا یہ کہتے رہے کہ انتخابات کے نتیجے میں آزاد حیثیت سے کامیاب ہونے والے بکا ڈال ہوتے ہیں ایسے بکا ڈال کا ہماری جماعت میں کوئی کام نہیں ہم کو اگر پھر پور مینڈیٹ نہ ملا تو ہم اپوزیشن میں بیٹھنا پسند کریں گے کل تک جو چور ڈاکو تھے جنہوں نے قوم کا پیسہ دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا اب وہ رفیق اور رہنما بن گئے ہیں ایم کیو ایم جو کل دہشت گردوں کی جماعت تھی ایکشن تک ان کا نام لیما تک پسند نہیں کیا جا رہا تھا اب وہی جماعت مجبوری بن رہی ہے اب ان کی شرائط ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں سب سے اہم بات جو خان صاحب نے فرمائی تھی کہ وہ وزارت عظمیٰ کا حلف قصر صدارت میں نہیں اٹھائیں گے وہ حلف عوام کے درمیان پر یڈ گراؤنڈ میں اٹھائیں گے لیکن ایمپائر نے انکی اٹھادی حلف قصر صدارت میں ہی اٹھایا جائے گا خان صاحب ابھی تو ابتدا ہے ابھی سے آپ کی مرضی کیخلاف سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ مسند اقتدار تک پہنچنے کے لیے مصلحت پر مصلحت کرتے چلے جا رہے ہیں آپ نے کہا تھا اور بار بار کہا تھا جلسہ عام میں کہ ہم آگے آگے تو بیرونی قرضوں کا سھلول توڑ دیں گے ہم ہرگز آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے بھیک نہیں مانگیں گے لیکن آپ کے متوقع وزیر خزانہ نے اقتدار ملنے سے پہلے ہی آئی ایم ایف کے بیل آؤٹ پیج کا فرمان جاری کر دیا آپ کس کس بات پر مصلحت کریں گے آگے آگے ہم ہر قدم پر آپ جو چاہیں گے جیسا چاہیں گے عمل کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں ہوں گے آپ کو یونہی بلا وجہ تخت نشین نہیں کیا جا رہا جہاں آپ نے اپنی من مانی کرنے کی کوشش کی وہیں دھڑن تختہ کر دیا جائے گا کیونکہ ہونے والے انتخابات نے بہت کچھ واضح کر دیا ہے سب کچھ وہاں نہیں ہے جیسا کہ نظر آ رہا ہے حقیقت کچھ اور ہے جس پر ناپ کی ناپ کے مخالفین کی نظر جا رہی ہے ابھی تو سب اپنی جی ڈھکست کا جشن منا رہے ہیں۔

حقیقی منصوبہ سازوں نے بہت سوچ سمجھ کر بساط بچائی ہے۔ ٹیکو کریت حکومت کے لیے ضروری تھا کہ نایدیدہ قوتوں نے مسلم لیگ ن میں جتنے مناسب سمجھے بغیر کر کے اسے اپنی قوت کا احساس دلادیا جو وہ کر چکے اب تحریک انصاف اور

متوقع وزیر اعظم عمران خان جو اپنی عوامی طاقت کا مظاہرہ کنٹینر پر چڑھ کر دکھائے ہیں اب ان کی باری ہے تاکہ فیکو کریٹ حکومت کو کسی عوامی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے عوام خوش دلی سے آنے والی ٹینگو کریٹ حکومت کو خوش آمدید کہیں۔

سابقہ حکمران میاں نواز شریف جب تیسری بار وزارت عظمیٰ پر براجمان ہوئے تو انہیں یہ احساس ہوا کہ ان سے زیادہ طاقت و راور با اختیار اس مملکت خدا داد پاکستان میں کوئی اور نہیں بھرتی ان کے رویے ان کے سلجے میں فرق آتا گیا اور پھر انہوں نے نادیہ قوتوں اور آسانی مخلوق کے حوالے دینا شروع کر دیے اور انجیلٹنٹ اور نوکر شاہی سے نکرانے کی راہ پر چل پڑے جس کا حشر انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف دیکھا بلکہ بھگتا بھی مقتدر وزیر اعظم ہوتے ہوئے انہیں حقیقی حکمرانوں نے ایک معمولی اقامہ کے حوالے سے نہ صرف نا اہل کر کے گھر بھیج دیا اور آگے چل کر جب میاں صاحب کی زبان زیادہ لمبی ہونے لگی تو پہلے انہیں عدالت کی پیشیوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی گئی جب میاں صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تو انہیں سخت ترین سزا اور جرمانے سنا کر جیل میں ڈال دیا گیا حالانکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی قوت سے ہونے والے انتخابات کی بازی مار کر انجیلٹنٹ کو کرار اجواب دیں گے اسی زعم میں وہ سزا کے باوجود خود چل کر وطن واپس آئے تھے لیکن وہ کچھ نہ ہوسکا جس کی انہیں امید تھی ان کی اپنی بساط الٹ دی گئی اب چاہے وہ جو کر لیں نہ صرف وہ خود بلکہ ان کی پارٹی بھی اقتدار سے محروم کی جا چکی ہے وہ نادیہ قوت، وہ خدائی مخلوق یا وہ انجیلٹنٹ جس کو وہ سمجھ رہے تھے کہ انھیں لوں پر بٹھا سکتے ہیں اس نے خود ان کو ہی انھیں لوں پر بٹھا دیا ہے۔

وطن عزیز میں انتخابات مکمل ہو چکے ہیں نتائج آچکے ہیں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو چکا ہے جلد ہی اقتدار نئے آنے والے کے سپرد کر دیا جائے گا اب نئے آنے والوں کا امتحان شروع ہوگا اگر عمران خان صاحب نے وہی روش اختیار کی جس کا وہ اظہار کرتے رہے ہیں اور من مانی کرنے کی کوشش کی تو وہ دن دور نہیں جب انہیں بھی وہ دن دیکھنا پڑے گا جس کی وہ تو کیا کوئی بھی امید نہیں کر سکتا۔

ہمارے ایک دوست تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ نادیہ قوت نے یہ ساری کارروائی بہت سچ سمجھ کر ڈالی ہے اس نے پہلے میاں نواز شریف کو خوب موع دیا پھر ان کی گردن سے اتفاق کا کا سیریا نکالا ہے اور انہیں گھر کا رکھنا کھٹ کا میاں صاحب اگر سیدھے سیدھے چلتے رہتے تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن میاں صاحب اور ان کے حواری یہ سمجھنے لگے تھے کہ سب کچھ وہی ہیں قانون عدلیہ سے وہ ماورائیں کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اسی وجہ سے انہوں نے تحفظ ختم نبوت کے قانون کو اپنی ہوشیاری کا شکار کرنے کی کوشش کی جس کی سزا انہیں اسی دنیا میں دے دی گئی ہے نادیہ قوتیں جو بھی ہیں وہ وطن عزیز کو عزیز تر بناتی ہیں وہ اسلام اور خاتم النبیین کو اہم جانتی ہیں ان کا ایمان ان کی جان اسلام اور وطن عزیز جو اسلامی مملکت ہے پرندارتی ہیں تجزیہ نگاروں کا ماننا ہے کہ جس طرح میاں نواز شریف نے ان کے ساتھیوں نے بظاہر نادیہ قوتوں کے حوالے سے اپنے کالے کارناموں کو لکی بٹھا اور سلامتی بنا کر پوش کرنے کی کوشش کی جس میں وہ منہ کے بل گر چکے ہیں اب نئے آنے والے متعدد افراد جو پہلے ہی اقتدار کے زعم میں مبتلا نظر آ رہے ہیں وہ سب کچھ کر رہے ہیں جس سے وہ انتخابات میں ہارنے اور پہلو تہی کرنے کا ذکر کرتے رہے ہیں اگر وہ وہی کچھ کرنے کھڑے ہو گئے جو چاہتے ہیں وہ اگر زبردستی اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنا چاہیں گے جو ان کو اقتدار تک پہنچانے والی قوتوں کی مرضی بخلاف ہوا تو پھر وہ بھی تیار ہیں گھر جانے کے لیے وہ نادیہ قوتیں اتنی طاقت و راور مضبوط ہیں وہ جو چاہے کر سکتی ہیں تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ عمران خان صاحب کی حکومت چھ ماہ یا بہت زیادہ چلائی گئی تو ایک سال پھر وہی ہوگا جو ماضی میں ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کے لیے ہوتا آیا ہے وطن عزیز کی تاریخ کے لیے وہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ ایسا تو ماضی میں بھی ہوتا رہا ہے تمام سیاسی کھلاڑی اپنی اپنی بساط لپٹ کر خاموشی اثر رکھ کر اوڑھ ہونے میں ہی آفیت جانتے ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ وطن عزیز اور تمام اہل وطن کو ہر طرح سے ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھے آمین۔



گفتگو

اقبال بھٹی

”حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بندے کا معاملہ بھی عجیب ہے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو وہ اسے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے خیر ہی ہے۔“
(مسلم)

عزیزان محترم سلامت باشد و سال نو مبارک ہو۔

اسلامی سال نو ہمارے لیے دو دکھ بھری خبریں لے کر طلوع ہوا ہے پہلی تو نئے افق بلکہ کراچی سے شائع ہونے والے تمام ڈائجسٹوں کے دیرینہ رفیق ذاکر حسین کی جدائی کی خبر ملی، ہر وقت تھمتے بکھیرنے والے ذاکر بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نئے افق اور نیارخ کے سیکڑوں سرورق ان کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھے ہمیں اس خبر پر ابھی بھی یقین نہیں آ رہا یوں لگتا ہے وہ دفتر کا دروازہ ابھی کھولیں گے چائے کا کہیں گے اور کوئی تازہ لطفہ سنا کر دفتر کو زعفران زار کر دیں گے انہوں نے اپنی زندگی میں سیکڑوں شاگرد بنائے لیکن وہ فن کی اتنی بلندیوں پر تھے کہ کوئی بھی ان تک نہ پہنچ سکا اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل دے دوسری خبر ہمیں رات گئے ملی کہ اے پی این ایس کے ہمارے ساتھی روزنامہ قومی اخبار کراچی کے بانی اور ایڈیٹر الیاس شاہ کرطویل علالت کے باعث چل بے ان کی جدائی سے صحافت کا ایک باب بند ہو گیا انہوں نے شام کو شائع ہونے والے اخبارات کو ایک نئی جہت و انداز دیا ایک نمائندے کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کرنے والے الیاس شاہ نے قومی اخبار کو صف اول کا نہ صرف اخبار بنایا بلکہ نئے آنے والے نوجوانوں کے لیے اکیڈمی میں تبدیل کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔

محترم ابن صفی کے چاہنے والوں اور ابن صفی فینز کلب کے ساتھیوں کا ہم پر دباؤ ہے کہ ہم ہر ماہ برصغیر کے عظیم مصنف کے حوالے سے کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیں سو اس ماہ محترم ابن صفی کے

کرداروں پر ایک مضمون شامل اشاعت ہے ان شاء اللہ آئندہ ماہ سے ہم نئے افق میں گوشہ ابن صفی کے حوالے سے کچھ صفحات مختص کریں گے جس میں ان کے چاہنے والوں کی ان کے فن اور کرداروں کے حوالے سے تحریریں شامل ہوں گی۔

محمد رفاقت..... واہ کینٹ۔ جناب محترم اقبال بھٹی صاحب اور تمام اسٹاف کو میری طرف سے عید قرباں مبارک ہونے افق پھولوں کا گلہستہ بنا میرے ہاتھوں میں ہے میں اس کی مہک میں آپ کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی ہر ایک کہانی ایک پھول کی مانند ہے جس سے یہ پھولوں کا گلہستہ بن گیا ہے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے گزری حکومت اور آنے والی نئی حکومت کے بارے میں کافی کچھ لکھ دیا ہے عزت اور ذلت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے کون ہے جو اس کے حکم کی نفی کرے وہ عزت دے کر بھی اپنے بندوں کو آزما رہا ہے اور اقتدار واپس بھی لے لیتا ہے۔ خطوں میں کچھ بہتری آئی ہے اور تعداد بڑھ رہی ہے روینہ خالد، عبداللہ جمالی، نئے لکھنے والے ہیں ویکم جناب دوسرے خط جو محترم ریاض حسین قمر صاحب، جاوید احمد صدیقی صاحب، پرنس افضل شاہین صاحب نے میرے خط کو پسند کیا سب کا شکریہ، آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب پہلی کہانی حصار جو 22 صفحے سے شروع ہو کر 83 صفحے پر ختم ہوئی اس نے تو آدھا رسالہ ہی کور کر لیا ہے کہانی ”اعتراف“ اپنے اندر اس زمانے کی تصویر دکھا رہی ہے اچھی کہانی ہے ”عورت نامہ“ نے بھی متاثر کیا کہتے ہیں کہ حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر کمزور لوگ اپنی عزت کی خاطر بہت کچھ برداشت کرتے ہیں ”تیسری جنگ عظیم سے پہلے“ بڑی طاقتیں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے اس طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں کہ وہ نہ صرف انسانوں کو غلام بنالیں بلکہ حکومتوں کو بھی اپنے جال میں پھانس لیں یہ ہی ہو رہا ہے باقی کہانیوں میں سفید ہیولا، آسیب، بکرا چور بھی اچھی کہانیاں ہیں مرشد کی قسط نمبر 15 بھی ہو چکی اسی طرح ”وہ تیس دن“ بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ محترم خلیل جبار کی کہانی ”شناخت“ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی مبارک باد قبول ہو۔ بد صورت محترم عثمان غنی، ہماری چاہ، بنت حواء، رقیب جان، سلمان بشیر، بانو، عدنان عباسی، سمجھدار، زرینہ مریم، کالک فرحین ناز طارق اور دیدہ دل بھی عزیز صاحبہ کی اچھی کہانیوں میں شمار کی جاسکتی ہیں ان سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ذوق آگاہی بہت خوب صورت انداز میں ترتیب دی گئی ہے غزلیں اور نظمیں بھی پسند آئی ہیں ان میں پرنس افضل شاہین کا انتخاب بہت اچھا ہے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال سے لکھتے ہیں السلام علیکم ماہ ستمبر 2018ء کا

شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے منفرد ورق لیے شمارہ دل کو بھا گیا دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب الیکشن اور اس کے بعد کے حالات پر تبصرہ کر رہے ہیں ان کا مطالعہ اور معلومات بہت وسیع ہیں ان کا تجربہ لامحدود ہے اور سب سے بڑھ کر جرأت ہے کہ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں موجودہ حکومت کو اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے ویسے ایک بات ہے جتنے وعدے کیے گئے ہیں ان کو پورا کرنا ناممکن ہے بہر حال عوام نے اچھی توقع رکھ کر منتخب کیا ہے اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف جاوید احمد صدیقی بھائی آپ کا خط محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے پھر خط تو آدمی ملاقات ہوتی ہے کبھی پوری ملاقات بھی ہو جائے گی ان شاء اللہ آپ کا تبصرہ حسب معمول جاندار اور شاندار ہے میری کہانی کو پسند کرنے کا شکریہ پرنس افضل شاہین آپ کا خط اور قطعہ خوب صورت ہے میری حوصلہ افزائی کرنے کا شکریہ ملک عارف اعوان آپ بھی نئے افق کے پرانے قاری نکلے میری طرح آپ بھی ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں اب خوب مطالعہ کریں اور ہر ماہ نئے افق میں خط بھیجیں اقرا جٹ کی انٹری بھی خوب ہے میری کہانی کو پسند کرنے کا شکریہ اگلا خط ہے جناب رفاقت صاحب کا آپ کی نئے افق کے ساتھ رفاقت خوب ہے ہر ماہ حاضر ہوئے ہیں اور خوب صورت خیالات والے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں مجھے یاد رکھنے کا شکریہ اور خط پسند کرنے کے لیے مہربانی ریاض حسین قمر بھائی کیا حال چال ہیں؟ مجھے یاد رکھنے اور میرے تبصرے کو پذیرائی بخشنے کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے روبینہ خالد ویل کم اب آپ کو ہر ماہ باقاعدگی سے آنا پڑے گا یہاں آنچل کی طرح مرد و زن کی قید نہیں ہے عبد اللہ جمالی ویل کم آئندہ بھر پور تبصرے کے ساتھ آئے گا خوش بوئے سخن میں سارا انتخاب تعریف کے قابل ہے۔ اب بات کرتے ہیں ذوق آگہی کی اس میں ویسے تو سارا انتخاب ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ لیکن ریاض حسین قمر پرنس افضل شاہین، ایم حسن نظامی، محمد رفاقت کا انتخاب بیسٹ ہے اس بار فن پارے بہت اور باعث عبرت ہیں سب لکھاریوں نے خوب لکھا کسی ایک کی زیادہ تعریف کرنا زیادتی ہوگی آپ کا انتخاب لاجواب ہے اس بار ایم زلیخا بکر اچورے لے کر آئے اس بار بھی ہم سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی ہلکی پھلکی طنز و مزاح کی کہانی ہوگی لیکن یہ ایک سنجیدہ موضوع نکلا بعض لوگ بیٹیوں کے پیدا ہونے پر منہ بناتے ہیں اور بیٹیوں کے پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں مٹھائیاں بانٹتے ہیں اور جب یہی بیٹے سفید بالوں میں خاک ڈالنے کا باعث بنتے ہیں بہر حال اچھی کہانی ہے عمارہ خان کی وہ میں دن بھی اچھی جا رہی ہے امجد جاوید ایک منجھے ہوئے لکھاری ہیں ان کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے حصار کے پہلے ہی حصے نے اپنے حصار میں لے لیا ہے

اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ سلیم اختر صاحب ہمیشہ حساس موضوع پر لکھتے ہیں وہ معاشرے کے ناسور پر نشتر چلانا خوب جانتے ہیں ان کی تازہ کہانی اعتراف بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے بہر حال یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک اہل حقیقت ہے کہ ماں باپ کی چپقلش اور لڑائی اولاد پر ہمیشہ منفی اثر ڈالتی ہے لیکن طاقت کے زعم میں مبتلا ہو کر بے بس مجبور اور لاچار لوگوں پر ظلم کرنے کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے جیسا چھوٹے سردار کا ہوا، ویل ڈن عورت نامہ نفیسہ سعید کی ایک اچھی کہانی ہے آگ اور پانی کا ملاپ ہمیشہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلاتا ہے ناظمہ نے جو بے وقوفی کی وہ سمجھ سے بالاتر ہے کہتے ہیں عورت قبر پر آئی ہوئی سوکن بھی برداشت نہیں کرتی پھر ناظمہ نے کیسے برداشت کر لیا بہر حال ناظمہ جیسے کردار معاشرے میں مل جاتے ہیں واقعی عورت ایک پہیلی ہے۔

پرنس افضل شاہین کا بہاولنگر سے محبت نامہ۔ اس بار ستمبر کانٹے افق پڑھا سرورق دیکھ کر یہ قطعہ ہونٹوں پر پھلنے لگا۔

یوں مجھ کو نگاہوں کے ترازو میں نہ تو لو
ہے شوق تو بے ساختہ آنکھوں میں سمو لو
اب کے دل کو میں لایا ہوں ہتھیلی پر سجا کے
اس حسن کے بازار میں کیا دام ہیں بولو

دستک انکل جی خوب لکھتے ہیں جی ہاں ہارنے والی جماعتیں ہمیشہ بھی رونا روتی ہیں کہ دھاندلی ہوئی ہے جبکہ اس بار شفاف الیکشن ہوئے ہیں اور ہاں جو تاجر ہوگا اس نے تجارت ہی کرنی ہے دو کے چار اور پانچ کے دس بنانے کے چکروں میں اس ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ نیا وزیراعظم عمران خان جو ایک تبدیلی کا نام ہے کرکٹ میں بھی وہ لڑتا تھا اور ورلڈ کپ جتا گیا اور جب انسانیت کی خدمت کا وقت آیا تو اس نے شوکت خانم کینسر اسپتال بنوایا پھر تعلیم کے لیے نمل یونیورسٹی بنائی اب ان شاء اللہ تعالیٰ پاکستان کی تقدیر بدلنے کے لیے عمران خان کو اللہ تعالیٰ نے چنا ہے ہر معاملے میں بچت کا سلسلہ جاری و ساری ہے وزیراعظم کے چون ملازمین تھے باون کی چھٹی کرا دی گئی ہے صرف دو ملازم رکھے گئے ہیں اور اسی گاڑیوں کے ریوڑ میں سے صرف دو گاڑیاں رکھی ہیں باقی نیلام ہوں گی نواز لیگ کے کارکنوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پولی لگا کر نواز شریف کے زیر استعمال گاڑیاں خریدیں تاکہ قومی خزانے میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع ہو عمران خان ہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کیا گفتگو میں جاوید احمد صدیقی جی ہاں ہارنے والے زخم چاٹ رہے

ہیں آپ نے میرا خط بہاولنگر کی بجائے بہاولپور سے شائع کیا ملک عارف اعوان آپ نے افق کے پرانے پڑھنے والے ہیں ہمیں خوشی ہوئی منجمن آباد کی پہچان اقرا جٹ میں غائب نہیں تھا مجھے غائب کر دیا گیا ہے چلیں اس بار تو حاضر ہوں ناں، ہم بھی پانی منجمن آباد والوں کو آواز دیں گے کہ وہ آئیں اور نئے افق پر چھا جائیں ریاض بٹ میری تحریر پسند فرمانے کا شکریہ۔ محمد رفاقت میں بھی آواز میں آواز ملا کر اعلان کر رہا ہوں کہ پرانے لکھنے والے حاضر ہوں ریاض حسین قمر میں بھی آپ کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں عبداللہ جمالی ہم آپ کو نئے افق میں پہلا خط لکھنے پر خوش آمدید کہتے ہیں شکر ہے اس بار خطوط کی تعداد نوٹھی ذوق آگئی میں ایم حسن نظامی، یعنی غزل، حسین خواجہ، زرینہ الیاس، ماریہ کنول، خوش بوئے سخن میں عبدالجبار رومی، نبیر رضوی، حارث بلال، راشد ترین، خالد ایاز ساحل، قدیر رانا، عمیس احمر چھائے رہے یہ افق کا ریکارڈ ہے کہ وقت پر شائع ہوتا ہے اور پچیس تاریخ سے پہلے پہلے پاکستان بھر میں دستیاب ہوتا ہے اور اس کا کوئی شمارہ التوا کا شکار نہیں ہوا ہمیں اپنے نئے افق سے پیار ہے عشق ہے محبت ہے خدا حافظ۔

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم سے رقم طراز ہیں مدیر محترم جناب اقبال بھٹی صاحب سلام مسنون یقین کامل ہے کہ آپ مع اپنے اسٹاف کے خیریت سے ہوں گے ماہ ستمبر کا نئے افق میرے ہاتھ میں ہے یہ وہ مہینہ ہے جس میں پاکستان کے ازلی دشمن رسوائے زمانہ بھارت نے ہم پر غیر اعلانیہ جنگ مسلط کر دی اس کی بدست فوج نے سوچا کہ واہگہ بارڈر پر پاکستانی ریجنر کو روندتے ہوئے لاہور کے کسی ہوٹل میں ناشتہ کریں گے مگر اسے وہ منہ کی کھانی پڑی کہ اسے آج تک یاد ہے اس سترہ روزہ جنگ میں بھارتی افواج کی وہ درگت بنی کہ وہ اسے فراموش نہیں کر پائے گا بھارت کے ایک بہت بڑے علاقے پر فخر زمانہ پاکستانی افواج کا قبضہ ہو گیا پھر ہمیشہ سے دوغلی پالیسی پر عمل کرنے والے روس نے اپنے بغل بچہ بھارت کو بچانے کے لیے جنگ بندی کرائی اور نام نہاد معاہدہ تاشقند کے ذریعے بھارت کا مقبوضہ علاقہ اسے واپس دلوا یا اس وقت کے بھارت کے ٹھکے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو اپنی اس کامیابی پر اتنی خوشی ہوئی کہ اس کا دل پھٹ گیا اور وہ جہنم واصل ہوا دیکھیں اتنا عرصہ گزرنے پر بھی بھارت نے تقسیم ہند کو تسلیم نہیں کیا اب وہ رسوائے زمانہ ملک پانی کا ہتھیار استعمال کرنے پر تیار ہوا ہے اور سندھ طاس معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ممنوعہ دریاؤں پر مسلسل ڈیم بنائے جا رہے تاکہ پاکستان کو بھی پانی روک کر ویران کرے اور کبھی خلاف توقع پانی چھوڑ کر اس کی فصلیں تباہ کرے جس طرح اس نے جوں کسمیر پر غاصبانہ

قبضہ جمار کھا ہے اور وہاں مسلمانوں کی نسل کشی کر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور جس ڈھٹائی سے وہ نام نہاد اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پس پشت ڈال رہا ہے وہ بھی روز روشن کی طرح ہے یہ سارے حقائق میں نے پاکستانی نوجوانوں کے لیے لکھے ہیں جن کے کندھوں نے اس ملک کا بوجھ اٹھانا ہے جن کی غیر محسوس طور پر برین واشنگ کی جارہی ہے انہیں انٹرنیٹ پر بخش پروگراموں کے ذریعے گمراہ کیا جا رہا ہے انہیں اللہ کے آخری اور سچے دین، دین اسلام سے دور کیا جا رہا ہے اس گناہگار نے گزشتہ رمضان شریف میں نماز تراویح کے دوران اولیٰ پونی عشاق کی نماز پڑھ کر مسجد سے بھاگتے ہوئے نوجوانوں کو دیکھا ہے۔

وطن کی فکر کرنا نادان مصیبت آنے والی ہے

تری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

ستمبر کے نئے افق کا سرورق بہت خوب صورت ہے جس کے لیے مصور کی تعریف نہ کرنا برے درجے کی زیادتی ہوگی دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کے قلم سے جو حقائق نکلے ہیں وہ حرف بحرف حق اور سچ ہیں گفتگو کے آغاز میں بھٹی صاحب آپ نے بھی حقائق کو بیان کیا ہے اور نئے وزیر اعظم کی کامیابی کی دعا فرمائی ہے ہم اس پر آمین کہتے ہیں کرسی صدارت پر براجمان جناب جاوید احمد صدیقی صاحب اپنے طویل خط میں بہت کچھ بیان فرما گئے ہیں صدیقی صاحب یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ آپ آج سے چالیس سال قبل منگل آفیشل وزٹ پر تشریف لائے تھے آپ کس محکمہ میں تھے اور منگل کس سیکشن کا وزٹ کرتے تھے ذرا تفصیلاً لکھیں ہو سکتا ہے کچھ حقائق سے پردہ اٹھے اور بات کچھ مزید آگے چلے منگل ڈیم واقعی اہم جگہ ہے پورے ملک کو روشن کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے رب العزت اسے نظر بد سے بچائے آمین۔ جناب صدیقی صاحب کا خط پورے جریدے کا احاطہ کیے ہوئے ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ بہاول نگر کے پرنس افضل شاہین صاحب بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں دو قطعات کی موجودگی نے ان کے خط کو بہت اہم بنا دیا ہے ملک عارف اعوان کا تبصرہ بھی شاندار اور جاندار ہے اشعار سے مزین اقرا جٹ کا خط بھی گفتگو کی رونق کو بڑھا رہا ہے بڑے بڑے تلے الفاظ میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ویل ڈن اقرا جٹ صاحبہ میرے پیارے بھائی محترم و مکرم جناب ریاض بٹ صاحب پر مغز تبصرے اور اچھوتی کہانی چال باز کے ساتھ تشریف لائے ہیں بھائی دونوں آرٹیکلز لا جواب ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ بٹ بھائی میرا خط پسند فرمانے کا بے حد ممنون ہوں رب العزت آپ کو خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے آمین محمد رفاقت واہ کینٹ سے مختصر خط اور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں

انہوں نے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے محترمہ روبینہ خالد اور عبد اللہ جمالی نے بہت ہی مختصر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا جو قابل ستائش ہے اقرائیں طاہر قریشی صاحب نے جس انداز میں رب العزت کے اسم مبارک اس فتح کے بارے میں معلومات فراہم کی ہے وہ ایمان کو بے حد تازہ کر گئی جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں تمام کہانیوں کا انتخاب بہت ہی خوب ہے ذوق آگئی اور خوشبوئے سخن کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا، رب ذو الجلال ہمارے اس پیارے جریدے کو مزید شہرت کی بلندیوں پر پہنچائے، آمین۔

جاوید احمد صدیقی کا راولپنڈی سے محبت نامہ۔ قابل صد احترام مدبران و گروپ ایڈیٹر سلامت تا قیامت صدا دعا میں صحت و لمبی اچھی زندگی السلام علیکم! میگزین تو اس دفعہ بے حد جلدی مل گیا تھا واہ کمال کر دیا جناب اقبال بھٹی صاحب رسالے کی آن بان شان نہایت نفیس لکھائی دل لبھانے والا مواد زبردست اور کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک میں سلسلے وار کہانیاں بہت کم پڑھتا ہوں مگر امجد جاوید کی کہانی شروع کی بریک بھی آخری صفحے پر لگی اور اب چند دن انتظار کا بورڈ لگا ہوا ہے زبردست اور موضوع بھی انوکھا سادہ معاشرے کا سب سے قیمتی موضوع جناب کمال کر دیا، انتظار شدت اختیار کرتا جا رہا ہے باقی سلسلے وار کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ محترم مشتاق احمد صاحب کا دل کشا اور چشم کش دستک پڑھ کر دل ٹپ اٹھا آپ کے کالم روزنامہ جنگ میں بھی زبردست اور انتہائی اوپن ہوتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ایک شکوہ ہے ہمارے بھٹی صاحب ان تھک قسم کے بغیر فرصت کے کر کے رکھ دیا ہے کہ سالوں میں ایک موتیوں جیسی خوب صورت کہانی لکھ کر اس سال کا کفارہ ادا کر دیا کرتے تھے مگر یہ کیسے یار دوست اور مہربان ہیں کہ کروٹ فرصت بھی نہیں لینے دیتے اقراسبحان اللہ زبردست اور جسم کی روح گفتگو میں بھٹی صاحب کی حقیقت میں گندھی تحریر سے دماغ میں بھی کئی گردان مل گئی اور امجد جاوید صاحب کی اگلی قسط اور مسلسل لکھنے کی خوش خبری بے حد دل تقویت دے گئی اور یہ مسند صدارت پر ہم یقین آیا جب اپنا نام بھی دیکھا اور تبصرہ بھی شکریہ بھٹی صاحب ریاض بٹ صاحب بہترین سی کہانی لگی ہے آپ کی چال باز پڑھ کر بے حد سکون ملا کہ ریاض بٹ اب بہترین جاسوسی کہانیاں انسپکٹرز کے روپ میں صفحہ فرطاس پر بڑی مہارت کے ساتھ بکھیر رہے ہیں ہاں ریاض آپ کا فون نمبر غائب ہو گیا براہ کرم اپنی تبصرہ والی اگلی تحریر میں ضرور دیں گے شکریہ (میں نے بھی ممبر تبدیل کر لیا ہے) فن پارے بہترین کہانیوں میں ٹھوڑا بہت سامراجن دے کر باقی ان میں سلمان احمد کا ناول لفظوں کا لبو جو محمد علم اللہ نے لکھی ہے کیا بھٹی صاحب فن پارے میں اب ناولوں کا یہ اشتہار ٹاپ بھی

آیا کریں گے؟ آدھا ناول تو انکش کے الفاظ سے بھرا ہے اور اسی طرح سمجھدار بھی زر مینہ مریم نے انکش کے لفظ وہ بھی زیادہ تر غلط چن کر استعمال کیے ہیں آٹھ کہانیاں بہت اچھی ہیں اور خلیل جبار بھی برا جمان تھے آنے کا شکریہ۔ دوسری کہانیوں میں بکرا چور، سفید ہولہ، تیسری جنگ عظیم، عورت نامہ، اعتراف خاص کر سلیم اختر کی بہت ہی خوب صورت کہانی سلیم صاحب ہر ماہ آیا کریں جناب اور حصار بے حد چشم کشا اور بہترین کہانیاں تھیں پرنس افضل شاہین کا تبصرہ بھی اور چشم کشا بھی بہت اچھے پرنس صاحب ملک عارف اعوان شعر و شاعری اور تبصرہ دل کو بھل گیا ریاض حسین قمر صاحب کا جاندار اور زبردست تبصرہ آپ نے ذکر کیا بڑی مہربانی، آپ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں اور غزل بھی نمبروں ہے ریاض صاحب اس دفعہ سات تبصرے میں شکریہ بھٹی صاحب عبداللہ جمال صاحب باقاعدگی کے ساتھ آئیں۔ ذوق آگہی میں اقرا جٹ، ریاض بٹ ریاض حسین قمر، پرنس شاہین، ایم حسن نظامی، رفاقت صاحب زر مینہ الیاس کی گزارشات بے حد اچھی اور قابل اشاعت تھیں مبارک ہو اور خوش بوئے سخن میں تمام لوگوں کو جو ہمارے میگزین کے سلسلے میں پورا ماہ لگتے ہیں سب کو عمر خضر اور صحت کاملہ کی دعائیں اور سلام دعا تمام مددیران اور اسٹاف کو دو عاؤں کا گلہ ستہ۔



مصنفین سے گزارش

- ☆ مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔
- ☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
- ☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
- ☆ خوشبوئیں کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
- ☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
- ☆ نوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
- ☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوش خط تحریر کریں۔
- ☆ ”گفتگو“ کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
- ☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتہ پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

7 فرید جیبر ز عبد اللہ ہارون روڈ کراچی۔

اقرأ

طاہر قریشی

شمعِ حق

العلیم

(بہت جاننے والا)

العلیم: مبالغے کا صیغہ ہے اس کا مادہ (ع، ل، م) ہے اس کے معنی جاننے والا واقف آگاہ، علیم بذات خود علم سے مبالغے کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں بے پناہ علم والا بہت زیادہ اور ہر طرح کا علم رکھنے والا حدود و قیود سے بھی زیادہ علم رکھنے والا اللہ العلیم کا علم اس قدر زیادہ اور بے پناہ ہے کہ اس کے علم سے کوئی شے چاہے وہ کہیں بھی ہے وہ العلیم کے علم سے باہر نہیں ہے، علیم ہر شے کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت، عمل، ضرورت، کام، سوچ و خیال کی پرواز و رسائی تک کا علم رکھنے والا ہے۔ کسی بھی چیز کی کوئی بھی اور کیسی ہی حرکت کیوں نہ ہو اللہ علیم اس سے پوری طرح باخبر رہتا ہے اللہ تعالیٰ خود تمام علوم کا سرچشمہ ہے وہ کائنات کے ذرے ذرے سے پوری طرح باخبر اور اسے جاننے والا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت محدود علم دیا ہے جبکہ دیگر مخلوقات نہ صرف محدود بلکہ ان کی ضرورت کے مطابق ہی ان کے مخصوص شعبوں کا علم دیا ہے جبکہ خود اللہ علیم کا علم لامحدود اور وسیع سے وسیع تر ہے۔ ہر حقیقت کا علم اسی علیم کو ہے۔

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی آیتیں بیان فرما رہا ہے اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔ (النور- ۱۸)

اللہ تبارک و تعالیٰ جو ہر چیز کا علم رکھتا ہے وہ اپنی مخلوقات کے ہر عمل ہر سوچ تک سے باخبر رہتا ہے اہل ایمان سے جو کوتاہیاں ہوتی ہیں جو ہر چل چل میں ہیں اللہ علیم ان سب کو خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ہی اپنی آیتوں کے ذریعے قرآن حکیم میں ایسے احکام نازل فرمائے ہیں تاکہ لوگ سیدھی راہ پر چلنے والے بنیں اور شیطان کے بہکائے میں پھنس کر اپنی آخرت کی زندگی کو برباد نہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے جو حکمت و تدبیر اختیار کرتا ہے جو قوانین وضع کرتا ہے وہ سب کے سب بڑی گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ان میں لوگوں کی اصلاح و فلاح ہوتی ہے۔

ترجمہ:- (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک آپ کو اللہ حکیم و علیم کی طرف سے قرآن سکھایا جا رہا ہے۔ (النمل- ۶)

آیت کریمہ میں رب علیم و حکیم اپنے محبوب اور رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرما رہا ہے یہ قرآن کریم جو رب کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھا رہا ہے یہ حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو اپنی تمام مخلوقات کے حالات اور ان کے ماضی، حال اور مستقبل تک کا پوری طرح علم رکھتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں اور دیگر مخلوقات کی اصلاح و ہدایت کے لئے بہترین تدبیر اختیار فرماتا ہے۔ قرآن حکیم میں جو کچھ ہدایات، احکامات، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں وہ کوئی ہوائی خیالی باتیں نہیں ہیں اور نہ ہی کسی بھی طرح کسی انسانی قیاس و رائے پر مبنی ہیں

بلکہ یہ تو عظیم بذات الصدور کا ارشادِ حقانی ہے۔ جیسا کہ المؤمن کی درج ذیل آیت میں ارشاد ہو رہا ہے۔
ترجمہ:۔ اس کتاب (قرآن کریم) کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، اور سب کچھ جاننے والا ہے۔
(المومن ۲)

اللہ تبارک و تعالیٰ جو بڑا ہی قوت و حکمت والا اور علم والا ہے وہ بڑا ہی صاحب فضل ہے آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن حکیم کے ساتھ ہی اپنی عظیم صفتِ عظیم ارشاد فرمائی ہے اس سے یہ اظہار ہو رہا ہے کہ یہ کتاب صاحب کتاب کے علم کا نہ صرف اظہار ہے بلکہ الہی حکمت و علم کا ذریعہ بھی ہے۔ اس طرح اللہ نے نہ صرف اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی فرمائی اور انہیں اس کتاب کے ذریعے دین و دنیا کے علم سے بھی روشناس کرایا ہے۔ انسانی شعور کے احساس کو تیز کرنے اس کے اندر امید پیدا کرنے اور اپنا خوف اور تقویٰ پیدا کرنے کا علم بھی عطا کیا ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔ (النساء ۲۶)

آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہو رہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان پر ان طریقوں کو واضح کرے اس کا ارادہ ہے کہ تم پر اپنی حکمت و دانائی کا انکشاف کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان حکمتِ الہی کو دیکھے سوچے سمجھے اور اسے اس طرح قبول کرے کہ وہ پوری طرح اس کی سمجھ میں آجائے پھر وہ اپنی کھلی آنکھوں اور کھلے دل و دماغ سے احکامِ الہی تعلیماتِ الہی یعنی دین و اسلام اور اسلامی نظامِ حیات کو قبول کرے کیونکہ اسلامی احکامات نہ تو اس قدر پیچیدہ ہیں نہ ہی پہیلیوں کی طرح پراسرار ہیں کہ سمجھ میں نہ آسکیں اور نہ ہی آمرانہ محکم لے ہوئے ہیں کہ ان میں حکم تو ہو لیکن حکمت سے خالی ہوں اللہ تبارک و تعالیٰ جو بڑا حکیم و دانہ ہے اس کے احکام و ہدایت میں بھی بڑی حکمت و دانائی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے جو طریقہ حیات، طرزِ معاشرت اور نظامِ حیات منتخب کیا ہے اُسے مستحکم اور مضبوط بنیاد پر قائم کیا ہے اس کے اصول ایک ہیں جس کے مقاصد اور اہداف ہم آہنگ ہیں ایک اکیلے اللہ کی عبادت یہی طریقہ اطاعت و بندگی زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے صدیوں سے کیا بلکہ فریض سے ہی نظامِ اطاعت و بندگی ایک ہے وہ ہے اللہ واحد کی اطاعت و بندگی یعنی ”لا الہ الا اللہ“ ہر قوم ہر قبیلے کے مومنین کے درمیان یہ سببِ الہی ایک مستحکم رابطے کا کام کرتی رہی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا ہی رحیم و کریم ہے انسان اگر راہِ راست سے ہٹ جاتے شیطان کے چنگل میں پھنس جاتے تو جب اسے اپنی غلطی کا احساس و ادراک ہو جائے اور وہ اپنے احساسِ غمات و شرمندگی کے اظہار کے ساتھ بارگاہِ الہی میں حاضر ہو کر اپنی غلطی پر عذرت کا اظہار کرتے ہوئے معافی مانگ لے تو وہ رحیم و کریم اپنے بندے کو معاف فرمادیتا ہے یہی اس کی صفتِ عالی شان ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہستی بڑی دان و عظیم ہے اس نے اپنے بندوں کے لئے جو قوانین بنائے ہیں وہ پوری حکمت و علم کے ساتھ بنائے ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو جو ہدایت و رہنمائی دے رہا ہے وہ سب کی سب بڑی علم و حکمت پر مبنی ہے۔ کیونکہ وہ خالق و مالک اپنی مخلوق کے حراز و نفعیات سے پوری طرح باخبر و آگاہ ہے۔ وہ ان تمام تدابیر سے بھی پوری طرح باخبر ہے جن کے ذریعے انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے اور جو انسانوں کے لئے مفید اور فلاح پانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی تعلیمات و احکامات کو انسان کی بھلائی، بہتری کے لئے نافذ فرمایا ہے۔

حصار

امجد جاوید

آخری حصہ

لفظ جادو میں ہی جادو ہے جادو ایک خطرناک اور منفی قوت ہے اور جادو کی کوکھ حسد، کینہ اور بغض سے بھری ہوئی ہوتی ہے لیکن جہاں محبت کی الوہی طاقت اور یقین موجود ہو، وہاں جادو اثر انداز نہیں ہوتا محبت اپنے محبوب کی جدائی پر سمجھوتہ تو کر لیتا ہے مگر محبوب کے دکھ کو برداشت نہیں کر سکتا یہی سچی محبت کا معیار ہے سچی محبت جب قوت بنتی ہے تو یقین کے ساتھ سارے شیطانی حصار توڑ دیتی ہے ممکن اور ناممکن کی کشمکش یقین بھروسہ اور حوصلے سے گندھی ایک پرجسس، حیرت انگیز اور جادو اثر داستان

URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdutube.com

”جب ثانیہ کی منگنی ہوگئی تھی شعیب سے تو بس سمجھو نکاح بھی ہو جائے گا۔“

”منگنی تو پہلے بھی ہوئی تھی، وہ نہیں رہی۔“ وہی خاتون مسکراتے ہوئے بولی۔ یہ ایک فقرہ نہیں تھا، مراد علی خاندان کو احساس دلادیا گیا تھا کہ وہ کیا ہیں۔ ان کی بات، ان کی زبان، ان کا وعدہ اور ان کی سادھ کیا ہے۔ مراد علی کا سر شرم سے جھک گیا۔ اسے اپنی بیٹی پر کم اور خود پر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ مجبوری اور بے بسی کے ایسے مقام پر تھا جہاں اس کی ہر بات جھوٹ تھی۔ اس کی انا، وقار اور ممکنات سب بیٹی میں مل گیا تھا۔ صورت حال عجیب کھردری ہوگئی تھی۔ یہی طلعت بیگم نے کہا۔

”بات تو ٹھیک ہے، مگر ہم شادی بہت جلد کر لیں گے۔“
”ہم نے تو مراد علی سے کہا تھا کہ منگنی کیا کرنی سیدھے نکاح ہی کرتے ہیں۔ اب دیکھیں ان کا کیا فیصلہ ہے؟“
پھوپھو فخرہ آخر کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہہ دیا۔ پھوپھو کی بات پر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ مراد علی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے پھوپھو نے اسے گالی دے دی ہو۔

کبھی دم بخود تھے۔ وہ سب مراد علی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ نجانے وہ کیا کہہ دے۔ اس پر ثانیہ نے سب کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں ہی نہ ہو۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی ٹرانس میں ہو۔ بھی اس نے اپنی ماما کو دیکھا، پھر دیر سے بولی۔
”نکاح ابھی ہوگا۔“

”یہ..... یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ حیرت سے بے ساختہ اونچا بولی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں یہ طعنہ برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ انتہائی غصے میں بولی۔

”بیٹی، یہ طعنہ نہیں میں نے تو پیسے ہی مذاق میں کہا، بخدا میرا ایسا طنز یا طعنے والا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ وہ خاتون روہنا ہوتے ہوئے بولی۔

”کوئی بات نہیں، نکاح میں کتنا وقت لگے گا، دو بول ہی پڑے جا میں گے نا۔ وہ پڑھ لیتے ہیں۔“ ثانیہ نے یوں کہا جیسے کسی جذبے سے عاری روکے سوکھے لفظ کہے جا رہے ہوں۔

مراد علی اپنی بیٹی کی بات سن رہا تھا۔ اس کی تیوریوں پر بل بڑھ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ثانیہ ایسا بھی کہہ دے گی۔ طلعت بیگم اتنے لوگوں کے سامنے کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے پریشانی میں مراد علی کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے مراد علی نے فیصلہ کر لیا۔

”ثانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کا نکاح بھی آج ہی ہے۔“ اس نے کہا تو ثروت بیگم سمیت شعیب نے بھی حیرت سے اسے دیکھا، وہ سب سے بے نیاز کہہ رہا تھا۔ ”ابھی تو منگنی کی رسم ہوئی ہے، ابھی سب سچ لیتے ہیں۔ اس کے بعد نکاح اور پھر رخصتی بھی ہو جائے گی۔“ اس نے گویا فیصلہ ہی سنا دیا۔ ثانیہ نے پہلے حیرت سے اپنے پاپا کو پھر پیار بھری نگاہوں سے شعیب کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی۔ اس نے زری سے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ لیا تو ثانیہ نے پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بھی شعیب نے عبت بھرے لہجے میں خوشی سے کہا۔

”وقت اور حالات بھی یہی چاہتے ہیں کہ جلد از جلد جائیں۔ ہے نا۔“
”آئیں پلیز لنچ کے لئے۔“ مراد علی نے کہا تو سبھی ڈائننگ ہال کی جانب چل دیے۔

نجانے کب مراد علی نے نکاح خواں کا بندوبست کیا تھا۔ لنچ کے بعد وہ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ثانیہ اور شعیب کو ساتھ ساتھ بٹھا دیا گیا۔ مہمانوں کو لاؤنج میں اکٹھا ہوتے ہوئے کچھ وقت لگا، جیسے ہی سب اکٹھے ہوئے۔ مراد علی نے نکاح خواں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مولانا صاحب، بسم اللہ کریں۔“

ایجاب و قبول کے بعد ثانیہ، شعیب کے عقد میں آگئی۔ پھوپھو فخرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ سچ مندی کے احساس سے سرشار تھی۔ نکاح کے فوراً بعد اس نے ثروت بیگم سے کہا۔

”دیکھ میں نہ کہتی تھی، میں اس مراد علی کا منہ توڑ جواب دوں گی۔ دے دیا جواب اسے۔“

”مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ شعیب کی شادی ثانیہ سے ہوگئی ہے۔“ ثروت بیگم نے کہا تو پھوپھو فخرہ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”ابھی سے یقین کر لو تو اچھا ہے۔“

شعب کو یوں لگا جیسے ہر جانب خوشیاں بکھرنی ہیں۔



ڈاکٹر ظہیر اپنے لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ڈیشان افسردہ سے حال میں بیٹھا ہوا پریشان تھا۔ ڈاکٹر ظہیر کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح سمجھائے۔ جب اسے پتہ چلا کہ ثانیہ کی معنی ہی نہیں اس کا نکاح بھی ہو گیا ہے اور وہ اپنے سرسبز بھی چلی گئی تو ڈیشان نے ہی اسے فون پر بتایا تھا۔ بھی ڈاکٹر ظہیر نے اسے اپنے پاس بلالیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ اس کے ساتھ باتیں کر کے، اس کو وقت دے کر اس کے غم میں شریک ہو سکتا تھا۔

”یار مجھے اب تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میرا کوئی قصور تھا؟ اگر کوئی غلطی تھی، کوئی بھی ایسی بات تھی تو مجھے بتاتی، مجھ سے شہر کرتی، ایسی کوئی بات نہ ہونے کے باوجود اس طرح کسی دوسرے کے ساتھ شادی رچا لیتا، ناٹ فیر یار.....“ ڈیشان نے انتہائی غصے میں کہا تو ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔

”یہ تو حقیقت ہے تاکہ اس نے شادی کر لی، اس نے تم سے شادی نہیں کرنا تھی نہیں کی۔ تم سے محبت کا وہ سب ڈرامہ تھا یا نہیں تھا، ثانیہ کی کوئی خاندانی مجبوری تھی یا نہیں تھی۔ جو بھی تھا، اب وہ ماضی بن گیا۔ حقیقت کو تسلیم کرو اور اسے اپنی زندگی سے کھرچ کر نکال دو۔“

”ماما بھی یہی بات کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ میں اسے بھول جاؤں، یہ اچھا ہوا کہ اس کے ساتھ شادی نہیں ہوئی، ورنہ گھر میں لڑائی جھگڑے اور فساد ہی رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا دل پیچھے رہتا تھا اور وہ خود یہاں رہتی۔“ ڈیشان نے کہا۔

”ہاں، وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس کے نبھانے کون سے مسائل تھے۔ وہ کیسا ماضی تھا، گزر گیا، اب آگے کی سوچو۔ بھول جاؤ اسے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھول سکتا، میں اسے نہیں بھول سکتا ظہیر۔ وہ شاید مجھے بھول جائے۔ وہ شاید مجھ سے محبت کرتی تھی یا نہیں کرتی تھی مگر میں اسے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔“ ڈیشان نے روہنا ہوتے ہوئے کہا۔

”میں کب انکار کرتا ہوں کہ تمہیں اس سے محبت نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اسے اپنے دل سے فوری

”کیا مطلب.....“ ثروت بیگم نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مطلب، میں تمہیں بیٹھ کر سمجھاؤں گی۔ ابھی تو میں

جاری ہوں گھر۔“ چھو پھوفا خرہ نے کہا۔

”بھی چلتے ہیں تم کیوں.....“

”اری ہو، لیکن ابھی گھر آئے گی، اس کے استقبال کو تو

کچھ تیاری کروں جا کر، تم آ جانا لیکن کو لے کر۔“ اس نے کہا اور اٹھ گئی۔

ثانیہ لیکن بنی شعب کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا بیڈروم دیکھ کر اس کے ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ پیرشے میں سے شعب کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ بھی ڈیشان کے ساتھ اپنی محبت کا دعویٰ کر چکی ہے۔ وہ شعب سے نفرت کرتی تھی۔ اس کے ساکت چہرے سے یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے وہ سب کچھ بھول گئی ہو۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا ہو۔ اسے اگر یاد تھا تو صرف شعب۔ وہ اس کی دنیا میں آ گیا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں باقی نہیں تھا تو مستقبل کی کوئی بات بھی اس نے نہیں سوچی تھی۔ بس اسی کی ذات تھی، اس کے علاوہ کوئی سوچ اس کے دماغ میں نہیں تھی۔ یوں جیسے کسی نے اسے صرف شعب کے بارے میں سوچنے پر ہی مجبور کر دیا ہو۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہونے کو تھا جب شعب کمرے میں آیا۔ اس نے ثانیہ کو اپنے بیڈ پر بیٹھے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کس طرح ایک حسرت، ایک خواب اور ایک یاس، اس وقت حقیقت بن کر اس کے سامنے تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ کر ثانیہ کو چھو کر دیکھا۔

”یک کیا.....؟“ ثانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”چھو کر دیکھ رہا ہوں، تم میرے سامنے کبھی حقیقت ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سچ مجھ تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔“ اس نے حیرت ملی خوشی سے کہا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ اس نے محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔

”یقین کر لو۔“ اس نے تہہہ لگاتے ہوئے کہا تو

نہیں نکال سکتے یا شاید تم اسے اپنے من سے نکال ہی نہیں سکتے ہو لیکن مجھے یہ بتاؤ تمہارا یہ دل گرفتہ ہو جانے والا رد عمل، بے حوصلہ ہو جانا، اس کے لیے آہیں بھرنا، کیا اس سے تمہاری زندگی میں وہ واپس آ جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں میری جان، وہ اب شعیب کی ہو چکی ہے۔ مانو کہ وہ برائی ہو چکی۔ اب تم اس کے بارے میں بھی نہ سوچو۔“ ڈاکٹر ظہیر نے اس سمجھایا۔

”تم بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ مجھے ایسے ہی کرنا چاہئے لیکن یار کیا میں رو بوٹ ہوں، کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے؟ جسے میں نے چاہا، جس سے محبت کی، کیا اُسے یوں بھول سکتا ہوں؟“ وہ کھوکھو بھرے لہجے میں بولا۔

”اویار، اب بھی تم ان محبت پیار کے ڈراموں پر یقین رکھتے ہو۔ وہ بھی تم جیسا حقیقت پسند بندہ۔ مان لیا، محبت ہو گئی، لیکن اسے وہ کیا کہتے ہیں شاعروں کی زبان میں حرز جاں بنالینا، رخم دل رخم جگر وغیرہ وغیرہ.....“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا چاہا تو ذیشان نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”اب تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“
”نہیں میری جان، میں مذاق نہیں اڑا رہا، تمہیں ثانیہ کو بھول جانے کا شور مچا رہا ہوں۔“ اس نے شعیب کی سے کہا۔
”اچھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں اسے بھول گیا تو کیا وہ سچ مجھ میرے دل اور دماغ سے نکل جائے گی؟“ اس نے پوچھا تو ڈاکٹر ظہیر کہتا چلا گیا۔

”نہیں یہ ممکن نہیں ہے، میں جانتا ہوں تم اس سے محبت کرتے ہو لیکن اس واقعہ کو اپنی زندگی کی ناکامی مت بنا لیتا۔ یہ مردانگی نہیں ہے۔ زندگی میں کامیابیوں کے ساتھ ناکامیاں بھی آتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اپنی ناکامی کو اپنی زندگی پر مسلط کر لیا جائے، خود پر طاری کر کے، اپنی زندگی کو ڈسٹرب ہی نہیں مذاق بنالیا جائے۔ سو میری جان، اس کی محبت رکھو اپنے دل میں لیکن کسی کو بھی یہ احساس نہ ہونے دو کہ تم نے ناکامی دیکھی ہے۔ ایک ناول انسان کی طرح زندگی کے معاملات کو دیکھو۔ اپنا بزنس کرو۔ کیونکہ محبت کا مطلب وہ نہیں جو تم میں دیکھ رہا ہوں۔“
”نا تمہارے نزدیک کیا ہے محبت کا مطلب؟“ ذیشان نے پوچھا۔

”دوسروں کے لئے اچھا سوچنا، یہ ہے محبت کا مطلب اور دوسروں کے لئے وہی اچھا سوچ سکتا ہے، جو اپنے لئے اچھا سوچ سکتا ہوں۔“ اس نے اپنا نکتہ نگاہ واضح کیا تو ذیشان نے پوچھا۔

”تم اصل میں کہنا کیا چاہتے ہو، وہ بات کہو؟“
”ڈیکو اب ثانیہ کی کسی ہو گئی۔ تمہیں اگر اس سے محبت ہے تو تمہارے کسی عمل سے اس کی زندگی ڈسٹرب نہ ہو۔ تم اسے کسی طرح کا بھی نقصان نہ پہنچاؤ۔ اگر کبھی اسے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد پوری جان سے کرو۔ یہ ناکامی نہیں، محبت ہے۔ وہ تمہاری نہیں ہو سکی، کسی کی ہے لیکن ہے تو وہی نا۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا تو ذیشان سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو یار، میں پوری کوشش کروں گا۔“
اس نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”چل تمہاری بھابی نے کھانا بنالیا ہوگا۔ کھاتے ہیں۔“
”چلو پھر۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بھی اس کے ساتھ اٹھ کر اندر کی جانب چلا گیا۔ ذیشان خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔



ثانیہ اور شعیب کی شادی کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ وہ تیسرے دن ہی ہنی مون کے لئے نکل گئے تھے۔ وہ پاکستان کے شمالی علاقے کی سپر پر تھے۔ روزانہ ہی ان کا فون آ جاتا۔ پھوپھو فارخہ خوش تھی کہ جو اس نے سوچا، وہی ہو گیا۔ اس کے پلے سے کچھ نہیں گیا تھا۔ ایسے ہی ایک صبح حسب معمول وہ کاریڈور میں بیٹھی ہوئی تھی کہ فرزانہ گیٹ سے اندر آ گئی۔ اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ وہ ہونٹوں کی مانند دیکھتے ہوئے سیدھی پھوپھو فارخہ کے پاس آ گئی۔ پھوپھو فارخہ بھی تاڑ گئی تھی کہ کوئی معاملہ ضرور ہو گیا۔ اس لئے جس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے فرزانہ، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“
اس نے سلام دعا کے بغیر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔
”پھوپھو، مجھے لگتا ہے میں ماں بننے والی ہوں۔“

پھوپھو فاخرہ کو پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، جیسے ہی اس کی سمجھ میں آیا، اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

پھوپھو فاخرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرزانہ کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ فرزانہ بے بسی کا مت بنی اس کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد پھوپھو فاخرہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہیں کچھ عقل بھی باقی نہیں؟“
”مجھے عقل بھی ہے اور سمجھ بھی، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔“ فرزانہ نے رو ہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”اے میں کیا کروں..... مطلب میں.....“ اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک نئی مصیبت اس کے لئے تیار تھی۔ فرزانہ نے اس کی طرف دیکھا، چند لمحے کسی جواب کا انتظار کرتی رہی پھر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

پھوپھو فاخرہ نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی بھی کسی صورت حال کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دماغ بند ہو گیا ہے۔ اسے کچھ بھی سمجھا نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر یہ بات کسی کو بھی پتہ لگ گئی تو ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی فرزانہ کو پوچھے یا نہ پوچھے لیکن تصور وار وہی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ سارا کچا چٹا کھل جائے گا؟

اگر یہ سب کچھ سامنے آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ دیر تک یونہی اوٹ پٹانگ سوچتے رہنے کے بعد اس نے خود کو کھلی دی۔ اس نے سوچا ہر مسئلے ایک حل ہوتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ آن پڑا ہے تو اس سے بہتر انداز میں نپٹا جا سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال رینگ گیا کہ کہیں یہ فرزانہ اسے بلیک میل ہی نہ کر رہی ہو؟ پہلے یہ تصدیق تو ہو جائے کہ وہ واقعی ہی ماں بننے والی ہے تب کچھ اس کا حل سوچا جائے۔ اگر وہ کس بھی مقصد کی خاطر بلیک میل کرنے کے چکر میں ہے تو چند دن ہی میں کوئی الزام لگا کر اسے گھر سے باہر کرے گی۔ پھر وہ جو بھی کہتی رہے، کون مانے گا۔ اس خیال کے ساتھ وہ تیزی سے اٹھی لیکن پھر تیزی سے بیٹھ گئی۔ ایک نئی سوچ نے اسے

پانی کے بلبلے کی مانند بٹھا دیا۔ اگر وہ جھوٹ بھی بول رہی ہے، اس نے بلیک میل بھی کرنا چاہا تو اسے یوں الزام لگا کر گھر سے نہیں نکال سکتی تھی۔ فرزانہ نے اگر کرامت شاہ کے بارے میں بتا دیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔ کوئی فرزانہ کو پوچھے یا نہ پوچھے، اس کی تحقیق ضرور ہونے لگ جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ سوچ کر ہی لرز گئی تھی۔ اس کا حل یہی تھا کہ وہ بڑے پیار سے، چالوسی کے ساتھ فرزانہ کا ساتھ دے۔ یہاں تک کہ اس کی شادی ہو جائے۔ ورنہ وہ بہت بری پھنس سکتی تھی۔

پھوپھو فاخرہ کو سوچتے ہوئے دوپہر ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں ایک ہی حل آیا۔ اسی بارے میں بات کرنے کے لئے وہ کچن میں جا پہنچی۔ فرزانہ اس وقت بڑی بنا رہی تھی۔ پھوپھو فاخرہ تاک کر اس کے پاس گئی تھی۔ اس وقت گھر پر ثروت بیگم نہیں تھی۔ اس نے جاتے ہی پوچھا۔

”فرزانہ، میں سمجھ سکتی ہوں کہ ویسا ہی ہوگا، جیسا تم محسوس کر رہی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں وہم ہو گیا ہو؟“

”ایسا نہیں ہے پھوپھو، میں اپنی طبیعت کے بارے میں بہتر سمجھتی ہوں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ایک تو تیری منگنی ہی نہیں ہوئی، ورنہ اسی ہفتے تیری شادی کروا دیتی۔“ پھوپھو فاخرہ نے کہا تو فرزانہ تنک کر بولی۔

”پتہ نہیں میری منگنی ہوتی بھی ہے کہ نہیں یا پھر وہی جواب دے دیتے ہیں، ان کی مرضی چاہے وہ نہ آئیں، مگر میری تو زندگی خراب ہو گئی نا۔“

”کیوں خراب ہوگی تمہاری زندگی، میں جا کر ان سے کرتی ہوں بات۔“ پھوپھو فاخرہ نے سیدھے ٹھوک کر کہا۔

”اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب۔“ وہ ہنسیکے ہوئے لہجے میں بولی

”لیکن ایک بات ہے فرزانہ؟“ پھوپھو نے پیار سے کہا۔

”وہ کیا.....؟“ اس نے تجسس لہجے میں پوچھا۔
”دیکھ پہلے ہم ایک بار تصدیق کر لیں۔ ایویں پریشان ہونے کا کیا فائدہ۔ ہم چلتے ہیں ڈاکٹر کے پاس۔“ پھوپھو

نے کہا تو فرزانہ نے چند لمحے سوچا پھر بولی۔
”ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔“

”تو ایسا کر جلدی سے کام ختم کر، میں لے چلتی ہوں تمہیں، یہاں سے نکلیں گی الگ الگ، سمجھ رہی ہو نا تم؟“
پھوپھو نے اسے ساری بات سمجھائی اور بچن سے نکلتی چلی گئی۔

سہ پہر کے بعد وہ اسپتال میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ دوسری خواتین کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جس کے دل میں چور ہوتا ہے وہ خواہ خواہ ہی ڈرتا رہتا ہے۔ پھوپھو قاخرہ پریشان کی گھبراہٹ ہوئی تھی اور فرزانہ نے چہرے کو چھپایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی باری آئی تو وہ خاتون ڈاکٹر کے سامنے جا بیٹھیں۔ ڈاکٹر نے ایک نگاہ فرزانہ کو دیکھا۔ پھر شک بھری نگاہوں سے پوچھا۔

”کتنا عرصہ ہو گیا ہے شادی کو؟“

”بہی کوئی تین ماہ۔“ پھوپھو نے بڑے سکون سے

جھوٹ بول دیا۔

”آپ کیا لگتی ہیں ان کی؟“ ڈاکٹر نے پوچھا

”میں ساس ہوں جی اس کی۔“ پھوپھو نے جھوٹ پر

جھوٹ بولا۔

کچھ سوالات کے بعد ایک پرچی پر لکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی اس کا نام ثانیہ ہے۔ ثانیہ شعیب۔“ پھوپھو نے

نام بتا کر گویا سکون کا سانس لیا۔ اب ڈر کی کوئی بات نہیں

تھی۔

”اچھا، یہ میں نے ٹیٹ لکھے ہیں۔ ان کی رپورٹ

لے کر آپیں میرے پاس، پھر دیکھتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا

اور پرچی انہیں تھما دی۔ وہ دونوں انہیں اور لیبارٹری میں جا

بجٹی انہیں وہاں کچھ دیر لگی۔ وہاں سے رپورٹ لے کر وہ

ڈاکٹر کے پاس آئیں۔ ڈاکٹر نے ساری رپورٹیں دیکھیں

اور پھر خوشی سے بولیں۔

”مبارک ہو۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔“

”دادی.....؟“ پھوپھو قاخرہ نے گھبرا کر یوں بے

ساختہ کہا جیسے اس پر تو جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ اگلے ہی

لمحے اس کی نگاہ ڈاکٹر کے چہرے پر پڑی جو حیرت سے اس

کا منہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے خود پر قابو پایا اور

بولی، ”میں تو خوشی کے مارے حیران ہو گئی ہوں۔“

”اس طرح.....؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”بہی کہ پتہ نہیں بیٹا ہوگا کہ بیٹی۔“ پھوپھو نے بات

سنبا لٹا چاہی لیکن ڈاکٹر نے روکے سے لہجے میں کہا۔

”بی بی، ہم روزانہ پتہ نہیں کتنی ایسی لڑکیوں کو دیکھتے

ہیں۔ خیر میں دوا لکھ دیتی ہوں اور احتیاط بھی۔“ یہ کہتے

ہوئے وہ پیڈ پر دھرے کاغذ پر لکھنے کے لئے جھک گئی۔

پھوپھو کے ساتھ فرزانہ بھی ڈاکٹر کے شک بڑ جانے پر

شرمندہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھوپھو نے تو کوشش کی تھی کہ کسی

طرح اس کے بارے میں پتہ نہ چلے لیکن ڈاکٹر ایک تجربہ

کار خاتون تھی۔ اس نے بھانپ لیا تھا۔ ڈاکٹر نے پرچہ لکھا

اور انہیں تھما دیا۔ وہ پرچہ لے کر باہر چل دیں۔ ڈاکٹر کا

شک میں بڑ جانا ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ

ایک نئی جان کے باعث گھبراہٹ تھیں کہ اس کا کیا ہوگا؟ وہ

اسپتال سے باہر آ چکی تھیں۔ وہ آپس میں کوئی بات نہیں کر

پاری تھیں۔ باہر آ کر فرزانہ نے پوچھا۔

”پھوپھو، اب کیا ہوگا؟“

”ارے کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔“ اس نے تکی بھری پریشانی

سے کہا پھر اگلے ہی لمحے اسے ہوش آ گیا کہ اس قدر فرزانہ

سے کئی ٹھیک نہیں۔ سو بڑے حوصلہ افزا لہجے میں بولی، ”تم

کیوں فکر کرتی ہو، میں ہوں تا سب سنبھال لوں گی تم جاؤ

مگر۔“

”ٹھیک ہے پھوپھو۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو

دونوں آگے بڑھ گئیں۔ وہ ہسپتال سے باہر سڑک پر آ کر

کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں ایک رکشان کے قریب آ گیا، وہ

دونوں اس میں بیٹھیں اور چل دیں۔

ذیشان اس وقت آفس سے نکلنے کے لئے برقیول رہا تھا

، جب اس کا فون بج اٹھا۔ وہ ڈاکٹر ظہیر کی کال تھی۔ اس

نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی ڈاکٹر صاحب، کیا بات ہے۔“

”کیا کر رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”آفس میں ہوں اور گھر جانے کی سوچ رہا ہوں۔“

اس نے سکون سے کہا۔

”تم ایسا کرو، پہلے میرے پاس اسپتال آؤ، مجھے تم سے

کام ہے۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”خیر تو ہے نا، کوئی ایسی بات.....“ اس نے کہنا چاہا تو

میں نہیں دوں لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ شاید وہ چلی گئیں تھیں۔“

”ساتھ میں کون تھا؟“ ذیشان نے پوچھا۔

”میری سوال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔ میں فوراً پہچان نہیں پایا تھا، بس ایک لمحے کو دیکھا تھا۔ خیر، میں نے انہیں تلاش کیا وہ نہیں ملیں۔ میں اندر کاؤنٹر پر چلا گیا اور ان سے پوچھا۔“

”وہاں تو کوئی لوگ آتے ہیں۔“ ذیشان نے کہا۔

”کاؤنٹر گرل فوراً تونہ بتا سکی لیکن جب میں نے لسٹ دیکھی تو اس میں ثانیہ شعیب کا نام تھا، جو ایک گانا کا لوجسٹ کی طرف ریفر ہوئی تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ ابھی شادی کو دن کتنے ہوئے ہیں۔ وہ ویسے بھی ہمارے پاس زیر علاج رہی تھی۔ تب ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ ڈاکٹر ظہیر نے پریشانی میں کہا۔

”پھر کیا کیا تم نے؟“ ذیشان نے الجھتے ہوئے پوچھا ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔

”میں سیدہ حاسی خاتون ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ان سے پوچھا۔ ان ڈاکٹر نے ایک حیران کن خبر سنائی کہ ثانیہ شعیب ماں بننے والی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ذیشان نے انہجائی حیرت سے پوچھا۔

”میری حیرت تم سے بھی زیادہ تھی۔ میں لیبارٹری والوں کے پاس گیا۔ وہاں کمپیوٹر پر سب موجود ہے میں نے اس کی رپورٹ کا پرنٹ لے لیا۔ میرے ذہن میں پہلی بات ہی یہی آئی ہے کہ تم.....“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا چاہا تو وہ شدت سے بات کاٹنے ہوئے بولا۔

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، بالکل بھی نہیں۔ جو تمہارے دماغ میں آیا ہے۔ ہمارے درمیان ایک پاکیزہ تعلق تھا۔ ایسا بالکل نہیں ہے.....“ اس نے لہجے میں سر ملاتے ہوئے یوں کہا جیسے اس کا دماغ محکوم گیا ہو۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا، ”اگر ایسا ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہی شادی کرتی، میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہ کرتی۔“

”کسی حد تک تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو، کہیں یہ سب کچھ تو شادی کی راہ

بات کاٹ کر بولا۔
”ایک تو یہ تمہاری تحقیق کیا، تفتیش والی گندی عادت.....“

”آ رہا ہوں میری جان بس ابھی۔“ اس نے تیزی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس نے سب کچھ سمیٹا اور اور آفس سے نکلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر ظہیر کے سامنے اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر ذیشان نے پوچھا۔
”خیر تو ہے نا؟“

”یار میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ خیر ہے یا نہیں۔ اسی لئے تمہیں بلایا ہے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے ذیشان کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے ایک بات بالکل سچ بتانی ہے، اس میں جھوٹ نہیں بولنا۔“

”ہاں پوچھو، بالکل سچ بتاؤں گا۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا اور ثانیہ کی محبت کا انداز کیا تھا؟“ ڈاکٹر ظہیر نے اشارے میں پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ اس نے کہا۔
”اچھا، پھر میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ مگر پہلے وعدہ کرو،

میری ہر بات سن کر پہلے خود پر قابو رکھو گے، سکون سے میری بات سنو گے، کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار اچھی طرح سے سوچنا ہے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے پریشان انداز میں کہا تو ذیشان کو یقین ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے ورنہ اس قدر سنجیدہ آدمی یوں کبھی گھبرا یا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بہت اہم بات ہے۔ اس نے ذیشان نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”تم مت گھبراؤ، میں پورے ہوش و حواس میں ہوں، بالکل نہیں ہوں کہ کچھ بھی بتا سوچے سمجھے کر دوں گا۔ جو بھی کروں گا تمہارے مشورے کے بعد کروں گا۔“

”اچھا پھر سن۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کہتا چلا گیا، ”میں آج جب تھوڑی دیر پہلے اسپتال آ یا ہوں تو میں نے وہ شعیب کی چھو بھوکے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا، جس نے خوب اپنے آپ کو لپیٹا ہوا تھا۔ میں کار پارک کر کے انہیں تلاش کیا کہ ان کو اگر کوئی مدد چاہئے تو

میں رکاوٹ نہیں بنا؟“ ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا۔
 ”یارتہاری اس بات نے تو میرے اندر پلچل مچا کر رکھ دی ہے۔ کئی باتیں ہیں جو سوچنے والی ہیں۔ ثانیہ کا اس قدر بیمار ہونا، اب سمجھ میں آرہا ہے۔ تم سب یہی کہتے تھے تاکہ اسے کوئی بیماری نہیں صرف ذہنی دباؤ کی شدت ہے، یہی تا؟“ ڈیشان نے بڑے جذباتی انداز میں سوال کیا۔ تو وہ بولا۔

”بالکل، اس کی ساری رپورٹیں ٹھیک تھیں اور.....“
 ”سوال یہ ہے ظہیر، یہ ظلم اس کے ساتھ کس نے کیا؟ اسی ظلم کی وجہ سے اس نے میرے ساتھ شادی نہیں کی؟ وہ اسی باعث پاگلوں جیسی ہو گئی تھی؟“ ڈیشان نے دھکی لہجے میں شدت سے کہا تو ڈاکٹر ظہیر نے بڑے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

”دیرج، اسی لئے میں نے کہا تھا کہ سکون سے رہنا۔ اس صورت حال میں جذبات کا نہیں عقل کا استعمال کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر پرسکون لہجے میں بولا۔

”بہت سارے سوال ہیں، مگر ان سارے سوالوں کا جواب صرف اور صرف ثانیہ کے پاس ہیں۔ ہمیں ادھر ادھر سر مارنے کے بجائے، ثانیہ ہی سے پوچھنا ہوگا۔“
 ”اگر ثانیہ نے ہمارے کسی سوال کا جواب دینا پسند کیا تو؟“ ڈیشان نے کہا۔

”یہ مجھ پر چھوڑو۔ میں اس صورت حال کو بہت اچھی طرح دیکھوں گا۔ میں یہ بھی انتظار نہیں کروں گا کہ وہ دوبارہ یہاں آئے گی تو کوئی بات کروں گا۔ میں دیکھ لوں گا سب۔“ ڈاکٹر ظہیر نے سوچتے ہوئے کہا۔
 ”کیا کرو گے تم آخر؟“ ڈیشان نے کہا تو ڈاکٹر ظہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور تم کیا کر سکتے ہو؟“
 ”تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ڈیشان نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔
 ”تو یہی بات میں کہہ رہا ہوں۔ ہمیں کوئی جلد بازی نہیں کرنی، سکون سے ایک دو دن بعد میں ثانیہ سے ملنا ہوں۔ اس سے بات کرنا ہوں۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کوئی صورت

حال تو سامنے آئے گی تاہم یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ دراصل ہمیں کرنا کیا ہے؟“

”کرنا کیا مطلب.....“ ڈیشان نے پوچھا۔
 ”مطلب، پہلے یہی فیصلہ کرنا ہوگا کہ اب ہم نے ثانیہ کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہئے یا نہیں؟“
 ”تعلق تو رکھنا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”کس ناتے سے اور کیوں؟ اب جبکہ وہ بیاتنی جا چکی ہے۔ ہمیں یا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں کہ اس کی زندگی میں دخل دیں، اسے ڈسٹرب کرو۔ اس لئے پہلے سوچو، سکون سے سوچو، پھر کوئی بھی فیصلہ کرو۔ اس کے بعد سب دیکھ لیں گے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا یار۔“
 ”تم آج رات سوچ لو، کل پرسوں، جب بھی۔ ہم پھر اس پر بات کریں گے۔ ابھی جذباتی انداز میں کوئی بھی فیصلہ مناسب نہیں۔“ اس نے سمجھایا۔

”ظہیر، تم ٹھیک کہتے ہو یار، میں سوچتا ہوں۔ پھر جو فیصلہ ہوگا۔ وہی حتمی ہوگا۔“ ڈیشان نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر ظہیر بولا۔

”ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ، میں بھی ڈیوٹی کروں، کل میں تمہارے آفس میں تجھے ملوں گا۔“
 ”اوکے۔“ ڈیشان نے کہا اور ہاتھ ملا کر نکلنا چلا گیا۔



پھوپھو فاخرہ کو جسے رات نیند ہی نہیں آتی تھی۔ اس نے جیسے تیسے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل چلی تھی۔ دن چڑھ آیا تھا جب وہ بابا کرامت شاہ کے گھر پہنچ گئی۔ وہ جلد از جلد بابا کرامت شاہ سے ملنے کے لئے بیٹاب تھی۔ وہاں ابھی اتنے زیادہ لوگ بھی نہیں تھے۔ وہ کچھ ہی دیر بعد بابا کرامت شاہ کے کمرے میں جا پہنچی۔

”ارے آفاخرہ آ..... شابا تم خوش ہونا۔“ بابا کرامت شاہ نے اسے دیکھتے ہی کہا لیکن اس کی شکل پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر پوچھا، ”پر تیری شکل کیوں اتنی بگڑی ہوئی ہے، کیا افتاد پڑ گئی تم پر؟“
 ”بابا سارا کچھ چوہٹ ہو جانے والا ہے، میرا سارا بنا

بنایا کھیل تو بگڑے گا ہی، میرے ساتھ جو ہوگا وہ.....“
 پھوپھو فاخرہ ایک دم سے بچھڑ پڑی۔
 ”ارے ہوا کیا، کچھ بتائے گی بھی۔“ بابا کرامت نے
 غصے میں کہا تو اس نے فرزانہ کے بارے میں سب بتا دیا۔
 یہ سن کر بابا کرامت کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ
 ابھرائی پھر بولا۔

”میں تمہیں ایک کلینک کا پتہ دیتا ہوں، اسے وہاں
 لے جا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کر۔ وہاں کی ڈاکٹر
 سب سنبھال لے گی۔“
 ”اگر کسی کو پتہ چل گیا، یا اسے کچھ ہو گیا تو، اس نے
 اگر جانے سے انکار کر دیا تو.....؟“ پھوپھو فاخرہ نے
 ڈرتے ہوئے پوچھا تو وہ غصے میں بولا۔
 ”انکار کرے تو بتانا، میں اسے ویسے ہی ختم کر دوں
 گا۔“

بابا کرامت شاہ کے یوں کہنے پر پھوپھو فاخرہ دہل کر رہ
 گئی۔ وہ دہشت زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی،
 جس کے چہرے پر ڈر سی بھی پریشانی نہیں تھی۔ وہ چند
 لمحوں کے لیے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر حیرت زدہ لہجے میں بولی۔
 ”یوں کیسے مر جائے گی وہ، کون کرے گا قتل اسے؟“
 ”ایک عمل کی مار ہے وہ، بس تم اس سے پوچھ لو، مان
 لے گی تو ٹھیک ورنہ مجھے بتا دینا، میں جانوں اور میرا کام۔“
 بابا نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو پھوپھو فاخرہ سمجھ گئی
 کہ اب اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ سنجی اٹھتے
 ہوئے بولی۔

”اچھا میں جلتی ہوں، بات کرتی ہوں اس سے۔“
 ”ٹھیک ہے جاؤ۔“ بابا کرامت نے کہتے ہوئے اسے
 ہاتھ کا اشارہ کیا۔ پھوپھو فاخرہ وہاں سے اٹھی اور باہر کی
 چل دی اس کے ذہن میں تو یہی تھا کہ بابا کوئی چٹکار
 دکھائے گا اور اس جان سے چھٹکارا ل جائے گا جو ابھی اس
 دنیا میں آئی ہی نہیں۔ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ بابا تو مرنے
 مارنے والی باتوں پر اتر آئے گا۔ وہ اندر سے دہل گئی تھی
 ۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک قتل اس کے ذمے پڑے۔ یہ تو بچ
 تھا نا کہ پھوپھو فاخرہ نے ہی فرزانہ کو اپنے مقصد کے لئے
 بابا کرامت کے پاس بھیجا تھا۔ اب اس کا خمیازہ تو بھگتنا تھا

لیکن اس صورت میں نہیں کہ وہ اسے قتل ہی کر دے۔
 پھوپھو فاخرہ تو یہ دھمکی فرزانہ سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ شاید
 وہ پیار سے مان جائے لیکن دھمکی کی صورت میں وہ ہتھے
 سے بھی اٹھ سکتی ہے۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں گھر
 جانے کے لئے ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔



دوپہر ہونے کو تھی۔ ڈیٹان بڑی شدت سے ڈاکٹر ظہیر
 کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔
 مگر اس کا دھیان ادھر نہیں تھا، وہ اپنی ہی سوچ میں گم تھا
 ۔ اسے ڈاکٹر ظہیر کی آمد کا بھی اس وقت پتہ چلا جب وہ اس
 کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔
 ”کن خیالوں میں گم ہو؟“ اس نے پوچھا تو ڈیٹان
 نے چونکتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ، آگئے تم۔“

”میں آگیا ہوں، مگر یوں سوچوں میں گم ہو جانے سے
 کسی مسئلے کو خود پر طاری کر لینے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تم
“ ڈاکٹر ظہیر نے کہنا چاہا، مگر ڈیٹان نے اس کی بات
 کاٹتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔
 ”تم بھی ٹھیک کہتے ہو لیکن جب صورت حال ہی وہ نہ
 رہے جو دکھائی دے رہی ہو، تو سوچنا بنتا ہے میرے یار۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔“ اس نے غور سے اس کے چہرے پر
 دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ پھوپھو فاخرہ کو تم نے اسپتال میں
 دیکھا، لیکن اس کے ساتھ ثانیہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ثانیہ اور
 شعبہ معنی مون کے لئے گئے ہوئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے
 ڈیٹان کا لہجہ بدل گیا تھا، جس میں یاس اور جھنجھن دونوں
 عیاں تھیں۔

”ہنی مون، تو وہ.....“ ڈاکٹر ظہیر نے حیرت سے کہا۔
 ”یہی سوال کہ وہ کون تھی، جسے پھوپھو اسپتال لے کر
 گئی اور اس کا نام ثانیہ بتایا۔ اس سے ظاہر کیا ہوتا ہے کہ
 پھوپھو، اس لڑکی کو چھپانا چاہتی تھی، اتنی قریبی ہے کہ اس
 کے لئے ثانیہ کا نام بھی استعمال کر سکتی تھی۔ یہ اور ایسے ہی
 کئی سوال پیدا ہوئے۔“ ڈیٹان نے کہا تو ڈاکٹر بولا۔
 ”بات تو ٹھیک ہے تمہاری، جب ثانیہ یہاں ہے ہی

”یہ لڑکی وہی ہے۔“ اس نے شناخت کرتے ہوئے
حتیٰ لہجے میں کہا۔

”یہ تو کفرم ہو گیا کہ وہ ثانیہ نہیں تھی جو اسپتال گئی تھی۔
وہ فرزانہ تھی۔ وہ امید سے ہے۔ اس کی شادی بھی نہیں
ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی درست معاملہ نہیں۔ لہذا
ہمیں اس لڑکی سے بہت کچھ پتہ چل سکتا ہے۔“ ذیشان
نے کہا تو ڈاکٹر ظہیر کچھ دیر خاموش رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔

”دیکھو، ذیشان، بات اتنی سادہ نہیں کہ ہم جائیں اس
لڑکی فرزانہ کے پاس اور وہ ہمیں سب بتا دے گی۔ وہ اپنی
کسی بھی غلطی کے بارے میں کسی کو کیوں بتائے گی۔
دوسرا، اس کا ثانیہ سے کیا تعلق، میرا خیال ہے ثانیہ ایک دو
دن ہی رہی ہے اس گھر میں۔ وہ نوکرائی کیا جاتی ہوگی اور
ہم نے اس سے کیا پوچھنا ہے۔“

”یار، یہ جو نوکر پیشہ لوگ ہوتے ہیں نا، یہ سب کچھ
جانتے ہوتے ہیں، ان گھروں کے بارے میں جہاں یہ
کام کرتے ہیں۔ یہ سوال تو اپنی جگہ ہے نا کہ آخر ایسا کیا
ہو گیا کہ میرے ساتھ کی ہوئی مگنی اس نے آنا فنا توڑ دی
اور دونوں میں شعیب سے شادی کر لی۔ یار گھر میں کوئی بات
تو ہوئی ہوگی؟“ ذیشان نے اپنی دلیل دی تو ڈاکٹر ظہیر نے
کہا۔

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میرا سوال
اب بھی وہی ہے کہ اب ایسا کیوں؟ وہ شادی شدہ ہے اور
.....“

”ظہیر بس، ہم اس پر بہت بات کر چکے ہیں میں اس
بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ پلیز.....“ ذیشان نے اکتائے
ہوئے انداز میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر کاغذ سے
اچکاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر میں یہی مشورہ دوں گا کہ جو کچھ بھی کرنا، بہت
احتیاط سے کرنا۔“

”وہ احتیاط تو ہے ہی، میں نے یہی سوچا ہے کہ پہلے
اس لڑکی کے بارے میں پوری معلومات لی جائیں۔ اسے
کسی ڈاکٹر کی مدد تو چاہئے نا، کیونکہ اس کی شادی نہیں ہوئی
۔ میرا دل کہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور نکلے گی۔“ ذیشان
نے جذباتی لہجے میں کہا۔

نہیں تو وہ کسے لے کر گئی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چونک کر
بولا۔

”ہاں یار، اگر ثانیہ یوں اسپتال جاتی تو کیا وہ کسی
رکشے پر سفر کرتی؟ اس کے پاس تو اپنی گاڑی ہے۔“
”میرا خیال ہے اب کچھ آ رہی ہے تمہیں۔“ اس نے
کہا، اس دوران عشاء آفس میں آئی اور ان کے پاس
خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”اور جس طرح وہ لڑکی لپٹی لپٹائی تھی، ثانیہ کو ایسی کیا
مجبوری تھی؟ یار کچھ ایسا ہے جو ہم سے چھپ رہا ہے، مگر جو
کچھ بھی ہے، اسی چھپے ہوئے ہی میں ہے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے
سوچتے ہوئے کہا۔

”بالکل اسی ٹریک پر میں نے سوچا، تو مجھے شک ہوا کہ
ممکن ہے ان کے ارد گرد کوئی ایسی لڑکی ہو۔ میں نے کوشش
کی اور میں نے اس لڑکی کو تلاش کر لیا ہے۔“ ذیشان نے
بتایا تو ڈاکٹر ظہیر نے بے ساختہ پوچھا۔

”کون ہے وہ اور کیسے.....؟“
”وہ شعیب کے گھر میں کام کرنے والی لڑکی ہے۔ اس
کا نام فرزانہ ہے۔“ ذیشان نے بتایا تو ڈاکٹر ظہیر نے اس
بار سکون سے پوچھا۔

”یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟“
”بتا رہا ہوں نا، میں نے اس بار عشاء سے مدد لی۔ جو
میرے ذہن میں شک تھا، اس بابت اسے سمجھایا۔ اسے کہا
کہ جاؤ اور سب معلوم کر کے آؤ۔“

”کیسے پتہ کیا تم نے؟“ اس نے عشاء کی طرف
دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بخیر گئی سے بولی۔

”میں ان کے ہاں گئی تو ثانیہ کی ساس مٹی اسی نے بتایا
کہ ثانیہ اور شعیب تو مہنی مومن پر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے
انہیں بتایا کہ میں ثانیہ کی سسلی ہوں، اس کی شادی پر نہیں
آسکی اب ملنے آئی ہوں۔ گھر میں فقط دو ہی عورتیں تھیں۔

شعیب کی امی اور ایک ملازمہ فرزانہ۔ ان کی ایک چھوٹو
بھی ہے جو کہیں گئی ہوئی تھی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں
اس ملازمہ کی تصویر بنالائی ہوں، آپ دیکھیں یہی ہے۔“
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون ڈاکٹر ظہیر کے سامنے
رکھ دیا۔ اس نے پہلی نگاہ میں ہی پہچان لیا۔

”اچھا، بیٹی، جیسے تم راضی، ورنہ اب میں ٹھیک ہوں، میں کام پر جاسکتی ہوں۔“ صفیہ نے کہا۔

”میری شادی ہو جائے تا تو پھر جو مرضی کرتی رہتا۔ یہ کھانا ہے کہ لوگوں۔“ فرزانہ نے کہا اور سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ وہ اپنے بستر میں پڑی ہوئی تھی کہ اسلم کا فون آ گیا۔ وہ اسے دروازے پر آنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اٹھی اور دروازے تک چلی گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ وہ اندر آتے ہی خوشی سے بولا۔

”تجھے پتہ چل گیا ہوگا۔ اماں آج آئی تھی ادھر اور.....“

”ہاں مگنی کی بات کر گئی ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔

”میں نے تمہارے لئے نئی سونے کی انگوٹھی بھی خرید لی ہے۔“ اس نے پر شوق لہجے میں بتایا، پھر لمحہ بھر بعد بولا،

”اچھا میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں؟“

”بولو، کیا کہنا ہے؟“ فرزانہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

”مجھے پتہ ہے تمہارے پاس مجھے پہنانے کے لئے انگوٹھی نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھے انگوٹھی پہناؤ۔“ وہ.....

”اسلم مگنی ہوئی نہیں اور تمہاری شرط پہلے سے ہی شروع ہو گئی ہیں۔ شاید میں نے تمہیں پہنانا ہی ہو۔“ اس نے دھکی لہجے میں کہا۔

”اؤ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ پہلے میری بات تو پوری سن لو۔“ اس نے احتجاجی لہجے میں دھیمی آواز میں کہا۔

”بولو، کو پوری بات۔“ فرزانہ نے اُکٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ دیکھو ادھر۔“ اس نے جیب سے ایک سرخ مٹلی ڈبیہ نکالتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں، اس میں جو انگوٹھی ہے یہ والی تم نے مجھے پہنانی ہے۔ اس کا کسی کو نہیں پتہ۔ نہ ہی کسی سے ذکر کرنا ہے، یہ لو۔“ اس نے سرخ مٹلی ڈبیہ اس

”وہ کیسے کرو گے؟“ ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا۔

”وہ میں کر لوں گا۔ بہت سارے لوگ ہیں، جو پیسے کے عوض بڑے بڑے کام کر دیتے ہیں۔ یہ تو صرف معلومات لینی ہیں۔“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر اس معاملے پر مزید بات کرتے رہے۔ انہیں ایک اُمید لگ گئی تھی۔

اس شام جب فرزانہ اپنے گھر پہنچی تو تھک کر چور ہو چکی تھی۔ وہ کس مشکل سے اپنے گھر تک پہنچی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ آتے ہی چار پانی پر گر گئی۔ اس کی ماں نے یوں اس کی حالت دیکھی تو بولی۔

”کیا بات ہے بیٹی، بہت تھک گئی ہو۔“

”ہاں، اماں، میرا سر چکرا رہا ہے، یوں لگتا ہے جیسے بدن میں جان ہی نہ رہی ہو۔“ اس نے نقاہت سے کہا تو روہانہ لہجے میں بولی۔

”بہت کام کرواتی ہوں گی نا تم سے۔ میری پھول سی بچی۔“

”ہاں اماں، میں تھک جاتی ہوں۔“ اس نے پھر نقاہت سے کہا تو صفیہ نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”بس بیٹی چند دن اور ہیں، آج آئی تھی اسلم کی ماں، کہہ رہی تھی، وہ مگنی کا کہہ گئی ہے۔ اسی جمعہ کی شام۔“

”کیا کہا، اسی جمعے.....“ ایک بار تو فرزانہ ڈر گئی۔ پھر اس نے سوچا جتنی جلدی یہ شادی ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔

”ہاں، اسی جمعے، دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، دو دن، کل، تم، اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو چلی جانا، ورنہ میں چلی جاؤں گی اور انہیں بتا آؤں گی کہ تم اب کچھ دن نہیں آ سکو گئی۔“ اماں نے کہا تو فرزانہ بدک گئی۔ اُسے تو آج ہی پھوپھو نے کہا تھا کہا تھا کہ کل ایک ڈاکٹر کے پاس جائیں گی۔ اب اگر وہ ان کے گھر نہ جاسکی تو یہ سب کیسے ہوگا؟ اسی لئے جلدی سے بولی۔

”نہیں اماں، میں چلی جاؤں گی۔ بس ایک بار ہی کام چھوڑوں گی۔ پھر نہیں کروں گی۔“ اس نے کہا۔

”اس نے ابھی تھوڑی دیر بعد کہیں جانا ہے۔ شام تک واپس آئے گی، اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔“ پھوپھو نے اعتماد سے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کچن کی جانب چل دی۔



سہ پہر ہونے کو تھی۔ ڈیشان اپنے آفس میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر ظہیر کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا کہ وہ اس کے آفس سے ہوتا ہوا اسپتال جائے گا۔ وہ آفس میں آیا تو عشاء بھی اس کے پیچھے آگئی۔ اس نے دونوں کو دیکھا، بھر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”کوئی تازہ ترین.....؟“

”پھوپھو فافراہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ایک کلینک پر لے کر گئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی وہ وہاں سے نکل آئیں۔ یہ دیکھو.....“ ڈیشان نے بتایا اور ساتھ ہی فون میں سے تصویریں اس کے سامنے کر دیں۔ یہی ڈاکٹر ظہیر بولا۔

”میں سمجھتا ہوں وہ وہاں پر کیا کرنے گئیں تھیں۔ لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”میں اپنے کچھ بندوں کے ساتھ ان کی نگرانی کر رہا ہوں۔“ ڈیشان نے سکون سے کہا۔

”خیر، تم بہتر سمجھتے ہو، لیکن فرزانہ ہمارے لئے اسی حالت میں کارآمد ہے، اس کے بعد نہیں۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا تو عشاء بولی۔

”یہی بات میں اسے سمجھا رہی تھی۔“

”مگر تم مجھے یہ نہیں بتا رہی ہو کہ ہم فرزانہ تک کیسے پہنچیں۔ اس سے کس طرح بات کریں۔“ ڈیشان نے سکون سے کہا۔

”یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ اسے یہ باور کرا دو یہ کہ ہمیں اس کے بارے میں پتہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد بات کرنے کا جواز پیدا ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا

”میں تو اس کے پاس جانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یوں سیدھے سجاؤ وہ بھی نہیں مانے گی۔“ عشاء نے سوچتے ہوئے کہا۔

”مطلب اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ میں کرتا ہوں کچھ۔“ ڈیشان نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور فون پر نمبر پس کرنے لگا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا۔

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ فرزانہ نے شرمندہ سے انداز میں وہ سرخ مخملی ڈبیہ پکڑ کر کھولی تو اس میں مردانہ آغوش تھی۔

”تمہیں یہ کیسے خیال آیا۔“ فرزانہ نے پوچھا۔

”مجھے پتہ تھا، اب میرے دوست پوچھیں گے تو میں انہیں بتا سکوں گا۔ اس میں اگر تمہاری عزت ہے تو میری بھی ہے۔ تم فکر نہ کرنا، جتنا میرے بس میں ہوا، وہ میں کروں گا۔“ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”تم نے کرنا ہے سب، میں جو تمہاری ہوں۔“ اس نے پیار جتاتے ہوئے کہا تو اسلم نہال ہو گیا۔

”اجاب اسے سنجال کر رکھ لینا، میں اب چلتا ہوں۔ جمعہ کو آئیں گے، اگر کوئی بات ہو تو مجھے فون کر لینا، ویسے میں رابطہ رکھوں گا تمہارے ساتھ۔“

”میں فون کر دوں گی۔ ویسے جمعہ کو ٹھہر نکال کر آنا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو اسلم بھی ہنس دیا۔ پھر پلٹ کر دروازے سے نکلتا چلا گیا۔ فرزانہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرخ مخملی ڈبیہ کو دیکھا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے وہ لے جا کر ٹریک میں رکھ دی۔ پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ نجانے کیوں اسے اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا تھا۔

اگلے دن وہ صبح ہی صبح جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ حالانکہ وہ اپنے آپ میں فحاش محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے بہت روکا لیکن وہ جھوٹ بول دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسے آج پھوپھو کے ساتھ کسی خاتون ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ اگر وہ پھوپھو کا سہارا نہ لیتی تو خود کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

فرزانہ جس وقت بیگم ثروت کے ہاں پہنچی تو پھوپھو لاؤنج میں بیٹھی اس کے انتظار ہی میں تھی۔ اسے دیکھتے ہی پاس بلایا اور جیسے سے بولی۔

”میں نے اس ڈاکٹر وقت لے لیا ہے۔ اس کے کلینک پر ہم نے جانا ہے، تم کام ختم کرلو، بلکہ جتنا ہوتا ہے اتنا ہی نہالو۔ پھر چلتے ہیں۔“

”بیگم صاحبہ.....“ اس نے سرمراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ساری باتیں اسی سڑک پر کھڑے کھڑے پوچھی ہیں؟“ عشاء نے کہا۔
 ”میں کبھی نہیں؟“ اس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔

”یہی کچھ تو تمہیں سمجھانے آئے ہیں کہ تم ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گئی ہو۔ ممکن ہے تمہیں قتل کر دیا جائے۔“ عشاء نے اپنی طرف سے بھوٹ بول کر محض اسے ڈرانے کے لئے کہا۔

”یہ..... یہ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ فرزانہ خوف زدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”ہم اس ننھی جان کے بارے میں بھی جانتے ہیں، جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئی۔“ عشاء نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا تو فرزانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہی لمحوں میں عشاء نے فرزانہ کو قہقہہ لیا اور بڑے پیار سے کہا، ”آؤ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فرزانہ کو لیا اور کاری چھٹی نشست پر بٹھا دیا۔ وہ کار میں بیٹھ گئی تو اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ڈیشان کی طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

”کون لوگ ہیں آپ؟“

”ہم تمہارے ہمدرد ہیں فرزانہ۔ گھبراؤ مت۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بلکہ ہم تمہاری زندگی بچانا چاہتے ہیں۔“ ڈیشان نے نرم لہجے میں کہا اور کیرنگا دیا۔

فرزانہ کسمسار رہی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کار میں بیٹھ کر غلطی کی ہے۔ پتہ نہیں کون انجان لوگ اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں؟ وہ اس کا کیا کرنے والے ہیں۔ اس کے خوف زدہ چہرے سے سب عیاں ہو رہا تھا۔ ڈیشان تیزی سے کار بھگاتے ہوئے اپنے گھر جا پہنچا۔ اس نے پورچ میں گاڑی کی تو ڈاکٹر ظہیر باہر آ گیا۔ ان کے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں پر آ گیا تھا۔ عشاء نے فرزانہ کو لیا اور اندر چلی گئی۔

لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر ظہیر کی ملازمت نے فرزانہ کو پانی پلایا۔ عشاء اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھی وہ ان کے اچھے رویے کی وجہ سے کافی حد تک مستحیل

”میں فرزانہ کے گھر کے بارے، میں معلومات لیتا چاہتا ہوں۔ میں اور عشاء آج ہی اس سے ملنے جائیں گے۔“ ڈیشان نے حتمی لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، مل لو اس سے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سے یہ سب چھپا رہی ہے جو چھو چھو کے ساتھ یوں کلینک گئی ہے۔ کوئی ایسا طریقہ ہو، جس میں اس کے ساتھ اکیلے میں بات ہو۔“ ڈاکٹر ظہیر نے مشورہ دیا۔

”جلسوں، میں سوچتا ہوں۔“ ڈیشان نے کہا پھر کچھ دیر اسی حوالے سے گپ شپ کرتے رہنے کے بعد ڈاکٹر ظہیر چلا گیا۔

ڈیشان سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیسے حل کیا جائے۔ رات گئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسی لئے صبح کے وقت وہ بیگم ثروت کے گھر سے کچھ فاصلے پر اپنی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر عشاء بھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے فون پر پیغام موصول ہو جاتا کہ فرزانہ اس وقت کہاں ہے۔ یہاں تک کہ انہیں پتہ چلا کہ فرزانہ بس سے اتر کر اسی سڑک پر پیدل آ رہی ہے جہاں وہ کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک جوان سال لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کی طرف آ رہی تھی۔

ڈیشان اور عشاء نے اپنے طور پر سوچا ہوا تھا کہ وہ فرزانہ سے کس طرح بات کریں گے۔ ان کی بات ماننے یا نہ ماننے کی صورت میں ان دونوں کا فرزانہ سے رویہ کیسا ہوگا۔ فرزانہ ان سے ابھی کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ عشاء کار سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس آئی، عشاء نے بڑے پیار سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”فرزانہ، میری بات سنو۔“

اپنا نام سن کر فرزانہ ایک دم سے ٹھنک گئی۔ اس نے حیرت سے عشاء کی طرف دیکھا اور زک گئی۔ اس نے عشاء کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے حیرانگی سے پوچھا۔

”آپ کون ہیں میں اور میرا نام کیسے جانتی ہیں؟“
 ”ہم تمہارا نام ہی نہیں، تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“ عشاء نے اپنا لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیا جانتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

گئی تھی لیکن اس کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی کہ لوگ کون ہیں اور اسے یہاں تک کیوں لے آئے ہیں؟ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر ظہیر نے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاید تم مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں اور یہ دونوں تمہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارا تم سے ایک ہی سوال ہے۔“

”کیسا سوال؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا تو وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

”اگر تم نے اس کا درست جواب دے دیا تو جو خطرہ تمہاری زندگی میں آنے والا ہے نہ صرف اس سے تمہیں بچائیں گے، بلکہ کئی زندگیاں خطرے سے باہر ہوں جائیں گی۔“

”کیسا سوال ہے وہ؟“ فرزانہ نے ڈراتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں آخر یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ تم نے اسپتال میں اپنا نام بتانے کی بجائے، ثانیہ شعیب کا نام لکھوا دیا؟“

”میں نے نہیں وہ تو پھوپھو نے.....“ اس نے بے ساختہ کہتا چاہا لیکن یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ شاید اسے سمجھ آ گئی تھی کہ یہ پیش کہنا تھا۔

”پھوپھو کے کہنے پر تم نے کیا؟“ ڈاکٹر ظہیر نے نرمی سے پوچھا تو سمجھ گئی کہ اب تیرا مکان سے نکل چکا ہے۔

”جی، انہوں نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ میں تو خود پریشان ہوں۔“ فرزانہ نے رو ہانسا ہوتے ہوئے کہا تو ڈیشان نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کے لئے جھوٹ بولنے ہوئے کہا۔

”تم نہیں جانتی ہو کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے اور یہ جرم تم سے پھوپھو کو روا رہی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم کل جس کلینک میں پھوپھو کے ساتھ گئی تھی۔ وہ تمہاری ہمدرد بن کر تمہیں مار دینا چاہتی ہے۔“

”مجھے کیوں مارے گی وہ؟“ فرزانہ نے شدت حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے کہ وہ جرم، جو اس نے کیا تمہارے مرجانے سے وہ ثبوت سمیت ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے اسی

بہانے تمہاری موت پھوپھو کے لئے ضروری ہے۔“

”یہ آپ لوگ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟“ اس نے شک بھری نگاہوں سے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ثانیہ کا مگسٹر ڈیشان ہوں۔ جانتی ہو میرے بارے میں؟“ ڈیشان نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ فرزانہ بری طرح چونک گئی تھی۔ اس سے ڈیشان سمجھ گیا کہ وہ سب جانتی ہے۔

”جی آپ کا نام تو سنا ہے۔“ اس نے کہا تو ڈیشان نے مزید دباؤ دینے کے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ کھیل کیا ہے۔ ہم صرف تم سے تصدیق کر لیتا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں سب بتا دیتی ہو تو ہم پوری طرح تمہاری حفاظت کریں گے۔ تم پر کوئی آج نہیں آنے دیں گے۔“

”میں کیا کہوں آپ سے؟“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”ڈرومٹ، میں ڈاکٹر ہوں، اسی اسپتال میں جہاں تمہیں پھوپھو لے کر گئی تھی۔ میں نے ہی ثانیہ کا علاج کیا تھا۔ حالانکہ وہ مریض نہیں تھی۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا تو فرزانہ نے پوچھا۔

”آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟“

”وہ سب کہو، جو تم جانتی ہو، پھوپھو نے آخر تمہیں کیوں مجبور کیا کہ.....“ ڈاکٹر ظہیر نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اگر تمہیں کوئی خوف ہے تو ہم تمہاری اماں کو یہاں لے آتے ہیں۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح سے جانتی ہے۔ اس نے مجھے دیکھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے ساری بات ہو جائے گی۔“ ڈیشان نے صلاح دی۔

”فرزانہ بتا دو یہ گناہ کس کا ہے؟“ عشاء نے اسے حوصلہ دیا۔ تو فرزانہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی پھر وہاں لہجے میں بولی۔

”یہ گناہ بابا کر امت شاہ کا ہے۔“

”کر امت شاہ..... وہ کون ہے؟“ ڈیشان نے بری طرح چونکتے ہوئے کہا۔

”وہ اس شہر کا بڑا مشہور جادوگر ہے میں اس کے چنگل

37

نئے افق

اکتوبر ۲۰۱۷ء

میں پھنس گئی تھی اور مجھے پھنسانے والی پھوپھو فاخرہ ہے۔ اسی لئے.....“ فرزانہ سے کہا نہیں گیا اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

”تم بوری بات تفصیل سے بتاؤ، پھر جو بھی ہوگا، ہم اسے دیکھ لیں گے۔“ ڈیشان نے اپنے غصے پر قابو پا کر ہوئے کہا۔ فرزانہ کچھ لمحوں تک خاموش رہی پھر ہنسی چلی گئی اس نے وہیں سے اپنی بات کا آغاز کیا تھا جب وہ اپنی ماں کی جگہ بیگم ثروت کے ہاں کام کرنے لگی تھی۔



پھوپھو فاخرہ بار بار کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اسے فرزانہ کا انتظار تھا جو ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے خود ناشتہ بنا کر بیگم ثروت کو دیا تھا۔ وہ باہر کارڈ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ پھوپھو فاخرہ کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ اس کا سامنا کرے۔ بیگم ثروت نے اس سے یہی پوچھا تھا کہ اب تک فرزانہ آئی کیوں نہیں؟ وہ اسے کہہ نہیں بتا سکتی تھی۔ پھوپھو فاخرہ نے اسے ڈاکٹر کے پاس کلینک لے کر جانا تھا۔ اس کے بعد فرزانہ نے دو تین چھٹیاں کرنا تھیں۔ آج آخر اسے ہوا کیا؟ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچی؟ کہیں اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو؟ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ اس کے ساتھ کیا ہوا، یہ اسے بالکل پتہ نہیں تھا۔ اس کے بارے میں لائسنس کی پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی۔

دن خاصا چڑھا آتا تھا۔ ابھی اس نے فرزانہ کو فون کر دیا۔ دوسری طرف سے فون بج کر بند ہو گیا تھا لیکن کال رسیو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بار بار کوشش کی لیکن ہر بار ہی کال رسیو نہیں کی گئی تو اس کی پریشانی عروج پر جا پہنچی۔ بار بار کوشش کرنے پر فون رسیو نہ ہوا تو اس نے اس نے خود یہ کہہ کر کھل دی کہ فون گھر رہ گیا ہوگا؟ لیکن یہ سوال ہنوز اپنی جگہ باقی تھا کہ وہ خود کہاں ہے؟ وہ اسی کشمکش میں تھی کہ بیگم ثروت اندر آ گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ فرزانہ آج کیوں نہیں آئی، تمہیں کچھ بتایا تھا اس نے؟“

”نہیں مجھے تو کچھ نہیں بتایا، ممکن ہے اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔ فون بھی تو نہیں رسیو کر رہی۔“ پھوپھو

فاخرہ نے کہا تو چند لمحے سوچنے کے بعد بیگم ثروت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”وہیے ایک بات ہے فاخرہ، کچھ دنوں سے مجھے لڑکی کا رویہ اچھا نہیں لگ رہا، بہت گم سم سی اور عجیب سی لگ رہی ہے۔“

”ہاں، وہیے میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ مجھے کچھ میں آتی ہے، اس بے چاری کی۔“ پھوپھو فاخرہ نے دردمندانہ انداز میں کہا۔

”وہ کیا.....؟“ بیگم ثروت نے پوچھا۔

”اس کی شادی کا مسئلہ اڑا ہوا ہے، وہ لڑکا، کیا نام ہے اس کا اسلم، اس کی ماں کبھی آکر کہتی ہے منگنی کر لے گی اور کبھی کہتی ہے نہیں۔ بس اسی چکر میں وہ بے چارہ ذہنی طور پر پریشان ہو گئی ہوئی ہے۔“ پھوپھو فاخرہ نے اس کی بھر پور کالت کر ڈالی تو بیگم ثروت نے کہا۔

”اس کے مسائل جو ہیں سو ہیں، ہمارے لئے تو مسئلہ پیدا نہ کرے، وہ رضیہ سے کہو یا تو خود آیا کرے یا پھر کسی نئی ملازمہ کا بندوبست کرو۔ اب ایسا کتنی دیر تک چلتا رہے گا۔“

”میں جاؤں تا بھلا اس کی طرف، پتہ کروں اس کا۔ ساتھ میں اس کی ماں سے بات بھی کر آتی ہوں۔“ پھوپھو فاخرہ نے کہا۔

”تو جاؤ چلی جاؤ، یہاں دن بھر بیٹھ کر تم نے کیا کرنا ہے۔“ بیگم ثروت نے کہا تو پھوپھو فاخرہ جانے کو تیار ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد پھوپھو فاخرہ ان کے گھر کے سامنے جا پہنچی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ اس کے خیال میں یہی تھا کہ رضیہ کہیں آس پاس کے کسی گھر میں ہو گئی اور وہ اسے کسی بچے کے ذریعے بلوالے گی۔ اسی لیے اس نے ایک بڑے بچے سے پوچھا۔

”بیٹے، یہ رضیہ کہاں گئی ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ جی۔“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو ساتھ میں کھڑے ایک لڑکے نے گلی کے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ ایک کار میں بیٹھ کر گئی ہے ادھر۔“
 ”کار میں بیٹھ کر؟“ پھوپھو فاخرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں جی، ایک سفید رنگ کی کار آئی تھی یہاں پر، اس میں سے ایک مرد اور ایک عورت نکلے اور اس کے گھر میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔“ اس بچے نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا تو پھوپھو فاخرہ ہول اٹھی۔ کہیں فرزانہ کو کچھ ہونہ گیا ہو؟ یہی سوچتے ہوئے وہ وہاں سے پلٹ گئی۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔



اس وقت ذیشان کے گھر ایک الگ کمرے میں ذیشان اور ڈاکٹر ظہیر کا مشترکہ دوست محسن سردار بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس میں انکسپکٹر تھا لیکن اس وقت وہ سادہ لباس میں ان کے پاس آیا تھا۔ فرزانہ کی بابت جو کچھ انہوں نے سنا تھا من و عن اسے بتا دیا تھا۔ ساری بات سن کر وہ بولا۔

”میں اس جادوگر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا، مجھے بس ایک دن کی مہلت چاہیے، میں اس کے بارے میں سب معلوم کر لوں گا۔ کیونکہ ایسے لوگ صرف اپنے آپ کچھ نہیں کرتے، ان کے پیچھے بڑے طاقت ور لوگ ہوتے ہیں۔ ہم ان پر اگر ہاتھ ڈال بھی دیں تو وہ صاف بچ نکلے ہیں۔ لوگوں سے لوٹا ہوا مال صرف اپنے تک نہیں رکھتے بلکہ یہ سبت کی صورت میں ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے جو ان کو تحفظ دیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ معصوم عوام کو دھوکا دے کر.....“ ذیشان نے کہنا چاہا تو وہ بچی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”نہیں تو لوگ اپنی جائز یا ناجائز خواہشیں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں، بانی جگہوں پر معصوم عوام کو کہاں کہاں دھوکا نہیں دیا جا رہا ہے۔ کہاں کہاں نہیں لوٹا جا رہا۔ کھانے پینے سے لے کر، روزمرہ زندگی کی چیزوں تک میں لوٹ کھسوٹ جا رہی ہے۔ پتہ بھی کہ یہ کون لوگ ہیں لیکن کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوئی؟ اس میں صرف پولیس بدنام نہیں ہے اور بڑے پردہ نشین ہیں۔“

”ہمارا مسئلہ فرزانہ کا ہی نہیں، ایک اور زندگی کا بھی سوال ہے۔“ ذیشان نے کہا تو محسن سردار بولا۔

”یار میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اس میں کچھ نہیں کروں گا، میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ اگر قانونی مدد لینی پڑی تب بھی اور غیر قانونی بھی کچھ کرنا پڑا تو وہ بھی کروں گا۔“

”ہم سب مل کر کریں گے، تم اکیلے تو ہو گے نا۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔
 ”دیکھو، مجھے اس کے بارے میں پوری معلومات لے لینے دو، دوسری جواہم بات ہے، جو مجھے سمجھ آ رہی ہے وہ یہی لڑکی فرزانہ ہے۔ ساری گیم اسی پر ہونی ہے۔ وہ لوگ یہ کوشش کریں گے کہ اسے نقصان پہنچائیں۔ اسے مار دیں، اسے کہیں غائب کر دیں۔ اس کی حفاظت سب سے اہم ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ میں اسے یہیں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ذیشان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
 ”نہیں، یہاں رہیں گے تو اغوا یا جس بے جا، یا کوئی بھی مقدمہ بنادیں گے۔ خواہ خواہ پولیس کو آپ کی جانب متوجہ کر دیں گے اسے کہیں اور رکھنا ہوگا۔“ محسن سردار نے مشورہ دیا۔

”وہ میں دیکھ لوں گا۔ اس معاملے میں بے فکر رہو۔“ ذیشان نے کہا۔

”تو بس پھر، میں کل صبح تک یہ سارا معاملہ اپنے طور پر دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد ہی کوئی ایکشن ہوگا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ محسن سردار نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ اسے باہر پورج تک چھوڑنے آئے۔

ذیشان اور ڈاکٹر ظہیر واپس لاؤنج میں آ گئے۔ جہاں عشنا فرزانہ، اس کی ماں رضیہ اور ذیشان کی ماما بیگم الماس بیٹھی ہوئیں تھیں وہ وہاں پر بیٹھے تو بیگم الماس نے پوچھا۔
 ”کیا بات ہوئی محسن سے؟“

اس پر ذیشان نے ساری بات کہہ دی تبھی رضیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”بیٹا، ہم غریب تو مارے گئے نا، ہم تو کہیں کے نہ رہے۔ وہ تو جادو کر کے ہمیں ویسے ہی برباد کر دے گا۔“
 ”اماں، اب اس سے زیادہ کیا برباد ہوتا ہے۔“ ذیشان

نے تلخی سے کہا تو ڈاکٹر ظہیر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں تم سب کو ایک بات بتا دوں۔ یہ حقیقت ہے کہ جادو انہی پر اثر کرتا ہوگا جو اسے مانتے ہیں اس پر یقین رکھتے ہیں۔ ورنہ یہ جادوگری اتنی ہی طاقتور ہوتی تو یہ ساری دنیا کو اب تک فنا کر چکے ہوتے اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں اسے رب پر بھروسہ رکھیں، کچھ نہیں ہوگا۔“

”اب یہی دیکھ لو، یہ سب جادو کی وجہ سے نہیں ہوا؟“ رضیہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

”تیمم الماس کی نگاہ رضیہ پر بڑی جہاں بہت زیادہ مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ فرزانہ کے چہرے پر حدودِ جبرِ شرمندگی تھی۔ تبھی تیمم الماس نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں پریشان نہ ہو۔ چند دن کی بات ہوگی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا تمہاری بیٹی کی شادی بھی ہوگی اور وہیں ہوگی جہاں فرزانہ چاہتی ہے۔ کسی طرح کے خرچ وغیرہ کی پروا مت کرنا۔“

”تیمم صاحبہ، وہ آج کل میں اس کی مشکلی کرنے آرہے ہیں۔“ رضیہ نے رد بانا ہوتے ہوئے کہا۔

”تو کوئی بات نہیں جس دن اس کی مشکلی ہو، اس دن ہم سب جائیں گے وہاں اس کی مشکلی کریں گے اگر کوئی ڈر خوف نہ ہوا تو وہیں اپنے گھر میں رہے۔“ تیمم الماس نے اسے کہا۔

”وہ تیمم ثروت.....“ رضیہ نے کہنا چاہا تو تیمم الماس نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ایک طرف تمہاری بیٹی کی زندگی اور عزت کا سوال ہے اور دوسری جانب وہ لوگ جنہوں نے تیری بیٹی پر ظلم کیا۔ اب اگر تم اپنی بیٹی کو ان کے چنگل سے نکالنا چاہتی ہو تو ہماری بات مان لو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ وہ لوگ ہمارے لیے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ بس اس ظالم جادوگر سے پنشن لے اور اس سے ہم اچھی طرح پنشن لیں گے۔“

”بی بی جی! ہم بہت غریب ماں بیٹی ہیں، میں نے تو زندگی گزار لی بس اسی کی فکر ہے، کیا ہوگا بے چاری کے ساتھ۔“ رضیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو، اسے کچھ بھی نہیں ہوگا، یہ اب ہماری ذمہ داری ہے۔“ تیمم الماس نے اسے ڈھارس دی۔ اس نے اپنی ایک ملازمہ کو بلایا اور اسے فرزانہ کے لیے ایک کمرہ ٹھیک کرنے کا کہا۔ کچھ دیر بعد ان دونوں ماں بیٹی کو اس کمرے میں لے جایا گیا۔ سہ پہر کے وقت رضیہ نے فرزانہ کو وہیں چھوڑا اور اپنے گھر چل دی۔

”چلیں ایک لمحے کو میں آپ کی بات مان بھی لوں تو کیا جادو قانونِ قدرت سے بڑھ کر ہے۔ کیا رب کا اپنا کوئی نظام نہیں ہے؟ اگر جادو ہی کوئی طاقت ہو تو یہ روز کا ایک بندہ تو پھر کا دیا کریں۔“

”جادو کا کوئی اثر تو ہے نا؟“ رضیہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”اگر آپ نہیں مانتی تو میں اس کی مثال پھر یوں دوں گا کہ ایک بہت بڑے ٹرک سے اگر کوئی کارنر دروازہ انداز میں ٹکراتا ہے تو ٹرک میں تھوڑی بہت لرزش ہوتی ہے لیکن زیادہ نقصان اسی کار کا نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات میں تم لوگوں کو اچھی طرح پھر سمجھا دوں اس وقت آپ سب اسی پر یقین رکھیں کہ اب کوئی جادوگر آپ لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”یہ کیسے ممکن ہوگا؟“ اس بار حنا نے پوچھا تھا۔

”اسے آپ پر یقین سے یہ کیسے ہوتا ہے یہ بعد میں بتاؤں گا اچھی یہ فیصلہ کرو کہ فرزانہ کی حفاظت کیسے کرنی ہے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا۔

”یہ بھی آپ ہی بتا دو۔“ حنا نے کہا۔

”میرا خیال ہے یہ ڈیشان ہی بہتر بنا سکتا ہے۔“ اس نے ڈیشان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”یہ ادھر ہمارے گھر ہی میں رہے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اماں رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اگر کوئی بھی فرزانہ کے بارے پوچھے تو آپ نے یہی کہنا ہے کہ فرزانہ ادھر ہمارے ہاں ہے۔ اس نے پہلے گھر سے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اب وہ یہاں کام کرے گی۔“

”اور یہاں یہ کام نہیں کرے گی، بلکہ اسے یہاں ہر

آئی، چلو بندہ کم از کم فون ہی کر دیتا ہے۔“ پھوپھو فاختہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چل ٹھیک ہے، جیسے تم کرو۔ لیکن کسی نئی ملازمہ کو تلاش کر لو پہلے۔“ بیگم ثروت نے کہا پھر چوتھے ہوئے بولی۔

”ارے ہاں یاد آیا، ابھی تھوڑی دیر پہلے شعیب کا فون آیا تھا، کل آرہے ہیں واپس خیرے۔“

”ہاں ابھی، ماشا اللہ کافی دن لگا دیئے انہوں نے تو۔“ پھوپھو فاختہ نے کہا۔

”میرا بیٹا، بڑا ذمہ دار ہے، پیچھے بڑس بھی تو سنبھالنا ہے، زیادہ دن کیسے باہر لگا سکتا ہے۔ تم کسی کام والی کا جلدی بندوبست کرو، اب خیر سے بہو بیٹا آرہے ہیں، مہمان بھی آئیں گے، کون کام کرے گا۔“ بیگم ثروت نے کہا۔

”میں آج ہی ادھر ادھر کام کرنے والیوں سے کہہ دیتی ہوں۔ ہو جائے گی کل تک، فکر نہ کرو تم۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھتے ہوئے بولی، ”ہائے ہائے اب چائے بھی خود ہی بنا کر پینی پڑے گی۔“

”میرے لئے بھی بنالیتا۔“ بیگم ثروت نے اسے کہا تو لاؤنچ سے نکلتی چلی گئی۔ وہ کچن میں جا کر پھر سے فرزانہ کے فون نمبر پر کوشش کرنے لگی۔ اس کا فون ہنوز بند تھا۔ چائے بناتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ان کے گھر پھر چائے گی، اگر نہ ملی تو سیدھی بابا کرامت کے پاس چائے گی۔

دن خاصا چھ آ یا تھا۔ ڈیٹان سٹڈی روم میں تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ظہیر بھی اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ محسن سردار کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہیں قریب ہی تھا۔ وہ دونوں بابا کرامت شاہ کے بارے ہی بات کر رہے تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ محسن سردار آ گیا۔ اس کے ساتھ اسد اعوان بھی تھا۔ وہ ان کا بچپن کا دوست تھا۔ اس وقت وہ ایک بڑے نیوز چینل میں کام کرتا تھا۔ اس نے آتے ہی بڑے ہنگامہ انداز میں پوچھا۔

”یاراتی بڑی بات ہوگئی، مجھے بتایا تک نہیں۔“

پھوپھو فاختہ کی پریشانی اپنے عروج پر تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فرزانہ کئی کہاں؟ اس کی ماں اگر مل جاتی تو بھی پتہ چل جاتا لیکن وہاں سے جو اسے اطلاع ملی وہ مزید دہلا دینے والی تھی۔ کون ہو سکتا ہے جو رضیہ کو کار میں لے گیا ہوگا؟ اسے کوئی معلومات مل جاتی تو شاید وہ اس کے متعلق سوچتی، لیکن یہاں تو کوئی پتہ ہی نہیں تھا سو، اندیشے، وسوسے اور سوچیں اسے گھیر چکی تھیں۔ دل میں اگر چور ہو تو ذہن بھی وہی کچھ دکھاتا ہے۔ فرزانہ کے گم ہو جانے سے اسے کیا نقصان ہو سکتا تھا، وہ یہی سوچے چلی جا رہی تھی۔ وہ بیگم ثروت کو جا کر کیا بتائے گی۔ یہ بھی اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ ایک بار تو اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ سیدھی بابا کرامت کے پاس چلی جائے اور اسے بتائے کہ فرزانہ گم ہو چکی ہے لیکن کیا واقعی ہی وہ گم ہو چکی ہے، اسے کوئی لے گیا ہے یا فرزانہ خود کہیں چھپ گئی ہے؟ اسے خود یقین نہیں تھا، وہ اسے جا کر کیا کہتی۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں واپس گھر پہنچی۔ اس کا سامنا بیگم ثروت ہی سے ہوا جو بیوی لاؤنچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ جیسے ہی پھوپھو فاختہ پر پڑی، اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”فاخرہ، کیا کہتی ہے رضیہ؟ فرزانہ کیوں نہیں آئی۔“

”ان کے تو گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ لگتا ہے دونوں ماں بیٹی کہیں گئی ہوئی ہیں؟ اس نے دوسرے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کسی کو بتا کر بھی نہیں گئیں؟“ بیگم ثروت نے بیوی پر نگاہیں جمائے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے وہاں پوچھا، لیکن کسی کو پتہ ہی نہیں تھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ رخ لہجے میں بولی، ”میں تو کہتی ہوں نکالو اسے باہر، کوئی کوئی نئی ملازمہ رکھ لو۔ یہ فرزانہ کے تو خیرے ہی بڑے ہیں، جیسے یہاں کام کر کے ہم سب پر بڑا احسان کر رہی ہے۔“

”میں نے تو کہا ہے، کوئی رکھ لو نئی ملازمہ۔ لیکن اسے تو جواب دے دو پہلے۔“ بیگم ثروت نے کہا۔

”بس جواب ہی جواب ہے اسے، بتائے بتائی وہ نہیں

”یہ کچھ ٹھیک لگتا ہے۔ تمہارے ذہن میں اس کا پلان کیا ہے؟“ ذیشان نے پوچھا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔
 ”اس کے لئے پھر فرزانہ ہی کو آگے آنا پڑے گا۔“
 ”وہ کیسے.....؟“ اس نے پوچھا۔

اگر قانونی حصار میں لانا ہے تو..... کوئی ایسا دوست جو نڈر ہو یہ جادو وغیرہ سے گھبرانے والا نہ ہو اور ذرا بات کرنے والا آدمی ہو، اس سے ابتدا ہوگی جیسے ہی وہ اسے ایک خاص ٹریک پر لے آئے گا، وہیں سے پھر میرا کام شروع ہوگا۔“

”یہ آپشن بالکل درست ہے، کیوں ظہیر؟“ ذیشان نے پوچھا۔

”ہاں ہے تو درست، ہمارا جو نقصان ہوا سو ہوا، لیکن آئندہ لوگ تو اس سے بچ جائیں گے۔ اسے بے نقاب ہونا چاہئے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے زور دیتے ہوئے کہا تو محسن سردار خمی لہجے میں بولا۔

”بس تو پھر، یہ اسدا اعوان، یہ صحافی ہونے کے ناطے، اس سے بات کرے گا۔ میں بھی اس پر نگاہ رکھوں گا، ہم سب مل کر اسے گھیر لیں گے۔“
 ”ڈن ہو گیا۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔

”لیکن اس کے لئے اس لڑکی فرزانہ کو بہت مضبوط ہونا پڑے گا، کیونکہ ساری ٹیم اب اس کے سر پر ہوگی۔“ محسن سردار نے کہا۔

”میرے ذہن میں اس سے ہٹ کر بھی ایک بات ہے بابا کرامت شاہ سے رابطہ کرنے سے پہلے ہمیں ایک مشورہ مزید کرنا ہے۔“ اسدا اعوان نے کہا تو کبھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تب وہ بولا۔

”جس طرح لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے، اس طرح میں اس کی طرح کے ایک جادوگر سے بات کر لوں۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ مجھے شام تک کا وقت دو، میں یہ سارا ہوم ورک کر کے ہی اسے چھیڑتا ہوں کیونکہ جب اس کے ساتھ بات کی تو پھر کچھو کچھو جنگ شروع ہو جاتی ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی دیکھتا ہوں۔“ محسن سردار نے جلدی سے کہا۔

”دیکھو محسن جب بھی اور جس وقت بھی یہ جنگ ہو

”تجھے کیا بتائیں یار، ہم شریف لوگوں سے تم ملنے نہیں ہو، نجانے اس پولیس والے کے ہاتھ کیسے لگ گئے ہو۔“ ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سامنے والے صوفے پر پت پٹھتے ہوئے بولا۔

”بس تو ایک فون کال پر ہوتا ہوں میری جان، کبھی یاد کر کے دیکھو، باقی رہی اس پولیس والے کی بات، ہمارا ساتھ تو چلتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تو دیکھو آگیا ہوں ناشیطان کی طرح۔“

”احسان کیا ہے جناب مجھ پر۔“ ذیشان نے کہا تو محسن سردار بولا۔

”بات تو میں نے اسے ساری بتادی ہے۔ بہت ساری معلومات اس نے مجھے دی ہیں۔“

”کیا ہے وہ بابا کرامت.....“ ڈاکٹر ظہیر نے تیزی سے پوچھا۔

”میری معلومات کے مطابق، وہ ایک طاقتور آدمی ہے۔ اس کے پیچھے شہر کا سب سے بڑا مافیا گروپ ہے۔ جس کے تانے بانے سیاست سے لے کر کاروباری لوگوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بھی انہی کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس کو چھیڑنا تو گام بھڑ کے جھٹے میں ہاتھ ڈال دینا ہے۔“

”کوئی تورہ ہوگی، جہاں اس کے دوست ہیں، وہاں دشمن بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ کون ہیں؟“ ذیشان نے پوچھا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے بات کرنے کی۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری، اس کی شہرت ہے۔ لوگ اس کا نام سن کر اس کی طرف آتے ہیں، اگر اس کا نام اچھا لیا جائے گا تو.....“ محسن سردار نے کہا تاہم ڈاکٹر ظہیر بولا۔
 ”ہمیں محسن بھائی، اس طرح تو فرزانہ کو سامنے آنا پڑے گا۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے صاف کہا۔
 ”کوئی دوسرا راستہ، جو محفوظ بھی ہو۔“ وہ بولا۔

”محفوظ راستہ تو پھر یہی ہے کہ اسے سیدھے سجاؤ بلیک میل کیا جائے، اسے اس حد تک لے آیا جائے کہ وہ گھٹنے ٹیک دے۔ اس کے جرم کا اعتراف کروایا جائے۔ پھر اسے قانون کے حوالے کیا جائے۔“ محسن سردار نے مشورہ دیا۔

جائے، میں کم از کم اس سے نہیں گھبراتا۔ مجھے لڑنا پڑا تو لڑ لوں گا۔ ہم کمزور نہیں کہ کسی مافیا کا سامنا نہ کر سکیں۔ اسی مافیا میں ہمارے جانے والے بھی ہوں گے۔ مجھے کرامت شاہ کا وجود نہیں چاہیے۔ اسے قتل کروانا کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں دوسرے لوگ بھی اس سے بچ جائیں۔“

ذیشان نے کہا۔
”فکر نہ کرو یار، دیکھ لیں گے اسے بھی۔“ اسد اعوان نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا، ”تمہارے ہاں اب چائے پلانے کا رواج نہیں رہا؟“

”ناشتہ کرتے ہیں، پھر میں اس لڑکی سے ملواتا ہوں۔ آؤ۔“ ذیشان کہتے ہوئے اٹھا تو وہ تینوں بھی اٹھ گئے۔



دن کافی نکل آیا تھا جب پھوپھو فاخرہ نے ٹیکسی پکڑی اور سیدی رضیہ کے محلے میں جا پہنچی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ اگر اب بھی وہ نہ ملی تو کیا کرے گی۔ نہیں سارا معاملہ ہی تو چو پٹ نہیں ہو گیا۔ جیسے ہی اُس نے رضیہ کا دروازہ کھلا ہوا دیکھا، اس کی سانس میں سانس آئی۔

محسن میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اندر کمرے کی طرف جھانکا۔ بھی رضیہ کسی کی آمد کا احساس کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ جیسے ہی رضیہ کی نگاہ پھوپھو فاخرہ پر پڑی اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے گھور کر دیکھا تو پھوپھو فاخرہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ پھوپھو فاخرہ نے سلام کیا تو رضیہ نے غصے میں جواب دیتے ہوئے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا رضیہ کا یہی خیال تھا کہ اگر نہیں محسن میں بات ہوئی تو ساتھ میں ہسائے بھی سن سکتے ہیں جیسے ہی پھوپھو فاخرہ اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھی تو سانسے کی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے رضیہ نے پوچھا۔

”خیریت ہے فاخرہ بی بی، کیسے آتا ہوا؟“
”وہ..... فرزانہ، نہیں آ رہی ہے کام پر خیریت تو ہے نا؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو رضیہ نے دانت پیستے ہوئے غصے میں کہا۔

”نئی بھولی بیٹی ہے تو فاخرہ، میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی تو نے؟ رب نے اسی لیے تجھے اولاد نہیں دی۔ تو عورت نہیں ڈانٹ ہے ڈانٹ۔“

”ہوا کیا ہے بتاؤ تو سہی؟“ اس نے دھمکے سے پوچھا۔

”اب بھی پوچھتی ہے مجھ سے۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے ابھی تیرے کٹڑے کٹڑے کر دوں پر کوئی بات نہیں تیرا جو حشر ہونے والا ہے، وہ تم بھی نہیں جانتی ہو ڈانٹ۔ تجھے قبر تک نصیب نہیں ہوگی۔“ رضیہ نے روتے ہوئے اسے بد عائنیں دے ڈالیں۔ پھوپھو فاخرہ اندر سے دہل گئی تھی۔ اسے پوری طرح یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا جرم پکڑا گیا ہے۔ اب سوائے جھوٹ کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لئے بڑے اعتماد سے بولی۔

”مجھے پتہ بھی تو چلے میرا قصور کیا ہے؟“

”تو ایسا کر نکل جا یہاں سے ابھی اور اسی وقت ورنہ میرا غصہ بے قابو ہو گیا تو میں تجھے یہیں مار ڈالوں گی ڈانٹ۔ بے غیرت عورت تجھے میری پھول جیسی بچی پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔“ رضیہ نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔
”تجھے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، اگر تم مجھے بتائے گی تو مجھے پتہ چلے گا نا، آخر تجھے مجھ پر اتنا غصہ.....“

”گواس بند کر، ہم جیسی عورتیں اگر دوسروں کے برتن مانگھتی ہیں، دوسروں کے گھروں میں جا کر جھاڑو پونچھا کرتی ہیں تو عزت کی روٹی کے لیے۔ میں نے تو سمجھا تھا تم بڑی دیالو ہو، میری بیٹی پر دیتا کر رہی ہو۔ مجھے کیا پتہ تھا تم میری عزت کے درے ہو۔ اپنی عزت کے لئے ہم جان بھی دے سکتی ہیں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے، اور جو کچھ یہاں لا کر تم نے رکھا ہے۔ وہ اٹھا کر لے جاؤ۔“ رضیہ نے غصے میں کہا تو وہ پھر یہی بولی۔

”تجھے کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ مجھے بتاؤ آخر ہوا کیا ہے۔“

”بس کچھ دن ٹھہر جاؤ، تم اور تیرا کرامت شاہ، دونوں کو بچ چورا ہے نکا کروں گی۔ جس کے لئے تم نے یہ سب کیا، اسے بھی۔ میں بتاؤں گی لوگوں کو کس قدر رکرو چہرہ ہے تیرا اور تیری بیگم شروت کا۔ پھر تجھے سب پتہ چل جائے گا۔“ رضیہ نے غصے میں کہا تو پھوپھو فاخرہ کی آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ معاملہ اس حد تک چلا جائے گا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر عجب سے حقارت بھرے لہجے میں بولی۔

”جب پتہ ہی چل گیا تو پھر.....“ پھوپھو فاخرہ نے روہنا لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ میں جب تک ہوں کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کی یہ جرات نہیں کہ وہ میری طرف انگلی اٹھا سکے۔ تم اگر یوں بدحواسیاں دکھاتی رہی تو سردگی تم۔ میرا کچھ نہیں جائے گا۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”بابا جی ایسے مت کہیں، میرا تو ایک ہی ذرہ ہے اور ایک ہی ٹکڑا، یہ بات کھلے کی گویں کہیں کی نہیں رہوں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”ایسی باتیں ایسے کام کرنے سے پہلے سوچی جاتی ہیں۔ ہمت کرو، جواب دو ان لوگوں کو۔“ بابا نے حقارت سے کہا تو وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے کچھ تو حوصلہ دیں، یوں کیسے بے یار و مددگار چھوڑ رہے ہیں آپ؟“

”تو یہ بات کرونا، تم نے یوں شور مچا دیا جیسے سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے۔ آرام سے بیٹھو۔“ اس نے پھوپھو فاخرہ کو جھڑپتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے ڈرے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر گزری تھی کہ بابا کرامت بولا: ”اب بتاؤ، بات کیا ہے؟“

اس پر پھوپھو فاخرہ نے فرزانہ کی اچانک گم شدگی کے بعد ہونے والی صورت حال سے لے کر رضیہ سے ہونے والی ملاقات تک سب بتا دیا۔ بابا کرامت بالکل خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ وہ جب خاموش ہو گئی تو وہ کتنی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کی خاموشی کے باعث وہ بولی۔

”مجھے اسی وجہ سے ڈر لگ رہا ہے کہ اب بات پہلے مگی۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اس میں ڈرنے یا خوف زدہ ہو جانے والی بات نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جان سے نہ جائے، مگر وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اب زندہ نہیں رہے گی۔ تم جاؤ اور سکون سے رہو، ایک دو دن میں اس کی خبر سنو گی۔ یہ کہتے ہوئے وہ چونک گیا، پھر بولا ”اور ہاں، تم نے شور نہیں مچانا، یوں ہو جاؤ کہ جیسے تمہیں کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔“ مگی تم؟“

”بہت بکواس کر لی تم نے، اب سن میری۔ جہاں تک کرامت شاہ کی بات ہے، تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی ہو۔ تم اور تمہاری بیٹی، کیا اوقات رکھتی ہیں اس کے سامنے۔ تیری بیٹی خود بھی دہاں پر، اس کا رشتہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب تیری بیٹی جو بھی جھوٹ بچ بولے گی اس پر یقین کرتی چلی جاؤ گی۔ اصل حقیقت کیا ہے جانے کی کوشش بھی نہیں کرو گی۔ پھر ہو تو رہا ہے تیری بیٹی کا رشتہ.....“

”تم نے جو کہنا تھا کہ لیا، اب نکل یہاں سے، میں جان گئی ہوں، تجھے اب بھی افسوس نہیں، تم بھی اس جرم میں شامل ہو۔ میری اوقات کیا ہے، یہ دیکھنے کو تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ چل نکل۔“ رضیہ انھی اور اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ پھوپھو فاخرہ غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ پھر چند لمحے خاموشی سے کھڑی رہنے کے بعد تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

پھوپھو فاخرہ جان گئی مگی کی رضیہ کو سب پتہ چل گیا ہے۔ اس نے کئی بار یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے لیکن اسے تو یہ بھی رضیہ نے احساس نہیں ہونے دیا کہ اسے کس حد تک معلوم ہے۔ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ بیگم کا ثروت کا تو کسی نہ کسی طرح سے سامنا کر لیتی۔ باقی لوگوں کا کیا کرے گی؟ اگر غازیہ ہی کو پتہ چل گیا تو.....؟ اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ اس نے گھر جانے کے بجائے اپنا رخ بابا کرامت کے گھر کی جانب موڑ لیا۔ پھوپھو فاخرہ جیسے ہی بابا کرامت کے کمرے میں داخل ہوئی، اس نے چھوٹے ہی ردو پنے والی انداز میں کہا۔

”بابا غضب ہو گیا..... میں تو ماری جاؤں گی..... سب پتہ چل گیا ہے..... سب ختم ہو گیا؟“

”ارے فاخرہ کیا اول فول بک رہی ہے، کیا ختم ہو گیا، کیا پتہ چل گیا، کیسے ماری جائے گی؟“ بابا کرامت نے تیور یوں پر بل ڈالتے ہوئے غصے میں پوچھا۔

”وہ فرزانہ کہیں چھپ گئی ہے، اس نے اپنی ماں کو بتا دیا ہے، سب ختم ہو گیا۔“ اس نے ہولتے ہوئے کہا تو بابا کرامت غصے میں حقارت سے بولا۔

”کچھ ہوش کر، عقل کی دوا لے، تم کہاں بیٹھ کر، کس کے سامنے یہ بات کر رہی ہے۔“

ہاتھ سے ٹرے نکل کر فرش پر گر گئی۔ وہ لہراتے ہوئے خود بھی زمین پر گر گئی۔ بیگم الماس یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ جس وقت وہ فرش پر گر گئی، تبھی اس نے واہیل چلا دیا۔ لمحوں میں ملازمین بھاگتے ہوئے آ گئے۔ انہوں نے فرش پر پڑی ہوئی فرزانہ کو دیکھا۔

”دیکھتے کیا ہو۔ اسے فوراً اسپتال پہنچاؤ، جلدی سے گاڑی نکالو۔“ بیگم الماس نے چیختے ہوئے کہا۔ وہ اُسے اٹھانے لگے اور بیگم الماس نے سیل فون نکال کر ڈیٹان سے رابطہ کرنے لگی۔ اس نے جیسے ہی سنا، وہ سمجھ گیا معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی ماما سے کہا۔

”ماما، اسے فوراً ڈاکٹر ظہیر کے ہسپتال پہنچائیں۔ میں وہیں آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماما نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر ظہیر کی ڈیوٹی نہیں تھی لیکن وہ بھاگ بھاگ اسپتال پہنچا۔ اس وقت ایمر جنسی کے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ساکت سی فرزانہ بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ پیلا زرد ہو گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد فرزانہ کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر ظہیر نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں دردمحسوس کر رہی ہو؟“

تبھی بہت مشکل سے اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور سر کی جانب اشارہ کیا پھر اشارے ہی سے بے باور کرانے کی کوشش کی کہ جیسے اس کے بدن سے جان نکل رہی ہے۔ وہ بالکل بے دست و پا ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر کے لئے ایک خطرے کی بات تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک وقت کے لئے وہ مایوس ہو گیا لیکن وہ دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ سر توڑ کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر فرزانہ کی زندگی ہوئی تو وہ ضرور بچ جائے گی۔ اس کے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ ہوش میں آ گئی ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد فرزانہ نے جب بڑبڑانے والے انداز میں بتایا کہ وہ بہت حد تک خود کو اچھا محسوس کر رہی ہے تو اسے سکون ہو گیا۔ وہ باہر آ گیا۔

”جی جی سمجھ گئی۔“ پھوپھو فاخرہ نے کہا تو بابا کرامت چند لمحے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر اس نے اپنے پاس پڑے ہوئے لکڑی کے صندوق میں سے کچھ تلاش کرنا رہا۔ چند لمحوں بعد اُس نے ایک ہڈی نکالی، اسے اپنے سامنے قائلین پر رکھا۔ شاید وہ کسی جانور کی ہڈی تھی۔ اس وہ ایک کالے رنگ کے مارکر سے نقش بناتا چلا گیا۔ جب ساری ہڈی پر وہ نقش بنا چکا تو اس نے اسے ہوا میں لہرا کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ بابا کرامت کی آواز میں گھن گرج تھی۔ وہ یوں بول رہا تھا جیسے کسی نادیہ قوت کو حکم دے رہا ہو۔ کچھ دیر یونہی کرتے رہنے کے بعد، اس نے وہ ہڈی ایک جانب رکھ دی۔ پھر صندوق میں سے ایک گڑیا نکالی، اس نے ایک ہاتھ سے اسے بالوں سے پکڑ کر لٹکایا، دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کا گلہ دبانے لگا۔ چند لمحے یونہی کرتے رہنے کے بعد اس نے وہ گڑیا رکھی اور اس کے ماتھے پر ایک پن سوئی دبا دی۔ ایسا کرتے ہوئے پسینہ آ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے باہر سے کسی کو آواز دی۔ آواز کی بازگشت میں ایک مجھول سا شخص اندر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بابے کرامت نے وہ گڑیا اور ہڈی اسے دیتے ہوئے کہا۔

”جاؤ، انہیں قبرستان میں پھینک آؤ۔“

اس مجھول نشی نے کوئی جواب نہیں دیا، آگے بڑھ کر ہڈی اور گڑیا پکڑی اور انہی قدموں پر واپس پلٹ گیا۔ بھی اس نے پھوپھو فاخرہ کی جانب دیکھا۔

”اب جاؤ۔“ اس نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو پھوپھو فاخرہ اُٹھی اور چل دی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب فرزانہ اس دنیا میں نہیں رہے گی۔ وہ وہاں سے نکلتی چلی گئی۔



اس وقت فرزانہ بچن سے نکل کر لاؤنج میں آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ وہ الماس بیگم کے لئے چائے لے کر آ رہی تھی۔ الماس بیگم اسے آتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کا فاصلہ بیس فٹ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اچانک وہ یوں ساکت ہو گئی جیسے کسی نے اسے دبوچ لیا ہو۔ اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کوئی شدید کرب میں آ گیا ہو۔ وہ بے جان سی ہوتے ہوئی دہری ہونے لگی۔ اس کے

کھولیں اور قریب پڑے پانی پر دم کر دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر ظہیر کی جانب دیکھا کر دھمے سے لہجے میں کہا تو ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”یہ پانی اسے ابھی پلائیں۔“

ڈاکٹر ظہیر کے اشارے پر ایک نرس آگے بڑھی۔ اس نے فرزانہ کو سر کی جانب سے اٹھایا اور گلاس پکڑ کر اس کے لبوں سے لگایا۔ فرزانہ نے دو گھونٹ بھر لئے تو اس نے گلاس ہٹا لیا۔ کرم علی شاہ اس کی جانب دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جب تک گلاس واپس رکھا، فرزانہ نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے اسے ہوش آ گیا ہو۔

”کیسی طبیعت ہے بیٹی؟“ کرم علی شاہ نے اس سے پوچھا۔

”میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“ فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”ان شاہ اللہ، ٹھیک ہو جاؤ گی۔ آپ کریں ٹریمنٹ اس کا۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ گئے۔

وہ سب ڈاکٹر ظہیر کے کمرے میں جمع تھے۔ محسن سردار کو پتہ چل گیا تھا لیکن ابھی وہ کافی دور تھا، اس نے جلد ہی پہنچ جانے کا کہا تھا۔ سبھی ڈاکٹر ظہیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ صاحب، میری زندگی کا یہ دوسرا تجربہ ہے، پہلے تجربے میں مریض کو کوئی بیماری نہیں تھی، لیکن وہ ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی۔ ابھی میرے سامنے اس کی ٹریمنٹ جاری تھی لیکن جیسے ہی آپ نے دم کیا وہ فوراً بہتر ہو گئی۔ جس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی، اس نے اپنی طبیعت ٹھیک ہو جانے کے بارے میں بتایا۔ آخر یہ کیا کیمسٹری ہے؟“

”آپ کا یہ سوال بنتا ہے اور سوال ہونا بھی چاہیے۔ میں ایک مولیٰ بات آپ کو بتا دیتا ہوں، باقی سمجھنا آپ کا کام ہے۔“

”جی فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو ڈیشان اور اسد اعوان بھی ہمت نہ کوش ہو گئے۔

”یہ تو سمجھانے والی بات نہیں تاکہ انسان روح اور مادے کا عظیم شاہ کار ہے۔ رب تعالیٰ کی اس تخلیق کا اور اک خود انسان کو اب تک نہیں ہے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ اور اک خود رب تعالیٰ نے

”کیسی طبیعت ہے اس کی؟“ ڈیشان نے پوچھا۔
”اب بہتر ہے۔“ ڈاکٹر ظہیر نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھ، پھر چند لمحے ٹھہر کر سوچتے ہوئے انداز میں بولا۔

”یہ وہی علامتیں ہیں، جو فرزانہ کی تھیں۔ وہ جب آئی تھی تو ایسے ہی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں، یہ بھی جادو ڈونے وغیرہ کا شکار ہوئی ہے۔ لیکن، اب میں سمجھ گیا ہوں۔ اللہ پاک کے کرم سے میں پوری کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے یقین سے کہا۔ انہی لمحوں میں اسد اعوان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک بزرگ سا آدمی تھا۔ انہوں نے سفید سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا۔ سر پر گچڑی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، چہرے پر سفید براق واڑھی۔ گہری آنکھیں دراز قد بڑے وقار سے چلتے آرہے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گئے۔

”کہاں ہے وہ لڑکی؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔
”وہ آئی سی یو میں ہے۔ اب اس کی حالت بہتر ہے۔“

ڈاکٹر ظہیر نے بتایا تو اسد اعوان بولا۔

”کرم علی شاہ صاحب ہیں۔ میں انہیں ساتھ لایا ہوں۔ انہیں کچھ دیر کے لیے اس کے پاس لے جاؤ۔“ اسد اعوان نے کہا تو ڈاکٹر ظہیر نے چند لمحے سوچا۔ اسد اعوان نے یہی سوچا ہو گا کہ ممکن ہیں یہ میڈیسن اس کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکیں۔ اسی لئے وہ ان بزرگ کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ یہاں کوئی اتنا کام مسئلہ تو تھا نہیں کہ وہاں کوئی مخالفت کرتا۔ کسی طرح سے بھی سبھی فرزانہ کی زندگی کو خطرہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کرم علی شاہ کو آئی سی یو میں لے گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے ایک بار انہیں دیکھا۔ لیکن ڈاکٹر ظہیر نے انہیں اپنا کام کرنے کا اشارہ کیا۔

کرم علی شاہ نے ایک نگاہ بیڈ پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی فرزانہ کی طرف دیکھا، پھر قریب پڑے ایک اسٹول پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کیں اور پڑھنے لگا۔ اس کے لب ہلتے چلے جا رہے تھے۔ وہ پورے جذب سے پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد انہوں نے آنکھیں

انسان کو دینا ہے۔ خیر! جسم یا مادے کو اگر بیماری لاحق ہوتی ہے تو اس کا علاج اسی کے مطابق ہوگا۔ اور جو روح کی بیماری ہے، اس کا علاج روحانی ہی ہوگا۔ اس کی تفصیلات اور مثالیں بے شمار ہیں۔ ہم تاکچہ ہیں ابھی کہ بدنی اور روحانی بیماریوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔

”یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انسان کو روحانی بیماری ہے یا محض بدنی؟“ ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا۔
 ”وہ جیسے ایک مثال ہے تاکہ ہر انسان اپنا ڈاکٹر خود ہوتا ہے۔ وہ اگر خود پر ذرا غور کرے تو اسے پتہ چل جاتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن کیسے؟“ اس نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔
 ”دیکھیں، آپ فرض کر لیں، انسان میں پچاس فیصد خیر کے سیل ہیں اور پچاس فیصد شر کے۔ جب انسان حلال کھائے گا، پائیزہ سوچ رکھے گا تو اس کے خیر والے سیل اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ ان کے سامنے شر والے سیل کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ ایسا انسان روحانی طور پر صحت مند رہے گا۔ بلکہ اس کی قوت بڑھتی چلی جائے گی۔ اس پر شیطانی قوتیں اثر نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے برعکس آپ خود انداز لگائیں۔“ انہوں نے کہا۔

”مطلب روح بیمار ہو جاتی ہے۔“ ذیشان نے پوچھا۔
 ”نہ تو روح مرنی ہے اور نہ بیمار ہوتی ہے۔ یہ بہر حال پھر ایک طویل بحث ہے۔ ہاں کمزور ہوتی ہے اور اسے ہم خود کرتے ہیں۔ اپنے اعمال کی وجہ سے۔“ انہوں نے سکون بھرے لہجے میں کہا۔
 ”ہمارے اعمال سے؟“ اس بار اسد اعوان نے پوچھا۔
 ”یار، کبھی آپ نے شیطان کو دیکھا ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”بظاہر تو آنکھوں سے نہیں دیکھا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”یار وہ انسان کے اعمال ہی سے ظاہر ہوتا ہے تاکہ جب ہم ناجائز خواہشات کریں گے۔ انسان اور انسانیت کا خیال نہیں کریں گے تو شیطان کو راستہ دے دے گا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔
 ”یہ کام والیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔ چھوٹے لوگ۔“ اس نے حقارت سے کہا۔
 ”اب دیکھ، مانہ اور شعیب خیر سے ابھی تھوڑی دیر میں آرہے ہیں۔ گاڑی ٹکی ہوئی ہے انہیں لینے کے لئے۔ ابھی

رہے ہیں کہ وہ ہم پر حاوی ہو جائے۔ اسی سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے۔“
 ”اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟“ اسد اعوان نے پوچھا۔
 ”پاکیزگی۔“ انہوں نے ایک لفظ کہا۔
 ”پاکیزگی مطلب.....“ اس نے پوچھا۔
 ”یہ ہمارا دین ہمیں بتاتا ہے۔ ہمارے دین کی ہر عبادت کی روح پاکیزگی ہے۔ مثلاً جیسے زکوٰۃ کا مطلب ہی پاک ہونا ہے۔ حلال اور حرام کا تصور صرف دین اسلام میں ہے۔ جب انسان اپنے کردار اور سوچ میں پاکیزہ ہے تو اس کی روح بہت بڑی قوت رکھتی ہے۔ پھر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا، جو اس بچی کے ساتھ ہوا۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔ اسے میں ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آتے ہی ہوں گے۔ ان کے آنے سے کتنا کام بڑھ جائے گا۔ کون کرے گا یہ کام؟“ بیگم ثروت نے غصے میں کہا۔
 ”میں ابھی جاتی ہوں، ساتھ والی.....“ چھو پھوفا خرہ نے کہا تو وہ پولیس۔

”کوئی ضرورت نہیں تمہیں جانے کی۔ میں نے کہا دیا تھا سز نعمان سے، وہ اپنی کام والی آج بیچ دے گی۔ شام تک ہو جائے گا بندوبست۔ جاؤ جا کے آرام کرو۔“ بیگم ثروت نے غمی سے کہا تو چھو پھو نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اندر کی جانب چل دی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا، پورچ میں گاڑی کا ہارن بجا۔ بیگم ثروت اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی۔ تب تک شعیب اور ثانیہ اندر آ گئے۔ ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ والہانہ انداز میں ان سے ملی۔

”کسی ہیں ماما آپ؟“ شعیب نے اپنے ماں سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگ سناؤ، کیسا رہا ٹور۔“ بیگم ثروت نے کہا۔

”بہت بہترین۔“ شعیب نے کہا تو اسے الگ کرتے ہوئے وہ ثانیہ سے ملی، وہ بڑے خوشگوار موڈ میں گلے ملتے ہوئے بولی۔

”ماما، بہت مزہ آیا۔ اگلے سال ڈیفر سارٹی چشیاں منانے جائیں گے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ چلو بیٹو، اتنا لہسا سفر، تھک گئے ہوں گے۔“ بیگم ثروت نے کہا تو ثانیہ بولی۔

”ہاں تھک تو گئے ہیں۔“

”ہاں جاؤ، آرام کرو، پھر باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ انہوں نے اندر کی جانب اشارہ کیا تو وہ دونوں اندر بڑھ گئے۔ ڈرائیور نے ان کا سامان لا کر رکھ دیا۔



بابا کرامت شاہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس کا سیاہ کمرہ بڑا بھیا تک لگ رہا تھا۔ ایسے میں اس کے پاس پڑا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھے جو اجنبی تھی۔ اس نے کال رسیو کرتے ہوئے کہا۔

”کون بات کر رہا ہے؟“

”میرا نام اسد اعوان ہے، میرے نام اور کام سے تو تم واقف ہی ہوں گے۔“

”تم کون ہو، میں نہیں جانتا تمہیں، اور یہ تم بات کس انداز سے کر رہے ہو؟“ بابا کرامت نے ایک دم سے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

”تو پھر تم بہت جلد مجھے اچھی طرح جان جاؤ گے۔ میرا نام اپنے ذہن میں بٹھالو۔ کیونکہ اب تم نے میرے بارے میں سوچنا ہے اور تجھے خواب بھی اب میرے ہی آنے ہیں۔“ اسد اعوان نے سرد لہجے میں کہا۔

”کون بکواس کر رہا ہے، میرے سامنے آ کر بات کر۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”میں تو دنیا کے سامنے ہوں۔ اب تجھے تیرے کر تو توں سمیت دنیا کے سامنے لانا ہے۔ تم جس طرح لوگوں کی عزتوں سے کھیل رہے ہو، وہ سب کچھ سامنے لانا ہے۔“ اسد اعوان نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

”فون پر تیرے جیسے کئی بھوتکتے ہیں، میرے سامنے آ۔“ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”میرا فون نمبر تیرے پاس آ گیا ہے۔ اب تو نے فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرے پاس آؤ گے یا مجھے کہیں بلاؤ گے۔ تم نے جادو کر کے نام پر جو کچھ فرزانہ کے ساتھ کیا ہے، وہ سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ اگر تیرے پاس کوئی اپنی بے گناہی کا ثبوت ہے تو اسی نمبر پر فون کر لینا۔“

”تم اپنے آپ کو سمجھتی کہتے ہو، تیرے جیسے کئی میں اپنی جیب میں ڈال کر رکھتا ہوں۔ بندے کا بچہ بن ورنہ ڈو دیا پڑ ہی نہیں رہے گا۔ سمجھے۔“ بابا کرامت نے حقارت سے کہا تو وہ بولا۔

”تمہاری یہ دمکی میرے پاس فون میں ریکارڈ ہو گئی ہے۔ شام تک تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے، یہ تم بھی نہیں جانتے ہو۔ پھر کہہ رہا ہوں میں نے یہ فون اس لئے کیا ہے کہ تم اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت رکھتے ہو تو لے آؤ میرے آفس۔“ اسد اعوان نے کہا تو بابا کرامت شاہ دھاڑتے ہوئے کہا۔

”کوئی بھی ایرے غیر اٹھ کر مجھ پر الزام لگا دے اور

کنھوں سے خون پکٹنے لگا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا کہ اب تک اس کے جادو نے کچھ کیوں نہیں کیا تھا؟



سہ پہر کا وقت تھا۔ اسدا اعوان اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے شہر کا ایک معروف سوشل ورکر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں۔ سچی اس سوشل ورکر نے کہا۔

”اسد صاحب میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ سیدھے اپنا مدعا کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے، اس میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔“

”جی بولیں۔“ اسدا اعوان نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بابا کرامت نے بھیجا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اسدا اعوان کے چہرے پر روغل دیکھنے لگا، کچھ نہ پا کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بات سچ ہے یا جھوٹ، کوئی ثبوت ہے یا نہیں، ان ساری باتوں سے بہت کر آپ اس معاملہ کو نہیں چھوڑ دیں۔ بلکہ انہیں بھی کہیں جو اس کے پیچھے ہیں۔“

”ورنہ کیا ہوگا؟“ اسدا اعوان نے پوچھا۔

”مطلب میں کوئی دھمکی نہیں دے رہا، بلکہ کسی بھی سمجھوتے کی راہ نکال رہا ہوں۔ ظاہر ان لوگوں نے آپ تک اپروچ کی ہے تو ہی آپ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”چلیں اگر سمجھوتہ ہی کرنا ہوگا تو آپ کی آفر کیا ہے؟“ اسدا اعوان نے اس کی چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیا مانگتے ہیں؟“ اس نے محل کر بات کہہ دی۔

”آپ کیا دینا چاہئیں گے؟“ اس نے بھی پوچھ لیا۔

”میری دو چار لاکھ میں بات ختم کر دیں۔ ان کے علاوہ آپ کی بھی خدمت کر دی جائے گی۔“ اس نے صاف لفظوں میں بتا دیا۔

”بات اتنی سادہ نہیں ہے جناب، ان کا کہنا ہے کہ یا تو بابا کرامت اس لڑکی سے شادی کر لے۔ اس میں بھی شرائط ہوں گی۔ اگر نہیں تو کم از کم دو کروڑ روپیہ دے کر اپنی جان چھڑوا لے۔ اس سے کم پر ذرا سا بھی سمجھوتہ نہیں ہو

تیرے جیسے بلیک میلر اٹھ کر مجھے دھمکیاں دینے لگ جائیں۔ جس طرح تم بکواس کر رہے ہو، تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔“

”اس بے گناہ بچی کا ہونا ہی سب بتا دے گا۔ سارا ثبوت اس کے وجود میں ہے۔ تمہارے پاس یہی وقت ہے کہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتے ہو تو کر لو۔“ دوسری طرف سے کہا تو بابا کرامت شاہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کوئی جواب دینے فون بند کر دیا۔

یہ فون نہیں اس کی جان ہی کا اعلان تھا۔ فرزند اس کے گلے کی ہڈی بن سکتی تھی۔ وہ خود تو ساری حقیقت جانتا تھا۔ اسے پھوپھو کا فخر کے ذریعے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ فرزند کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ وہ منتظر تو تھا کہ کوئی اس کے سامنے آئے گا لیکن یوں دھڑلے سے دھمکی دے کر اُسے سامنے لانے کا کہا جائے گا، یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ تو احساس ہو گیا تھا کہ یوں اس سے رابطہ کرنا اور پھر تھوڑا وقت دے دینا، کسی سمجھوتے کا اشارہ تھا۔ اگر ان کا کوئی اور مقصد ہوتا تو اب تک وہ سب کچھ سامنے لا چکے ہوتے۔ ممکن ہے ان کے پاس کوئی ثبوت نہ ہوں، یہ سب اسے پھنسانے کی کوشش ہو۔ اسے خود اسدا اعوان سے رابطہ کرنا ہو گا یا پھر کسی تیسرے فرد کو درمیان میں لائے؟ آ نکھیں بند کرنے سے یا انہیں نظر انداز کرنے سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ لیکن اگر وہ خود رابطہ کرتا ہے اور تھوڑی سی بھی چلک دکھاتا ہے تو بری طرح پھنس سکتا تھا۔ کچھ دیر مزید سوچنے کے بعد اس نے سیل فون پر نمبر پس کئے اور رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رابطہ ہوتے ہی بولا۔

”کہاں ہو بھائی؟“

”یہیں ہوں بولو کیا بات ہے۔“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”فورا آؤ میرے پاس، ایک ایمر جنسی کا کام ہے۔ آج یا کل ہی میں کرتا ہے۔ بہت ضروری۔“ بابا کرامت نے کہا۔

”دو گھنٹے میں آپ کے پاس ہوں گا۔“ بھائی نے کہا۔ ”جلدی پہنچو۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کی آ

سکتا۔“

”میں تیار ہوں۔ کسی ہوٹل میں مل لیتے ہیں۔“ اسد فوراً

مان گیا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کو دس پندرہ منٹ میں بتا دیتا ہوں، ہم تین ہی ہوں گے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں

کہا۔

”ہاں، تین ہی، کھلے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“

اس نے کہا۔

”ڈن ہو گیا۔ میرا خیال ہے ہماری وہیں بات ہو

جائے گی۔ میں کرتا ہوں آپ کو فون۔“ اس نے کہا اور فون

بند کر دیا۔



ثروت بیگم کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے

چہرے پر غصہ پھيلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے شرمندہ سی

پھوپھو کا خرافہ موجود تھی۔ ایسے میں ثانیه کچن میں سے نکل اس

کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ وہ کھانے کی میز کی جانب بڑھی

۔ اس نے بیڈروم کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔

”شعیب، اب آگئی جاؤ نا، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

ثانیہ نے میز پر ٹرے رکھا، کھانا ٹھیل پر رکھ کر وہ ایک

جانب بیٹھ گئی۔

”یہ جو سز نعمان نے ملازمہ بھیجی، اسے کھانا ہی بنانا

نہیں آتا اور مجھے تو غصہ آرہا ہے اس رضیہ اور فزانہ پر، بنا

بتائے۔۔۔۔۔“

”بس کر بس خالہ، اب میں خود کھانا بنانا سیکھ لوں گی اور

آپ مجھے سکھائیں گی۔“ ثانیه نے پیار سے کہا۔

”آج تو تم نے کھانا آرڈر کر دیا، لیکن کیا روز روز ایسا

چلے گا اور تم کیا ایک دن ہی میں سیکھ لو گی۔“ ثروت بیگم نے

کہا۔

”اوہو، موڈ ٹھیک کریں۔ ابھی تو آپ یہ کھانا کھائیں

نا، باقی کل کیا ہوگا اس کا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔“

ثانیہ نے اپنے سامنے پلیٹ سرکاتے ہوئے کہا۔

”کیا کر لیا بندوبست۔“ ثروت بیگم نے پوچھا۔

”میں نے ماما کو فون کر دیا ہے۔ اگر کل کوئی کام والی مل

گئی تو ٹھیک ورنہ اسنے دن وہاں کا خانسا ماں یہاں آجائے

گا۔“ ثانیه نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”اوہ، یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور پہلے والی شرط تو ماننے

والی نہیں، اس میں تو بہت سارے تحفظات ہیں۔“ سوشل

ور کرنے حیرت سے کہا۔

”بس پھر یہی ان کا مطالبہ ہے۔“ اسد اعوان نے کہا۔

”اچھا، اگر میں براہ راست اس بچی سے یا اس کے گھر

والوں سے خود رابطہ کر لوں، انہیں منالوں۔ کہاں مل سکتی

ہے وہ مجھے؟“ سوشل ور کرنے پوچھا۔

”وہ اس وقت شہر کے سب سے مہنگے اسپتال میں

ہے۔“ اسد اعوان نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے

بعد کہا۔

”میرے خیال میں اس سے کم پر سمجھوتہ ہونا ممکن نہیں

ہے۔“

”ٹھیک ہے میں بات کرتا ہوں، اور وہاں جا کر ایک

گھنٹے کے اندر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔“ سوشل ور کرنے

اٹھتے ہوئے کہا۔

”او کے میں انتظار کرتا ہوں۔ ورنہ سورج ڈھلتے ہی

میں سنواری فائل کر دوں گا۔ پھر بات میرے ہاتھ میں نہیں

رہے گی۔“ اسد اعوان نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے

کہا اور اپنے سامنے پڑے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو

گیا۔

دن ڈھل گیا تھا لیکن ابھی تک سوشل ور کر کا فون اسے

نہیں ملا تھا۔ وہ اسی کے بارے سوچ رہا تھا کہ اس کا فون آ

گیا۔

”جی فرمائیں۔“ اسد اعوان نے کہا۔

”دیکھیں ایسی باتیں فون پر تو ہونی نہیں ہیں۔ کیا ہم

کسی دوسری جگہ بیٹھ کر اس پر بات کر سکتے ہیں۔“

”کہاں پر بات کریں گے آپ؟“ اسد نے پوچھا۔

”میرے ہاں تشریف لے آئیں، کسی ہوٹل میں،

وہاں سکون سے بات ہو جائے گی۔“ اس نے کہا تو اسد

بولا۔

”آپ اور میں تو یہاں بھی بات کر چکے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر تیسری پارٹی بھی براہ راست

بات کرنا چاہئے تو؟“

”کروں میں سے ایک کمرے میں فرزانہ کو رکھا گیا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا سے فاصلے پر تین نرسیں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ لیکن وہ براہ راست وہاں سے کمرے کے دروازے پر نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ دونوں وہاں فرزانہ والے کمرے کے سامنے آ کر۔ اگلے چند لمحوں میں ایک بندہ اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ باہر والا ایک بھی اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔“

سامنے بیٹھ پر فرزانہ چادر تانے سو رہی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ان دونوں افراد کے ہاتھ میں پسل تھے۔ ایک نے بیٹھ پر پڑی فرزانہ پر پسل تان لیا۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ فرزانہ کی جگہ سر ہانے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں لمحوں میں باہر سے آواز آئی۔

”اپنے ہتھیار پھینک دو۔ کھیل ختم ہو گیا۔“

اس آواز کے ساتھ ہی دونوں نے دروازے کی جانب دیکھا، ان کے ایک ساتھی کے پیچھے ایک بندہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پسل تانے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اگر اپنے بچاؤ کے لئے فائر کرتے بھی تو انہی کے ساتھی کو لگتا تھا۔ وہ ابھی حیرت زدہ تھے کہ دوسری جانب کمرے کی سے کڑک دار آواز آئی۔

”ہاتھ اوپر کرو۔“

انہوں نے اس طرف دیکھا، دونائیں کمرے کی میں سے اندر آگئی تھیں۔ اندر کے دونوں افراد کو یہ سمجھ آگئی تھی کہ حکم ماننا پڑے گا، ورنہ وہ ہمیں ختم ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنے پسل پھینک دیئے۔ پھر ان سب نے اپنے ہاتھ اوپر کر لیے۔

”دیوار کی جانب منہ کرو۔“

وہ بھی دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اگلے چند لمحوں میں کئی ساری جوان اندر آ گئے۔ انہوں نے بھی تلاشی لے کر ان کے ہتھ کڑیاں پہنا دیں۔ انہیں فوراً فرش پر بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔ بھی محسن سردار اندر داخل ہوا۔ اس نے سب کی جانب دیکھا اور بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں کس لئے یہاں آئے ہو اور تمہیں کس لئے یہاں بھیجا ہے۔ ورنہ تم لوگوں کے استقبال

”چل بیٹی، جیسے تیری مرضی، اب یہ تیرا گھر ہے، تجھے ہی سب سنبھالنا ہے۔ یہ ذمہ داریاں بھی تیری ہیں۔“ ثروت بیگم نے کہا تو ثانیہ نے پھر شعیب کو آواز دے ڈالی۔ آواز کی بازگشت میں وہ آ گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”پھوپھو، کیا ہو گیا ہے آپ کو اتنی اداس کیوں بیٹھی ہیں۔“

”کیا کروں، ایک طرف کوئی ملازمہ نہیں مل رہی، دوسرا تیری ماما کا غصہ قابو میں نہیں آ رہا۔ میں کیا کروں۔“ وہ روہنا ہوتے ہوئے بولی تو ثروت بیگم نے غصے میں کہا۔

”اب تو چاہتی کیا ہے، یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے تم مظلوم ہو۔ حد ہو گئی بھلا، میں نے تمہیں کیا کہہ دیا۔“

”او مانا خیال کیا کریں آپ، اتنا بھی غصہ ٹھیک نہیں، یہ کوئی مسئلہ ہے بھلا، میں لے آؤں گا کوئی ملازم، آپ کا تو غصہ بس پھوپھو پر ہی نکلتا ہے۔“ شعیب نے کہا تو ثانیہ بولی۔

”اب کوئی بات نہیں ہو گی، بسم اللہ کریں۔ چلیں پھوپھو۔“

اس نے پلیٹ پھوپھو کے سامنے رکھ دی۔ کچھ دیر بعد وہ سکون سے کھانا کھانے لگے تھے۔



رات کا پہلا پھر ختم ہو چکا تھا۔ اسپتال میں لوگوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈاکٹر اپنا راولڈ مکمل کر چکے تھے۔ اسپتال کے سامنے والا لان تقریباً خالی تھا۔ پارکنگ میں بھی اتنی زیادہ گاڑیاں نہیں تھیں۔ ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں ایک فورڈ میل گاڑی پارکنگ میں آرکی اس میں سے دھیرے دھیرے تین افراد باہر آ گئے۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اسپتال کی جانب یوں بڑھے جیسے وہ کسی مریض کی عیادت کو آئے ہوں۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہسپتال کے اندر چلے گئے۔ وہ استقبال کے سامنے سے اکیلے اکیلے ہو کر گزر گئے۔ وہ اس جانب بڑھ رہے تھے، جدھر مریضوں کے کمرے تھے۔

ان میں سے دو اس راہداری میں آ گئے، جہاں موجود

کے لئے اتنی فیلڈنگ نہ لگائی جاتی۔ لیکن کفرم کرو، بولو، کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”جب تمہیں پتہ ہے تو کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ان میں سے ایک نے کہا لفظ اس کی زبان پر تھے کہ حسن سردار نے پورے زور سے پاؤں کی ٹھوکرا اس کے منہ پر ماری۔ وہ چکر مار کر فرش پر جا پڑا۔

”تم کیا سمجھتے ہو تم نہیں بتاؤ گے، یا تمہیں کوئی بچانے آ جائے گا۔ پارکنگ سے لے کر یہاں تک سارے خفیہ کیمروں میں تمہاری ریکارڈنگ ہو چکی ہے۔ اسی طرح باہر لے جانے کی بھی ریکارڈنگ ہو سکتی ہے۔ اس دوران تم لوگوں کو مارنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ صرف دو بندے، تم لوگوں کو چھڑانے کو بڑھیں گے، وہ تو محفوظ رہیں گے اور تم لوگ مارے جاؤ گے۔“ حسن سردار نے کچھ اس طرح ٹھہیر لہجے میں کہا کہ ان سب کے چہروں پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا، ”بولو، بتانا ہے یا مرنے ہے؟“

”کیا چاہتے ہو؟“ وہ بندہ، جس نے تم لوگوں کو بھیجا ہے۔“ وہ بولا۔

”بابے کرامت شاہ نے بھیجا ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا تو حسن سردار نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ سامنے کیمرے میں دیکھ کر بولو۔ جو پوچھوں ادھر کہنا ہے۔“

وہ بھی اس جانب منہ کر کے کہنے لگے۔

”کس لئے آئے تھے؟“ حسن سردار نے پوچھا۔

”فرزانہ کو یہاں ختم کرنے کے لیے۔“

”سمجھو، کام ختم ہو گیا، فرزانہ کو تم لوگوں نے مار دیا۔ اب بابے کرامت کو اطلاع دو کہ تم نے اسے مار دیا ہے۔“

”وہ فون.....“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”لاؤ ان کے فون۔“ حسن سردار نے حکم دیا تو تینوں فون اس کے سامنے کر دیے فرش پر بیٹھے ہوئے آ دی نے ایک فون اٹھا لیا۔ اس کے نمبر پیش کیے اور کال ملا دی۔ وہ دوسری جانب رابطے کا انتظار کرنے لگا۔

شہر کے فائیو سٹار ہوٹل کے ہال میں وہ تینوں ایک کونے کی میز پر الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے فریش جوس دھرے ہوئے تھے۔ سوشل ورکر کی دائیں جانب بابا کرامت بیٹھا ہوا تھا۔ جس کا حلیہ وہ نہیں تھا، جس حالت میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھتا تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا شلوار ٹیچس پہنا ہوا تھا۔ اور سر پر سیاہ ٹوپی پہنی ہوئی تھی اس کے سامنے میز پر اس کا سیل فون بڑا ہوا تھا۔ اس کے بالکل سامنے اسد اعوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنا سیل فون اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بابا کرامت نے کہا۔

”یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے، میرے پاس نبھانے کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور پتہ نہیں کیسی کیسی خواہشیں کرتے ہیں۔ میں تو اس لڑکی کو نہیں جانتا۔ پتہ نہیں کب اور کس کام کے لئے آئی تھی۔ سامنے آئے تو پتہ چلے۔“

”دیکھیں اس نے یونہی تو آپ پر الزام نہیں لگا دیا نا۔“ اسد اعوان نے کہا۔

اس سے پہلے بابا کرامت کوئی جواب دیتا اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال رسیوو کی، دوسری طرف سے کچھ سنتے ہی اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ بھی اسد اعوان کے سیل فون پر پیغام آ گیا۔

بابا کرامت شاہ نے کال بند کی اور اسد اعوان کی جانب دیکھ کر کہا۔

”کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”یہی کہ اس لڑکی کو انصاف ملنا چاہئے۔ آپ نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔“ اسد اعوان نے کہا تو بابا کرامت شاہ نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”چلو دیکھتے ہیں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ آپ اپنا بتائیں، اس خبر کو روکنے کے لئے آپ کیا لیں گے۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہئے اور نہ ہی میں کوئی ایسا صحافی ہوں۔“ اسد اعوان نے کہا تو اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں کل بات کروں گا۔“

”چلو کل بات کر لیں گے۔“ اسد نے کہا اور ایک بڑا نوٹ ایٹش ٹرے کے نیچے رکھ کر وہ بھی اٹھ گیا۔ اس کے

ساتھ ہی سوشل ورکر بھی اٹھ گیا۔

بابا کرامت شاہ اور سوشل ورکر اٹھ کر جانے لگے تو انہی لمحات میں سفید کپڑوں میں ملبوس تین افراد اس کے پاس آنے لگے۔ بابا کرامت شاہ نے ان کی طرف غور سے دیکھا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

”شاہ صاحب، آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔“

”کون ہوتا لوگ اور کہاں لے کر جاتا ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”کہیں تو لے کر جائیں گے نا، آپ چلیں۔“ اس نے بنجیدگی سے کہا۔

”میرے پاس وقت نہیں، میں.....“ بابا کرامت نے کہنا چاہا تو ساتھ کھڑے شخص نے سخت انداز میں کہا۔

”اس بابے نے یوں نہیں ماننا، اس نے ذلیل ہو کر ہی جاتا ہے۔“ اس سے پہلے کہ بابا کرامت کچھ کہتا، وہی شخص آگے بڑھا اور اس نے بابا کرامت کا بازو بڑی مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولا۔

”اب سیدھا چل، ورنہ نہیں.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ بابا کرامت ایک دم سے گھبرا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ناچار ان کے ساتھ چل دیا۔ پوری ہی میں ایک فور وہیل گھڑی تھی۔ انہوں نے بابے کو اس میں ڈالا۔ پھر ان کے بیٹھے ہی فور وہیل چل پڑی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ ایک ویران سی جگہ پر پہنچے۔ وہاں ایک پرانی سی حویلی تھی۔ باہر لکڑی کا چھانک لگا ہوا تھا۔ فور وہیل جیسے ہی وہاں رکی۔ چھانک کھل گیا۔ وہ اندر چلے گئے۔ اندر اندر تھا۔ فور وہیل رکتے ہی کئی ساری نارنج روشن ہو گئیں۔ بابا کرامت کو نیچے اتارا گیا اور اسے سامنے والے ایک کمرے میں لے گئے۔ اسے ایک پرانی سی کرسی پر بٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں دھرا ایک لیپ جلا دیا گیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ بابا کرامت کے سامنے ایک میز تھا اور اس کے دوسری طرف فرزانہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتی ہی وہ اچھل پڑا۔

”تمہاری حیرت بجا ہے بابا۔“ اندھیرے میں سے محسن سردار نے روشنی میں آتے ہوئے کہا تو بابا نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... سب کیا ہے؟“

”تم شہر کے نامی گرامی جادوگر ہو۔ پتہ کرو، یہ سب کیسے ہوا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ فرزانہ کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے دبے دبے خوف سے کہا۔

”تم نے اپنے بندے بھیج کر فرزانہ کو قتل کروا دیا تھا نا، اب یہ اس کی روح ہے، جو تم سے انتقام لینے یہاں موجود ہے۔“ محسن سردار نے انتہائی بنجیدگی سے کہا۔

”یہ سب جھوٹ ہے، تم کون ہو؟“ اس نے سختی سے کہا لیکن اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”چلو تم نہیں بتاتے تو میں بتا دیتا ہوں۔ پھر تم سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔“ محسن سردار نے کہا اور چند لمحے خاموش ہو کر بولا، ”تمہارے پیچھے گئے اس سوشل ورکر کو جان بوجھ کر مہنگے ہوٹل کا اشارہ دیا کہ تم کسی طرح فرزانہ تک پہنچ سکو ٹھیک دو گھنٹے بعد تمہارے لوگوں نے مہنگے اسپتالوں میں فرزانہ نام کی لڑکی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں پتہ چل گیا اور ہم نے پورا پلان بنالیا کہ کیا کرنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

”میں تو.....“

”بکواس بند کرو اور میری بات سنو،“ محسن سردار نے کہا اور پھر بولا۔

”تمہارے لوگ ہم نے پکڑ لئے، انہی سے تمہیں یہ فون کرایا کہ فرزانہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس وقت تم اسد اعوان سے ڈیل کر رہے تھے۔ تمہارا خیال تھا کہ اگر مرگئی تو جان چھوٹ گئی اور نہ مری تو ڈیل کر لو گے، ایسا ہی تھا نا؟“

”غلطی ہو گئی، تم لوگ جو چاہو، میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے فوراً ہی ساری بات سمجھ کر اعتراف کر لیا۔

”اب کیا کرنا ہے، بولو،“ محسن سردار نے کہا۔

”جیسے آپ لوگ چاہیں گے، میں دیا ہی کر لوں گا۔“ اس نے پوری طرح ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایسے میں

کے ہاتھ پر پتل رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرائیگر دبا تا، بھائی نے بابا کرامت سے پوچھا۔
 ”ایک بار پھر سوچ لو، شادی کر لو اس سے عیش کرنا تم بھی کیا.....“

”ماردو اس چیل کو، میری زندگی تباہ کرنا چاہتی تھی، پھر ان سب کو مار دو۔“ بابا کرامت نے غصے میں دھاڑتے ہوئے کہا تو محسن سردار نے کہا۔

”اب مکمل ختم ہو گیا بابا، میں نے سمجھا تھا تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے اور سمجھ جاؤ گے، لیکن شیطان تو شیطان ہی ہوتا ہے نا۔ بھائی اپنا کام کرو۔“

بھائی نے فرزانہ کے ہاتھ پر سے پتل ہٹا لیا۔ تبھی محسن سردار نے وہ پتل پکڑا اور دوسرا دے دیا۔ بھائی نے لوڈ پتل پکڑا اور بابا کرامت کی طرف کر دیا۔ بابا کرامت کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا پروردہ بھائی اُسے ماروے گا۔

”نہیں بھائی، نہیں، میں.....“ بابا کرامت نے کہا چاہا تو بھائی بولا۔

”تیری تو کوئی زبان نہیں ہے لیکن انہوں مجھے اس شرط پر چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے کہ تمہیں مار دوں۔ بولو مجھے کیا کرنا چاہیے، جیل جاؤں تمہیں اپنے ساتھ لے کر یا تمہیں مار کر بچ جاؤں؟“

”دیکھو، میں غلطی پر تھا، میں سب.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ بھائی نے فائر کر دیا۔ جو اس کی ناک کے قریب لگا اور سر سے نکل گیا۔ بابا کرامت لڑکھڑا کر کرسی سے نیچے جا پڑا۔ وہ وہیں فرش پر بڑبڑنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بابا کرامت اپنی خباثتوں کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا پھیلا یا ہوا احصار ٹوٹ چکا تھا۔



شعب اپنے بیڈروم میں تھا۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے اپنے بزنس کے بارے کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ٹائیپ بیڈ کے دوسرے سرے پر آکر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہی ہے۔ اچانک اس نے آنکھیں

ڈیشان بھی روشنی میں آگیا۔ اس نے پوچھا۔
 ”اب بولو تم نے اس لڑکی کے ساتھ کلم کیا؟“
 ”میں نے کہا نا، غلطی ہو گئی۔“ اس نے کہا۔

”پوری بات سناؤ، وہ بھی سچ سچ، پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔“ ڈیشان نے کہا تو بابا کرامت نے مختصر انداز میں وہی بات دہرا دی جو فرزانہ نے انہیں بتائی تھی۔ جہاں کہیں وہ ڈنڈی مارنے کی کوشش کرتا، وہیں فرزانہ اسے ٹوک دیتی۔ اس نے پھوپھو فاخرہ کا سارا کردار بتا دیا۔ وہ کب سے اس کے پاس آتی تھی اور کس مقصد کے لئے آتی رہتی تھی، وہ بھی کہہ دیا۔ بابا کرامت کی ساری باتیں ریکارڈ ہوتی چلی گئی۔ جب وہ ساری بات کہہ چکا تو محسن سردار نے کہا۔
 ”اب تمہارا فیصلہ، یہ فرزانہ ہی کرے گی۔ کیونکہ تم اس کے مجرم ہو۔“

اس سے پہلے کہ فرزانہ کچھ کہتی بابا کرامت تیزی سے بول اٹھا۔

”میں اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ اس کی جو بھی شرط ہوگی مجھے منظور ہے۔ جتنا حق مہر کہے لکھ دوں گا۔“
 ”میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ سوچ کر بتاتی ہوں۔“
 فرزانہ نے کہا ہی تھا کہ کمرے میں آواز گونجی۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ورنہ اپنی جان سے جائے گا۔“

اس آواز کے ساتھ ہی ایک شخص پتل لئے روشنی میں آگیا۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جو اسپتال میں فرزانہ کو قتل کرنے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پتل تھا اور اس کا رخ محسن سردار کی طرف تھا۔ اسے دیکھتے ہی بابا کرامت کھل اٹھا پھر بڑے جوش سے تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔
 ”واہ بھائی واہ، تمہیں ایویں ہی بھائی نہیں کہتے، کمال کر دیا تم نے۔ پہلے تو تم دھوکا کھا گئے لیکن اب پہلے اسی فرزانہ کو مار دو۔ فساد کی جڑ ہی ختم ہو جائے۔“

”تم فکر ہی نہ کرو، میں ان سب کو مار دوں گا۔“ بھائی نے کہا۔

”تم بھی فکر نہ کرنا، ان سب کو مار دو، دو کروڑ میں تمہیں دوں گا، ساری زندگی عیش کرنا۔ مار دو ان بے غیرتوں کو۔“
 بابے کرامت نے دھاڑتے ہوئے کہا تو بھائی نے فرزانہ

کھول دیں۔ اس نے اپنے ارد گرد یوں دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ پر ہو۔ اس نے پاس بیٹھے ہوئے شعیب پر نگاہ ڈالی۔ اس کے من میں شدید نفرت ابھری۔

”کیا ہوا ہے؟“ شعیب نے اس سے پوچھا۔

”یہ نہیں، مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔“ ثانیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”وحشت، میں سمجھا نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”تم کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے، یہ میرے اندر ہو رہا ہے سب کچھ، مجھے اس کمرے سے، تم سے، اس گھر سے وحشت ہو رہی ہے۔“ اس نے چیختے ہوئے کہا تو شعیب نے لیپ ٹاپ ایک جانب رکھا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”یہ کیا.....“

”مت چھو دو مجھے، نفرت ہے مجھے تم سے۔ گھن آ رہی ہے تم سے۔“ یہ کہتے ہی اس نے شعیب کا ہاتھ جھٹک دیا اور بیڈ سے اچھل کر کھڑی ہوئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ شعیب نے پریشانی میں پوچھا۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یہ کیا بک رہی ہو۔ میری اور تمہاری شادی ہوئی ہے، تم میری بیوی ہو۔“ شعیب نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ روم سے باہر نکل گئی۔ اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے پاس نہ سیل فون تھا اور نہ ہی گاڑی کی

چابی۔ وہ واپس پلٹی اور ڈریسنگ ٹیبل پر دھرا اپنا بیگ اٹھالیا۔ شعیب اسے ہکا بکا دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ تیزی سے لاؤنج میں آئی اور پھر پورچ تک چلی گئی، جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔

جس وقت تک شعیب پورچ میں پہنچا، وہ گیٹ تک جا پہنچی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا کہ شعیب اس تک جا پہنچا۔ اس نے چوکیدار کو منع کر دیا۔

چوکیدار نے کہا تو شعیب نے خود گیٹ کھولنے کے لئے لپٹی۔ شعیب نے اس پکڑا اور بڑے پیار سے بولا۔

”ایک منٹ ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔ تم نے آنا ہو تو بعد میں آ جانا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چوکیدار سے گیٹ کھولنے کو کہا۔ شعیب نے چوکیدار کو اشارہ کر دیا۔ اس نے گیٹ کھولا تو کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکلتی چلی گئی۔



مراد علی کے گھر کا لاؤنج بھر اہوا تھا۔ ایک طرف ڈیشان اور اس کی ماما موجود تھی، اس کے ساتھ حسن سردار، اسد اعوان اور ڈاکٹر ظہیر صوفی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ طلعت بیگم کے ساتھ ثانیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ایک صوفی پر رضیہ اور فرزانہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایسے میں داخلی دروازے سے شعیب، بیگم ثروت اور ان کے پیچھے پھوپھو فاخرہ لاؤنج میں آ گئے۔ ان سب کو یوں دیکھ کر پھوپھو فاخرہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً وہاں سے بھاگ جائے۔

اس پتہ چل گیا تھا کہ وہ پکڑی گئی ہے۔ وہ بھی ایک جانب صوفوں پر بیٹھ گئے تو مراد علی نے کہا۔

”آئیے آئیے، آپ لوگوں کا بی انتظار تھا۔“

”خیریت ہے یہ سب لوگ یہاں؟“ شعیب نے بڑے مان سے پوچھا، آخر وہ اس گھر کا داماد تھا۔

”پہلے نہیں اب خیریت ہے۔ بیٹھو۔“ مراد علی نے کہا تو ان سب کو دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ یہی حال ثروت بیگم کا تھا۔

پھوپھو فاخرہ بیٹھی تو مراد علی بولا۔

”رات جب میری بیٹی ثانیہ یہاں آئی تو میں پریشان ہو گیا۔ پہلے بھی ہمیں پتہ نہیں چلا تھا کہ میری معصوم بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہم سب اسے ذہنی مریضہ ہی سمجھتے رہے اور رات شعیب نے کہا کہ اسے پھر سے دورہ پڑا ہے۔

مطلب یہ بھی اسے ذہنی مریضہ ہی سمجھا رہا ہے۔ لیکن سچائی کچھ اور ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے بیٹھے لوگوں کی جانب دیکھا اور پھر بولا۔

”آپ میں سے کون بتائے گا؟“

”میرے خیال میں یہ ساری کہانی پھوپھو فاخرہ کو بتانی چاہیے، جو اس ساری برائی کی جڑ ہے، جیسی نے سارے فساد ڈالے۔“ ڈیشان نے کہا تو شعیب نے ٹکی سے کہا۔

”تمیز سے بات کرو۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم بڑوں سے.....“

.....

.....

.....

ذیشان نے کہا۔

”میں نے یہ سب اس لئے نہیں کیا کہ میں ثانیہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس لئے کیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو ثانیہ مجھے سمجھتی رہی ہے۔ اس سارے معاملے میں کون کیا تھا اور کس نے کیا کردار ادا کیا، سب کے سامنے ہے۔ ثانیہ پر اب بھی جبر نہیں ہے۔ ابھی یہ بہت جذباتی ہے۔ میرا مشورہ ہے، وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے تاکہ کسی کی بھی زندگی بچ نہ ہو۔“

”ذیشان مجھے معاف کر دینا، میں نے تمہیں غلط سمجھا، جو بھی ہوا سب انجانے میں ہوا، لیکن میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ چاہئے انجانے میں ہی سہی، اب شعیب میرا شوہر ہے۔ میں اسی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہوں گی۔“ ثانیہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”مجھے خوشی ہے تم بہت اچھا فیصلہ کیا۔ میں سرخرو ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے ذیشان اٹھا تو مراد علی نے کہا۔

”کاش کوئی میری بیٹی ہوتی تو میں تجھے سوئپ دیتا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں میرے بیٹے۔“

”آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چونک کر بولا، ”اب اس بے جاری فرزانہ کا کیا ہوگا؟“

”اگر اسلم اس کے ساتھ شادی کر لیتا، حقیقت بتا دینے کے بعد بھی تو ٹھیک درنہ میں اس کے ساتھ شادی کروں گا، میرا خیال ہے ثانیہ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہی میرا کفارہ ہوگا۔“ شعیب نے کہا تو فرزانہ پھوٹ پھوٹ رُودی۔ بھی ثانیہ نے کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”فاخرہ، اب تم کہیں اور ٹھکانہ کرو۔ میرے گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نکل جاؤ، اس سے پہلے کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکوں۔“ بیگم ثروت نے کہا تو فاخرہ یوں اُٹھی جیسے وہ جان چمڑانے کی ٹکر میں پہلے ہی سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

(ختم شد)

”بکواس بند کر دے شعیب، اور فاخرہ تم بولو، تم جو میری بیٹی کے بارے میں ڈائن بنی رہی ہو، بتاؤ اپنے منہ، بولو۔“ مراد علی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”یہ کہاں بتائے گی، مجھے بتانے دیں۔“ فرزانہ نے کہا اور پھر ساری بات کھول کر رکھ دی۔ ایک ایک سچائی بیان کر دی۔ وہ کچھ جگہ کی تو مراد علی نفرت سے بولا۔

”رات وہی وقت تھا جب اس کا ناپاک وجود اس دنیا سے صاف ہوا۔ ابھی اس کا جادو ٹوٹا۔ جب میری بیٹی پر اس عورت کا جلا ہوا جادو ختم ہوا۔ یہ سب لوگ میری بیٹی کے کرب کے گواہ ہیں۔ کس اذیت سے گزری ہے میری بیٹی۔ کیا لگاؤ تھا اس نے تم سب کا۔“

مراد علی کی آواز گونج کر رہ گئی۔ ان سب میں خاموشی چھا گئی تھی۔ شعیب نے پھوپھو کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”کیا یہ سچ ہے پھوپھو فاخرہ؟“

”مجھے سے غلطی ہوئی، میں نے تمہاری محبت میں یہ سب کیا۔“ اس نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

”اپنی محبت کے لئے میری بیٹی کو جینٹ چڑھا دیا تم نے؟“ رضیہ نے چیخ کر پوچھا تو اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس پر بیگم ثروت کھڑی ہوئی اور اس نے مراد علی کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

”جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، ہم نے غلطی کی۔ ہمیں سزا دی جائے۔“

بیگم ثروت کے یوں کہنے پر شعیب کٹ کر رہ گیا۔ اس کے لئے شرمندگی کی انتہائی کس کی ماں یوں سب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہے۔ وہ اٹھا اور اپنی ماں کو گلے لگا کر روتے ہوئے بولا۔

”میں شرمندہ ہوں ماما، میری ضد نے یہ دن دکھایا، میں ایسے نہیں چاہتا تھا، مجھے مرجانا چاہئے ماما، مجھے مرجانا چاہئے۔“

ماحول بہت دردناک ہو گیا تھا۔ ایک عورت کی بے وقوفی نے اتنے لوگوں کو ہند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔ اتنی زندگیوں کے ساتھ کھیلا گیا۔ کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ شعیب نے ثانیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں تمہارا مجرم ہوں۔ تم جو چلے ہے سزا دے سکتی ہو۔“

”تم اسے فوراً طلاق دو، پھر بھی اس طرف رخ نہ کرنا۔“ مراد علی نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا اس پر

زندگی

مہتاب خان

مسیحائی کے مقدس پیشے کو کاروبار بنانے والوں کی روداد
انسانی جانوں سے ٹھیلنا ان کا مشغلہ تھا وہ بڑی صفائی سے اپنی غلطیوں کو اللہ کی مرضی
قرار دے کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیتے تھے۔

ایک نوجوان ڈاکٹر کی ہمت کا احوال، اس نے اپنی برادری سے بناوٹ کر دی تھی

جیسی مہنگی تعلیم دلوانا آسان نہیں ہوتا..... اس کی فیملی نے
اپنی بہت ساری خواہشات کو چل کر اسے ڈاکٹر بنایا تھا
لیکن حرا کا معاملہ الگ تھا اس نے ایک دولت مند گھرانے
میں آکھ کھولی تھی وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور
بے حد لاڈلی تھی۔ وہ بے حد ذہین اور خوبصورت تھی۔ اس
کے والد ہاشم رضا ایک کامیاب بزنس مین تھے اور ڈاکٹر
بلال رضوی کے قریبی دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

دورانِ تعلیم سمیر اور حرا کا کانٹا کاٹنے کا مقابلہ رہا کرتا تھا۔
وہ بھی سمیر کی طرح ہم نصابی سرگرمیوں میں آگے رہا کرتی
تھی۔ ہر اسٹیوڈیو میں ان دونوں کی شرکت یقینی ہوتی
تھی۔ یوں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے کے بے
شمار مواقع ملے تھے پھر نہ جانے کب یہ ثمرت دوستی میں
بدل گئی اور دوستی نے محبت کا روپ دھارا دونوں کو کچھ پتا
نہیں چلا..... بہر حال اب ان دونوں نے اپنی عملی زندگی
کا آغاز ڈاکٹر بلال رضوی کے اس مشہور و معروف اسپتال
میں کیا تھا۔

وہ دن سمیر کی زندگی کا ایک اہم دن تھا..... اس شام چھ
بجے اسے امیر عسکری کال کی گئی تھی۔ اسپتال کے باہر ایک
ایمبولینس آکر رکھی تھی اس کے ساتھ میڈیا کی گاڑیاں اور
سائرن بجاتی پولیس کی موبائلوں نے بھی اسپتال
کو گھیرا ہوا تھا۔

”سرکون ہے یہ پشٹ؟ جس کے لیے پورا میڈیا
ٹوٹ پڑا ہے۔“ سمیر نے اپنے قریب کھڑے ڈاکٹر بلال
کے اسٹنٹ ڈاکٹر رستم سے پوچھا۔
”خورشید خان..... ایک سیاسی پارٹی کا مشہور لیڈر
ہے۔“

میڈیکل پروفیشن کو ایک بے حد باعزت اور باوقار
پروفیشن سمجھا جاتا ہے اور ڈاکٹر کو لوگ سچا سمجھتے ہیں ایسا
سچا جو اپنی زندگی کی آسائشوں کو دھکی انسانیت پر قربان
کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر بلال رضوی بھی ملک کے ایسے ہی ایک سب
سے بڑے اور مشہور و معروف سرجن تھے۔ لوگ انہیں
سرجری کا دیوتا سمجھتے تھے۔ انہیں بے شمار مشکل لیکن
کامیاب آپریشن کیے تھے اور کئی مریضوں کو موت کے منہ
سے بچالائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے شہر کے پوش ایریا
میں حال ہی میں اپنا پرائیویٹ اسپتال بنایا تھا جس کا نام
لائف اسپتال تھا۔ لائف اسپتال کے نظم و ضبط میڈیکل اور
ٹریینڈ پیرامیڈیکل اسٹاف کی شہرت جلد ہی دور دور تک
پھیل گئی تھی۔

اس اسپتال کی ڈاکٹرز کی ٹیم میں نئے آنے والے دو
ڈاکٹر زبیر اور حرا بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر بلال رضوی سمیر
کے آئیڈیل تھے۔ وہ یہاں جاب حاصل کر کے بہت خوش
تھا۔ اپنے آئیڈیل کو قریب سے دیکھنا اور ان سے سیکھنے
کا موقع ملنا اس کے لیے انتہائی خوشی کا باعث تھا۔

اساتذہ اور بے حد وجہ سمیر احمد اور ملکوتی حسن کی
مالک حرا رضا کا ساتھ برسوں برحیط تھا۔ ان دونوں نے
ایک ساتھ میڈیکل کی تعلیم مکمل کی تھی اور کلاس فلور ہے
تھے۔ سمیر کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والد
ایک مقامی کانج میں بیکچر تھے جبکہ اس کی والدہ گھریلو
خاتون تھیں۔ سمیر کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور تین بہن
بھائیوں میں سمیر سب سے بڑا تھا اس کے گھر والوں کو اس
سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور کیوں نہ ہوتیں میڈیکل



یہ کہتہ رہے ڈیڈی کو یہاں میرے علاوہ کوئی سرجن نہیں بچا سکتا۔ انہوں نے خون میں نہائے ہوئے بے ہوش خورشید خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جسے آپریشن تھیرلے جایا جا رہا تھا۔

آپریشن تھیرل میں خورشید کا آپریشن چل رہا تھا ڈاکٹر بلال اور ان کی ٹیم آپریشن میں مصروف تھی۔ سیر کے علاوہ حرا بھی اس ٹیم میں شامل تھی۔ خورشید کو چار گولیاں لگی تھیں ان میں سے دو پیٹ میں ایک کندھے میں اور ایک جڑے میں لگی تھی۔ یہ گولی سب سے خطرناک تھی۔ جڑے کی ہڈیوں میں کہیں لگی ہوئی تھی۔ پچھن ساٹھ سالہ خورشید اس وقت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے جسم سے بہت سا خون بہہ گیا تھا۔

ڈاکٹر بلال کے ہاتھ فنکارانہ انداز میں آپریشن کر رہے تھے۔ سیر کی نظر ان کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے یہ ایک آرٹ کے ہاتھ محسوس ہو رہے تھے۔ وہ نہایت انتہاک سے خورشید کے جسم سے گولیاں نکال رہے تھے۔ حرا کی نظریں مریض کی ہارٹ بیٹ، بلڈ پریشر وغیرہ بتانے والے آلے کے مانیٹر پر تھیں۔

”سر ہارٹ ریٹ گونگ ڈاؤن.....“ حرا چلائی۔
 ”فلاں! بجکشن لگاؤ.....“ بلال نے رستم کو بجکشن کا نام بتایا جسے مریض کو لگا دیا گیا تھا۔

”مجھے چند منٹ چاہیے..... بس چند منٹ اور.....“
 ڈاکٹر بلال ہڈیانی انداز میں بولے۔
 چند سیکنڈ گزرے تھے حرا چلائی، اوہ خدایا بی بی ڈاؤن سر۔“

”اوہ..... انہیں کیا ہوا ہے؟“

”کہیں جلسہ کر رہے تھے..... وہاں انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہمیں فون پر یہی اطلاع دی گئی تھی۔“
 ان دنوں ملک میں ایکشن کا انعقاد کیا جا رہا تھا اور خورشید خان ایک مشہور پولیٹیکل پارٹی کا ایک اہم رہنما تھا۔ ایک جلسے میں تقریر کے دوران مجمع میں سے کسی مخالف نے اس پر جان لیوا حملہ کیا تھا اور اسے گولیوں سے بھونک دیا تھا..... اسے فوری طور پر قریب ترین اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جو لائف اسپتال تھا..... ڈاکٹر بلال کے لیے یہ پیش قدمی ایک چیلنج بن کر سامنے آئی تھی۔ پورے اسپتال میں ایمر جی کی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر بلال بھی پہنچ گئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میڈیا کے نمائندے چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ پولیس اس مجمع پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ ڈاکٹر بلال کی گونج دار تیز آواز آئی۔ ”یہ کوئی سرکس نہیں ہے، ان سب کو باہر نکالیں.....“ بلال نے کہا۔ ”سیر اور رستم پیش قدمی کو آپریشن تھیرل میں شفٹ کریں جلدی۔“

خورشید خان کا اسٹریجر ایسیو نیس سے نکالا جا رہا تھا۔ اسٹریجر کے ساتھ ایک نوجوان بھی ایسیو نیس سے نکلتا تھا وہ تیزی سے بلال کے قریب گیا اور کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میرے ڈیڈی کو بچالیں..... پلیز ڈاکٹر.....“ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

”اپنی میلی کوجھ سے دور رکھنا“ مجھے میرا کام کرنے دینا اور بار بار ان کا حال پوچھ کر مجھے تنگ نہ کرنا..... اور فاسٹلی

”پلس بھی۔“ رستم انجانی پریشانی کے عالم میں چلایا۔
 ”سمیر فلاں انجکشن پیسٹ کے سینے میں لگاؤ۔۔۔۔۔۔“
 فاسٹ۔“ بلال نے تیزی سے کہا۔
 سمیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے انجکشن تیار تو کر لیا تھا مگر مریض کے سینے میں لگاتے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
 ”انکس میں لگانا ہے جلدی سمیر۔“ بلال نے تیزی سے کہا۔

”سوچ کیا رہے ہو سمیر۔“ ڈاکٹر رستم چلایا۔
 ”سمیر۔۔۔۔۔۔“ حرا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔
 خورشید کی موت اور زندگی میں چند بل کا فاصلہ تھا۔
 ”اس اسٹوڈنٹ کا آپریشن تھینر میں کس نے آنے دیا۔۔۔۔۔۔“
 مجھے دو انجکشن اینڈیٹ آؤٹ۔“ ڈاکٹر بلال نے اس کے ہاتھ سے انجکشن لیا اور مریض کے سینے میں لگا دیا۔۔۔۔۔۔ اب سب کچھ کنٹرول میں تھا، مریض کی حالت سنبھل گئی تھی۔
 سمیر آپریشن تھینر کے ایک کونے میں بت بنا کھڑا تھا۔
 آپریشن کامیاب رہا تھا، ڈاکٹر بلال باہر نکلے تو انہیں لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔۔۔۔۔۔ ان میں مریض کی فیملی کے افراد میڈیا سے تعلق رکھنے والے اور سیاسی نمائندے بھی موجود تھے۔

”ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔۔ خورشید صاحب کی حالت اب کیسی ہے؟“ ان میں سے کسی نے پوچھا۔
 ”آپریشن کامیاب رہا ہے۔ اب وہ آئی سی یو میں انڈر آیزرویشن ہیں انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 انہوں نے تیزی سے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جنہیں پولیس روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 سمیر تیزی سے ان کی طرف بھاگا۔
 ”سمیر۔۔۔۔۔۔“

وہ رے کے اور پلٹ کر سمیر کو دیکھا۔
 ”مم۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ آج جو کچھ ہوا میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔۔“
 ”تم آئی سی یو میں ڈاکٹر حرا کے ساتھ ڈیوٹی دو گئے، اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو فوراً مجھے انفارم کرنا۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پھر چند قدم چل کر رے کے اس کی طرف مڑے اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم ایک انجکشن تو لگا نہیں

پائے سرجن کیسے بنو گے؟“ یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔
 وہ بہت اداس بیٹھا تھا، حرا نے کب سے اس کے قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اسے پتا نہیں چلا تھا۔
 ”سمیر۔۔۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ ایمرجنسی میں ایسا ہو جاتا ہے۔“ حرا نے کہا۔
 ”میں نہ جانے کیوں اتنا اب سیٹ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بلال نے جو کہا سچ ہی کہا ہے میں کبھی اچھا سرجن نہیں بن سکتا۔“

”یہ ہماری یہاں پہلی سرجری تھی نا۔۔۔۔۔۔ اور اس پچویشن میں تو بڑے بڑوں کے ہاتھ کا پ جاتے ہیں۔ ہمیں اس قسم کی پچویشن کے ریٹر کا سامنا کرنا ہی تو سیکھنا ہے اور ایسے بھی کسی کے لٹو میں انجکشن لگانا آسان نہیں ہوتا اور وہ بھی ایسے شخص کو جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو۔۔۔۔۔۔“ حرا نے کہا۔
 ”مطلب میں ایک اچھا انسان تو ہوں مگر اچھا ڈاکٹر نہیں۔۔۔۔۔۔ یہی کہنا چاہتی ہوں نا تم۔“ سمیر نے کہا۔
 ”ایک اچھا انسان ہی اچھا ڈاکٹر بن سکتا ہے۔“ حرا نے جلدی سے کہا۔

اس واقعے کو گزرے تین چار دن ہوئے تھے جب اس صبح ایک نوجوان کو درد سے ٹپٹے ہوئے اسپتال لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت اور نوجوان دوشیزہ اور ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو اس نوجوان کا باپ تھا۔
 نوجوان بیڈ پر لیٹا درد سے کرا رہا تھا۔
 سمیر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا بوڑھا شخص بولا۔
 ”ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔۔ یہ میرا بیٹا سا جڈ ہے کل رات سے اس کے پیٹ میں شدید درد ہے۔۔۔۔۔۔ دو دن پہلے ہی اس کی شادی ہوئی ہے یہ میری بیوہ ہے۔“ اس نے اس خوبصورت لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس کی ہر ہنسی جیسی خوبصورت آنکھیں اپنے محبوب شوہر پر سے ہٹی نہیں تھیں۔
 ”ابلی ہوئی تھی انہیں؟“ سمیر نے پوچھا۔
 ”نہیں ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔ مگر بتا رہے تھے کسلی ہو رہی ہے۔“

لڑکی جلدی سے بولی۔
 ”ہم۔۔۔۔۔۔“ سمیر نے ہنکار بھرا اور اس کی قمیص اوپر اٹھائی اور معائنہ کرنے لگا۔۔۔۔۔۔ معاینے سے اسے اندازہ ہوا

کہ یہ اپنڈکس کا معاملہ ہے۔
 ”باباجی..... مجھے شک ہے کہ یہ اپنڈکس کا درد ہے۔“
 ”ہے؟“
 ”نہیں سر رپورٹس ابھی نہیں آئیں۔“
 ”تو کسے پتا چلا کہ اپنڈکس ہے۔ پیٹ درد کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔“ بلال نے سمیر کو کھورتے ہوئے کہا۔
 ”معائنے سے میں نے اندازہ لگایا تھا.....“ سمیر نے کہا۔

”دو تین دن سے ہلکا درد تھا..... شادی کے ہنگاموں میں میں نے زیادہ توجہ نہیں دی مگر کل رات سے تو یہ درد شدید ہو گیا“ میں نے کئی چین کلر کھائیں مگر افادہ نہیں ہوا۔“ وہ کراہتا ہوا بولا۔
 ”میرا بیٹا ٹھیک تو ہو جائے گا نا ڈاکٹر۔“ باباجی تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

”ارے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ معمولی مرض ہے انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے یہ۔“ سمیر نے باباجی کو تسلی دی۔ ”ابھی آپہیں درد روک کرنے کے لیے انجکشن دیا جائے گا اور کچھ ٹیسٹ لیے جائیں گے پھر ڈاکٹر بلال آپہیں دیکھیں گے اور وہی فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے ہم اسے ایڈمٹ کر دیتے ہیں۔“ باباجی نے کہا پھر ایک بھاری فیس وصول کر کے اسے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔

”اگلے دن صبح ڈاکٹر بلال اپنی ٹیم کے ساتھ راولپنڈی پر تھے۔“ ٹیکسٹ پیسٹ کون ہے؟“ ڈاکٹر بلال نے کہا۔
 ”ساجد احمد..... سر“ سمیر نے کہا۔
 ”ہم“ وہ تیز قدموں سے چلتے وارڈ کی طرف بڑھے..... سمیر ان کے قدموں سے قدم ملانے کے لیے تیز چل رہا تھا، وہ جیسے ہی مریض کے پاس پہنچے باباجی اور اس نو جوان کی بیوی کی اٹھ کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی سوچھی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے ڈاکٹر بلال نے ساجد کی فائل پر نظر پڑی دوڑاتے ہوئے کہا۔
 ”اسے ایڈمٹ کس نے کیا ہے؟“

”میں نے سر۔“ سمیر بلال کے قریب آ کر بولا۔ ”پسٹ پیٹ میں درد کی شکایت لے کر آیا تھا۔ ابتدائی معائنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اپنڈکس کا درد ہے۔“

”جب میں کہہ رہا ہوں کہ اوٹی خالی نہیں ہے تو نہیں ہے۔“ بلال نے دونوں لہجے میں کہا۔
 ”مجھے بتایا گیا تھا کہ کل کوئی سرجری نہیں ہے۔“ سمیر بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

”جی ڈاکٹر صاحب۔“
 ”اپنڈکس کی بیماری کو زیادہ پالنا نہیں چاہیے، ہمیں جلد ہی آپ کے بیٹے کا آپریشن کرنا پڑے گا“ آج اور کل اوٹی خالی نہیں ہے اس لیے ان کا آپریشن برسوں ہوگا..... ویسے بھی چین زیادہ نہیں ہے ہم رسک لے سکتے ہیں۔“
 ”جیہ آپ ٹھیک سمجھیں ڈاکٹر صاحب۔“
 ”کل آپریشن تھیرڈ سٹیج ہے سر کوئی سرجری نہیں ہے۔“ سمیر نے جلدی سے کہا اس نے اس خیال سے بلال کو انفارم کیا تھا کہ شاید ان کے علم میں نہیں ہے۔
 ”اوٹی سٹیج نہیں ہے کل آپریشن نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ سمیر اور ٹیم کے باقی ممبر بھی ان کے پیچھے لپکے..... دوسرے مریض کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اچانک پلٹے اور سمیر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولے۔
 ”آئندہ پسٹ پیٹ کے سامنے میری بات کاٹنے کی جرات نہ کرنا۔“ انہوں نے انتہائی غصے سے کہا۔
 ”سر..... میں تو صرف آپ کو بتا رہا تھا کہ آپریشن تھیرڈ.....“ سمیر نے کہا۔

”جب میں کہہ رہا ہوں کہ اوٹی خالی نہیں ہے تو نہیں ہے۔“ بلال نے دونوں لہجے میں کہا۔
 ”مجھے بتایا گیا تھا کہ کل کوئی سرجری نہیں ہے۔“ سمیر بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

انیت ہوئی تھی۔

”آپ کو پتا ہے میری نئی شادی ہوئی ہے اور فائزہ میری محبت ہے میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اور پھر بابا کا بھی میں واحد سہارا ہوں۔“

”فلرز کرو اور ریڈیکس رہو۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ وہ باہر نکلا تو کارڈور میں اس کا سامنا ڈاکٹر رستم سے ہو گیا حرا بھی اس کے ساتھ تھی۔

”کل آپریشن ٹیم میں تم شامل نہیں ہو میرے رستم نے کہا۔ حرا نے اسے کن انکھوں سے دیکھا۔

”مجھے پتا تھا کہ ڈاکٹر بلال اب مجھے اوٹی میں نہیں آنے دیں گے۔“ میر نے کہا۔ ”بہر حال ساجد کا خیال رکھنا پلیز۔“ اس نے حرا سے کہا۔

”میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں میں خیال رکھوں گی۔“ حرا نے کہا۔

”حرا تم پیسٹ کو ہدایات دے دو کہ اب سے صبح تک انہیں کچھ کھانا پینا نہیں ہے۔“ رستم نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

صبح بابا جی فائزہ کے لیے ناشتہ لے کر آئے تھے۔ اسی وقت نرس ماریا کمرے میں داخل ہوئی اور کہا۔

”یہ سرجیکل کٹ آپ کو خریدی ہے۔“ اس نے ایک لسٹ بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں لے کر آتی ہوں۔“ فائزہ نے لسٹ تھامی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر گزری تھی بابا جی بھی کسی کام سے باہر نکل گئے تھے۔ ساجد کمرے میں دردمند ہوا رہا تھا وہ اٹھا اور بے خیالی میں ٹیبل پر رکھی چائے کپ میں اٹلی پیچہ بسکٹ کھانے اور چائے کی کیا صرف ایک کھینے بعد اس کا آپریشن تھا اور وہ بالکل بھول گیا تھا کہ اسے کچھ کھانا پینا نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر میں ساجد کو اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا تھا۔ فائزہ اور بابا اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے ساجد نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا تھا فائزہ آنکھوں میں اٹانے والے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے فائزہ کا ہاتھ تھاما۔

”اپنا اور ابو کا خیال رکھنا فائزہ۔“ ساجد نے کہا۔ نرس ماریا اسے ایک روم میں لے آئی تھی۔

”گڈ مارننگ ساجد صاحب پیٹ خالی ہے آپ کا آپ

”ڈاکٹر سمیر..... میں جانتا ہوں کہ آپریشن تھیٹر دستیاب ہے..... مگر وہ نوجوان دو دن تک نہیں رہے گا جانتے ہو کیوں..... کیونکہ میں کہہ رہا ہوں..... اگر آپ لوگوں کو ایک کامیاب ڈاکٹر بننا ہے تو یاد رکھیں کہ یہ ایک پروفیشن کے ساتھ ساتھ بزنس بھی ہے ان دونوں میں مریض کے مختلف ٹیسٹ ہوں گے ضروری بھی اور غیر ضروری بھی۔“ انہوں نے ٹیم کے باقی ممبرز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”علاج کے پیسے لگتے ہیں یہاں نصب ماڈرن مشینیں..... دوائیاں آشاف یہ سب مفت میں نہیں آیا انہیں پیسے دے کر خریدا گیا ہے“ اسپتال پیسے پر چلتا ہے خدمت پر نہیں..... سوچیں ذرا اس نوجوان کی شادی پر اس کی ٹیبل نے کتنے لاکھوں خرچ کیے ہوں گے تو اس کی جان بچانے کے لیے خرچ نہیں کر سکتے..... اگر نہیں کر سکتے تو ہم سے بھی کوئی امید نہ رکھیں۔“

سمیر ہکا بکا سا ان کا منہ بکتا رہ گیا تھا۔ اس ڈاکٹر بلال رضوی نامی شخص کو جسے اس نے اپنے اندر دیوتا بنا کر رکھا تھا۔ اس دیوتا کا بت آج پاش پاش ہو کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔

”آپ کچھ سمجھ میں.....“ بلال نے سمیر سے کہا پھر انہوں نے ٹیم کو دیکھا۔ حرا نے کن انکھوں سے سمیر کو دیکھا..... سمیر تو سکتے کی کیفیت میں تھا۔

”جی سر ہم سب کی سمجھ میں آ گیا۔“ حرا جلدی سے بولی۔ ”آپ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے۔“

”کچھ سمجھو..... کچھ سمجھو اس سے۔“ بلال نے سمیر سے کہا۔

اس رات سمیر ساجد کے پاس بیٹھا تھا اگلے دن صبح ساجد کا آپریشن تھا۔

”کل تمہارا آپریشن ہے ساجد ڈر تو نہیں لگ رہا؟“ ”نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے آپ لوگوں پر بھروسہ ہے۔“ اس نے کہا۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولا۔ ”ایک سوال پوچھوں؟“ اس آپریشن میں مرنے کا خطرہ تو نہیں ہوتا نا۔“

”نہیں بار..... یہ تو بہت معمولی سا آپریشن ہے۔ اس سے کوئی مرنے نہیں ہے..... اور تمہیں تو ہم بالکل مرنے نہیں دیں گے۔“ سمیر کو ان چند ہی دنوں میں اس نوجوان سے

نے کچھ کھایا یا تو نہیں.....؟“ نرس نے پوچھا۔
 ”نہیں.....“ اس نے کہا پھر ایک دم سے کچھ بادا یا۔
 ”اوہ سسٹر..... میں نے صبح غلطی سے چائے اور کچھ بسکٹ
 کھا لیے تھے۔“
 ”اوہ یہ کیا کیا آپ نے؟ آپ سے کہا گیا تھا نا کہ.....“

”میں بھول گیا تھا سسٹر۔“ اس نے کہا۔
 ماریا دوڑتی ہوئی ڈاکٹر بلال کے پاس گئی وہ فون پر کسی
 سے بات کر رہے تھے۔
 ”ایلیکٹریسیٹی سر۔“ نرس نے کہا۔ لیکن بلال نے اس پر
 کوئی توجہ نہیں دی۔
 ”سر پیٹھٹ نے صبح ناشتہ کر لیا ہے۔“ نرس نے زور
 دے کر کہا۔

”کیا.....؟“ ڈاکٹر نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ آپریشن
 سے پہلے کچھ کھانا پینا نہیں ہے۔“
 ”نرس! نہیں بتایا گیا تھا لیکن وہ بھول گئے تھے۔“
 ”تو میں کیا کروں..... اب آپریشن کینسل نہیں ہو سکتا
 تمہیں پتا ہے نا کتنا رش لگا ہوا ہے، بہر حال آپریشن سے
 پہلے ٹیوب ڈال کر اس کا پیٹ خالی کر دیا جائے گا۔ اب تم
 جاؤ۔“ وہ جانے کے لیے مڑی مڑی کہ ڈاکٹر بلال نے کہا۔
 ”پیٹھٹ کی فیملی سے فارم سائین کروالیا ہے؟“
 ڈاکٹر بلال آپریشن تھیٹر میں پہنچے تو ان کی ٹیم پہلے سے
 وہاں موجود تھی۔ ساجد کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ آپریشن کی
 تیاریاں مکمل تھیں۔

”دی آرریڈی سر۔“ رستم نے کہا۔ ”گڈ۔“ بلال نے
 کہا، وہ کچھ سوچ رہا تھا اور کم صم تھا۔ ”اپوری تھنک اوکے
 سر۔“ حرائے نے کہا۔
 ”میں شاید کچھ بھول رہا ہوں۔“ بلال نے کہا۔ ”کچھ
 کرنا تھا مجھے۔“ وہ بیڑا لایا پھر سر جھٹک کر آپریشن میں
 مصروف ہو گیا۔

”ارے ڈاکٹر سیر آپ میں تو سمجھی تھی کہ آپ آپریشن
 تھیٹر میں ہوں گے۔“ آپریشن تھیٹر کے باہر کٹری فائزہ
 نے سیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”سر جری ڈاکٹر بلال کرتے ہیں میں تو جونیئر ڈاکٹر
 ہوں وہ بہت قابل ڈاکٹر ہیں آپ پریشان نہ ہوں۔“

یہ معمولی کا آپریشن تھا، ساجد کی ہارٹ بیٹ وغیرہ
 سب نارمل تھیں۔ ڈاکٹر بلال آپریشن کپیٹ کر چکے تھے
 ساجد کو اسپیجر لگائے جا رہے تھے۔
 بلال آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی ان کے فون پر بتل بجی
 تھی۔ وہ فون پر بات کرتے لاؤنج سے گزرے جہاں
 فائزہ اور بابا دیگر افراد کے ساتھ بیٹھے تھے۔
 ”ڈاکٹر صاحب!“ بابا بلال کو دیکھتے ہی ان کے پیچھے
 دوڑے۔

”جی۔“ وہ رکے۔
 ”میرا بیٹا..... ساجد“ بابا نے کہا۔
 ”آپ مل لیجے گا۔“ انہوں نے کہا اور تیزی سے آگے
 بڑھ گئے۔

کچھ دیر گزری تھی ساجد کو آئی سی یو میں لے آیا گیا تھا۔
 ”ساجد! نکھیں کھولو.....“ ڈاکٹر رستم نے اس کے
 چہرے کو کچھوا ساجد نے دیرے دیر سے آنکھیں کھولیں
 پھر بند کر لیں رستم نے ہلکے سے اس کے گال تھپتھپائے۔
 اسی وقت ساجد کو زور سے کھپاسی آئی اور اٹنی ہوئی
 اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔
 ”اوہ گاڈ.....“ رستم چلایا۔ ڈاکٹر ز جو ادھر ادھر اپنے
 کاموں میں مصروف تھے دوڑتے ہوئے وہاں آئے۔
 ”حرا ڈاکٹر بلال کو بلاؤ جلدی.....“ رستم نے کہا اور
 اسے آکسیجن لگا دی اور اس کی جان بچانے کی کوشش
 کرنے لگا۔

اسی وقت بلال تیزی سے کمرے میں آئے۔
 ”کیا ہوا ہے؟“
 ”اس نے آپریشن سے پہلے کچھ کھایا تھا یہ بتایا کیوں
 نہیں کیا۔“ رستم نے کہا۔
 ”اس کی سانس کی نالی میں غذا کے پارٹیکل پہنچ گئے
 ہیں۔“ وہ انہیں لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”نکا لو نہیں..... یہ تم پہلی بار نہیں کر رہے۔“ بلال اس
 کے قریب آ گیا۔ ”فلاس انجکشن لگاؤ اسے۔“ بلال نے
 ایک ڈاکٹر سے کہا۔

”سرا آکسیجن باڈی میں کم ہو رہی ہے۔“ حرا مانیٹر
 پر نظر پڑا۔
 ”سیر نہیں ہو سکتا سر۔“ رستم چلایا۔ ”کم آن رستم“ بلال
 نے کہا ”کرو تم۔“

”ساجد..... ساجد..... ساجد“ رستم نے اسے کئی آوازیں دے ڈالیں مگر وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔
 ”نئی از نوٹ رسانڈنگ ڈاکٹر“ رستم چلایا۔
 وہ آنکھیں نہیں کھولے گا..... وہ کوڑے میں چلا گیا ہے۔“ بلال نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”وٹنی لیٹر لگا دو..... زندگی میں پہلی بار مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوئی.....“ بلال تاسف سے بولے۔
 ”کیا ہوا تھا ڈاکٹر؟“ رستم نے کہا۔

”ماریا نے بتایا تھا اس نے بھول کر ناشتا کر لیا تھا“ یہ میں کیسے بھول گیا۔ مجھے اس کا پیٹ آپریشن سے پہلے صاف کروانا تھا۔“ بلال نے کہا۔

”واٹ؟“ رستم بری طرح چونکا۔
 ”لیکن غلطی صرف میری نہیں رستم..... آپ کو بھی چیک کرنا چاہیے تھا۔“

”پشٹ کی فائل آپ کے پاس تھی اور ماریا نے بھی آپ ہی کو انفارم کیا تھا۔“
 ”دیکھو رستم جو کچھ ہوا اسے یہیں ختم کر دینا چاہیے یہ باتیں باہر نہیں جانا چاہیے۔“

”لیکن ڈاکٹر ہم اس کی فیملی کو کیا کہیں گے آپریشن کا مہیا ہوا تھا تو مریض کو سے میں کیسے چلا گیا اور اسے وٹنی لیٹر پر کیوں رکھا گیا ہے۔“

”ہم ڈاکٹر ہیں۔ جو کہیں گے وہ اس پر یقین کریں گے ہم کہہ دیں گے آپریشن کے بعد مریض کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی اس کے لنگو نے کسی وجہ سے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی بھی کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے اسی لیے ہم نے اسے وٹنی لیٹر پر رکھا ہے۔“ ڈاکٹر بلال نے کہا پھر کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولے۔ ”اب آپ لوگوں کو طے کرنا ہے کہ میرا ساتھ دیں گے یا میرے خلاف ہوں گے۔

اگر میرے خلاف ہوں گے تو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ڈگریاں اور صلاحیتیں کچھ کام نہیں آئیں گی آپ سب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اس ملک میں تو کام نہیں آئیں گی..... اب آپ سب جاسکتے ہیں۔“

وہ سب پر تاسف نظروں سے بلال کو دیکھ رہے تھے مگر کسی نے کچھ نہیں کہا اور سب چاہنے کے لیے دروازے کی سمت بڑھ کر اچھی ان کے ساتھ تھی۔

”ایک منٹ حرا تم رکو۔“ بلال نے کہا اس کے بڑھتے

ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے بلال کو دیکھا۔
 ”ساجد کی فیملی کو تم انفارم کر دو گی۔“ بلال نے کہا۔
 ”میں..... میں“ حرا نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں..... تم..... جیسے میں نے کہا ہے وہی کرنا ہے۔“ حرا نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔
 وہ لاؤنچ میں پہنچی تو فائزہ اسے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آئی اور امید بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”ایک مسئلہ ہو گیا ہے فائزہ؟“
 ”کیا؟“

”وہ..... آپ کے شوہر ساجد..... آپریشن کے بعد انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی..... ان کے لنگو نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے ایسا ہوتا نہیں ہے مگر ہزاروں میں سے کوئی ایک ایسا کیس ہوتا ہے وہ کوڑے میں چلے گئے ہیں ہم نے انہیں وٹنی لیٹر پر رکھ دیا ہے اور دوائیاں بھی شروع کر دی ہیں اب ہم انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر رہے ہیں۔“ وہ ہکا بکا اس کا چہرہ تک رہی تھی حرا نے بات جاری رکھی۔
 ”ایسے کیسز میں ایک دو دن میں پشٹ کو سے باہر آ جاتے ہیں پلیر آپ پریشان نہیں ہوں اب وہ ہماری ذمہ داری ہیں۔ ہم انہیں بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“ فائزہ اس کی بات سننے سے پہلے ہی چکرا کر وہیں گر گئی تھی اسے طبی امداد دی جا رہی تھی۔
 وہ جیسے جیسے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کافی دیر وہ تہا وہاں بیٹھی رہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کب سمیر وہاں آیا تھا حرا کو بتا نہیں چلا تھا۔
 ”آپریشن کیسا رہا؟ ساجد ٹھیک ہے نا تم ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“ سمیر نے اس کے قریب آ کر کہا۔
 ”اس کی کنڈیشن ٹھیک نہیں وٹنی لیٹر پر ہے۔“ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔
 ”کیا.....؟ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔
 ساجد کی حالت دیکھ کر سمیر گم صم ہو گیا تھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیا ایک ہنسا کھیتا نوجوان موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ حرا کے پاس آیا تھا۔

جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو اور کس سے کہہ رہے ہو ایک مشہور معروف سرجن پر الزام لگائے ہو اگر میں نے یہ سیریس لے لیا تو تم کہیں پریکٹس نہیں کر پاؤ گے اور یہ میں بڑی ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔“

”آپ مجھے کیا پریکٹس نہیں کرنے دے گے میں خود استعفیٰ دے رہا ہوں۔“ اس نے اپنا استعفیٰ اس کی ٹیبل پر رکھا۔

بلال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔

”بے وقوفی اور بہادری کا ایک نایاب نمونہ ہو تم۔“

”شاید..... مگر یہ مفرور اور بے پروا ہونے سے بہتر ہے۔“ سمیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”کسی دوسرے پر الزام لگانا بہت آسان ہے سمیر..... تم بھول گئے کہ ایک انجکشن لگاتے وقت تمہارے ہاتھ کانپ گئے تھے اس وقت میں نہ ہوتا تو خورشید خان اوپر پہنچ چکا ہوتا۔“

”مجھے یاد ہے سر..... اس دن آپ نے اس کی جان بچائی تھی مگر اس دن کے بعد آپ نے مجھے آپریشن ٹیمیر میں آنے نہیں دیا تھا۔ اب باری آپ کی ہے۔“ سمیر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تو تم کیا چاہتے ہو میں خود کو اور اس اسپتال کو تم پر نچوڑ کر دوں۔“ انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب جو کرنا ہے وہ میں کروں گا۔“ سمیر نے کہا۔

”تم ہو کیا چیز..... تم کچھ نہیں کر پاؤ گے..... تم مجھ سے واقف نہیں ہو میں تمہارا کیریئر ختم کر دوں گا۔“ وہ صے سے بے قابو ہو گیا تھا۔

”میرا کیریئر تو ابھی شروع نہیں ہوا آپ ختم کیا کریں گے میرے پاس داؤ پر لگانے کے لیے کچھ نہیں اور آپ کے پاس بہت کچھ ہے۔“ اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

نرس ماریا نے سمیر کو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ جلد ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے ڈاکٹر بلال کے سامنے کھل کر یہ سب کہا تھا لیکن حرا سے وہ بڑا ایسا ہوا تھا اس نے اسے حقیقت نہیں بتائی تھی۔

اس دن حرا کے والد نے سمیر کو کھانے پر بلایا تھا اور مستقبل کے حوالے سے اس سے کئی باتیں کی تھیں حرا سے

”بتاؤ حرا۔“ ٹی میں کیا ہوا تھا ساجد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ اس نے معمولی آبریش میں کوئی مرتاب نہیں ہے۔“

”جو ہوا تھا میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“ حرا نے کہا۔

”میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ دنیا سے تم لوگ کیا جھوٹ بول رہے ہو وہاں حقیقت میں کیا ہوا تھا یہ بتاؤ۔ یہ نہ بھولو کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔“

”بار بار پوچھنے سے میرا جواب بدل نہیں جائے گا۔“

”سچ بتاؤ مجھے۔“ سمیر نے سخت لہجے میں کہا۔

”سمیر پلیز یہ تمہاری پرابلم نہیں ہے۔“

”یہ میری پرابلم ہے۔“ اس نے زور دے کر کہا ”میں نے اس سے پراس کیا تھا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا اور اس وقت وہ دہشتی لیٹر برپا ہوا ہے اور تم کہہ رہی ہو یہ میری پرابلم نہیں ہے۔ تم کسے بچا رہی ہو؟“

”میں کسی کو نہیں بچا رہی..... چلے جاؤ یہاں سے۔“

جاؤ۔“ وہ ہدایاتی انداز میں چیخی اور رونے لگی۔

”ہم لوگوں کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر بنے ہیں اسپتال کا دھندہ چلانے کے لیے نہیں ہمارا کام لوگوں کی تکالیف دور کرنا ہے ان کی تکالیف کی وجہ بنتا نہیں ہے۔“

سمیر تیز آواز میں بولا۔

تین دن گزر گئے تھے ساجد کی حالت غیر تھی اس کی جان بچانے کی ان ٹیم کو کششیں ہو رہی تھیں لیکن بے سود بالآخر اس کی دھڑکنیں ختم ہو گئیں اور وہ مر گیا۔ فاتزہ ٹرپ ٹرپ کر رہی تھی اور پایا کی تو جیسے کر ٹوٹی تھی ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ساجد کی لاش لے کر چلے گئے تھے۔

سمیر وہاں سے سیدھا ڈاکٹر بلال کے روم میں آیا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ڈاکٹر بلال نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”سر آپ سے بات کرنی ہے۔“

”کس کے بارے میں؟“

”ساجد احمد کے بارے میں۔“ سمیر نے کہا۔

”کس؟“

”غلطی سب سے ہوتی ہے اگر وہ غلطی چھپائی جائے اور کسی کی جان چلی جائے تو یہ مر ڈر ہے۔“

”کون سی غلطی..... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”سر آپ جانتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

جب تنہائی میں اس کی بات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ ”ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں میں نے ابو کو اپنی پسند بتادی ہے۔ اسی لیے آج انہوں نے تمہیں بلایا ہے وہ تمہارے کیریئر کے حوالے سے فکرمند ہیں۔“

”ہم یہاں اپنے آنے والے کل کا بلان بنا رہے ہیں اور وہاں ایک فیملی مامم منار ہی ہے۔“ سمیر نے اداس لہجے میں کہا۔

”تمہیں بتاؤ ہم کیا کریں..... جینا چھوڑ دیں..... مامم منائیں ہم بھی۔“

”وہ مرنائیں اسے مارا گیا ہے مرڈر کیا ہے تم لوگوں نے ایک خوش باش جیتے جاگتے انسان کا.....“ سمیر چنچا۔

”یہ سچ نہیں ہے۔“ حرا آہستہ آواز میں بولی۔

”آج میں سوچ رہا ہوں..... کیا تم وہی حرا ہو..... جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی..... تم تو بالکل بلال جیسی ہو گئی ہو جو دوسروں کی قبروں پر اپنے محل بناتے ہیں۔“

”سمیر..... پلیز۔“ حرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی وہ اس کے سمیر پر کاروبار کر رہا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی وہ روئی رہی پھر کافی دیر بعد بولی۔

”سمیرے پاس کوئی اور چوٹس نہیں تھی۔“ وہ پر سوچ انداز میں بولی۔

”چوٹس کل نہیں تھی حرا آج ہے۔“

”تم یہ سوچ سکتے ہو میں ڈاکٹر بلال ان کے اسپتال اور پورے میڈیکل فیکلٹی سے دشمنی مول لے لوں وہ بھی اس شخص کے لیے جو زندہ بھی نہیں ہے یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو برباد ہو جائیں گے۔ ہم دونوں ہمارے خواب ہمارا فوچر سب کچھ برباد ہو جائے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ سمیر نے اسے تسلی دی۔

”سمیر پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ..... تمہاری فیملی نے قرض لے کر تمہیں میڈیکل کی تعلیم دلوائی ہے ان کی بے شمار امیدیں تم سے وابستہ ہیں..... پلیز سمجھو..... ہماری دنیا موت اور زندگی کی دنیا ہے..... جہاں ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔“

”میں چاہتا ہوں ایسا کوئی حادثہ آئندہ نہ ہو۔ یہ فیصلہ آج ہی کر لو میرا ساتھ دو گی یا.....“

”فیصلہ کس کے خلاف.....؟ خود اپنے خلاف

کروں..... سمیر اس آپریشن میں میں بھی تھی..... اس حادثے کی گواہ ہوں میں اس کا حصہ ہوں میں..... کیونکہ سچ کو میں نے بھی چھپایا ہے اور اگر یہ بات کھلی ناکو کارروائی میرے خلاف بھی ہوگی کورٹ جانا پڑے گا جیل بھی ہو سکتی ہے۔“

”سچ بولنے سے کوئی نقصان ہوتے تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بہر حال میں جا رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ تم سچ کا ساتھ دو گی میں ساجد کی فیملی کو حقیقت بتانے جا رہا ہوں اور ان کے ساتھ مل کر ڈاکٹر بلال کے خلاف کیس کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر بلال اور اس کے اسپتال کے خلاف کیس فائل ہو گیا تھا اور عدالت نے مجرموں کو طلب کر لیا تھا۔ دونوں طرف کے وکیل زور و شور سے دلائل دے رہے تھے گواہ طلب کیے جا رہے تھے اسپتال کا ریکارڈ کھنگالا جا رہا تھا..... تمام گواہوں نے ڈاکٹر بلال کے حق میں گواہی دی تھی نرس ماریا کو بھی ڈاکٹر بلال نے لالچ دے کر اپنے حق میں کر لیا تھا۔

اس دن ڈاکٹر بلال کا وکیل دلائل دے رہا تھا۔

”ڈاکٹر کو برا بھلا کہنا اسپتال کو بدنام کرنا اور انہیں بلیک میل کرنا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ انہیں اپنی ریپوٹیشن کی قدر ہوتی ہے وہ اپنے مخالفین کے لیے ایک آسان ہدف ہوتے ہیں۔ یہ سیدھا سیدھا بلیک میلنگ کا کیس ہے..... ڈاکٹر بلال جیسے ماہر مشہور اور نیک نام ڈاکٹر کو براہ راست کہا جا رہا ہے جنہوں نے اب تک کئی قیمتی جانوں کو بچایا ہے جو اس ملک کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ مخالف وکیل عدالت کے روبرو دلائل اور گواہ پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اس لیے میری عدالت سے درخواست ہے کہ یہ کیس خارج کیا جائے کیونکہ ڈاکٹر بلال جیسے معروف ڈاکٹر کو ان کے فرائض سے روکنا ایک ناقابل معافی عمل ہوگا۔“

سمیر کو ہر راستہ بند نظر آ رہا تھا آخری کوشش کے طور پر اس نے حرا سے رابطہ کیا تھا اس دن کے بعد سے اس کی حرا سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے تھے وہ گواہ کے طور پر حرا کو پیش کرنا چاہتا تھا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو سمیر؟“ حرا نے دکی لہجے میں

”غلطی میں نے نہیں..... ہم سب نے کی تھی ساجد احمد کے ساتھ۔“
 ”میں نے زندگی میں صرف ایک غلطی کی اس پر اتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔“
 ”غلطی کی ہے تو اسے تسلیم کیوں نہیں کر لیتے سر۔“ حرا نے کہا۔

کہا تھا وہ دونوں اس وقت کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔
 ”اسپتال کا اسٹاف ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ حرا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”جانتا ہوں..... بس دو منٹ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں بولو۔۔۔۔۔ مگر ایک بات یاد رکھنا ڈاکٹر بلال ابو کے دوست ہیں میں ان کے خلاف.....“
 ”پلیز حرا..... میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں..... تم اپنے ضمیر کے خلاف نہیں جاسکتیں۔“
 ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔
 ”تم جانتی ہو کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت اور گواہ نہیں کہ ہم یہ کیس جیت سکیں..... اس وقت صرف تم ہماری مدد کر سکتی ہو۔“
 ”سیر..... میں.....“

”کل عدالت میں تمہیں گواہی کے لیے طلب کیا جائے گا..... سچ کہہ دو حرا اس دن آپریشن تھیر میں تم نے جو کچھ دیکھا اور مناسب عدالت میں بتا دو..... تم اس کی گناہ کی گواہ پچی ہو اور میری آخری امید بھی..... میں اب چلتا ہوں حرا یہ ہمارے لیے آخری موقع ہے جرم کو روکنے کا اور مجرم کو سزا دلوانے کا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ حرا کم صدم کی کافی دیر وہاں بیٹھی رہی..... شام تک اس کے اندر حیر و شرم کی جنگ ہوئی رہی۔

”ٹھیک ہے..... اگر آپ خود کو طاقتور مانتے ہیں تو شوق سے مانیں مگر میں تو ایک کمزور انسان ہوں جو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔
 حرا نے بڑی ہوشیاری سے اس تمام واقعے کی ویڈیو اپنے موبائل میں ریکارڈ کر لی تھی جو اگلے دن عدالت میں اس کی گواہی کے موقع پر پیش کر دی گئی تھی یہ ویڈیو میڈیا کے افراد کے ہاتھ بھی لگ گئی تھی۔ جو ملک کے طول و عرض میں ہر چینل اور سوشل میڈیا پر دکھائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر بلال کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس پر بھاری جرمانہ اور کئی سال قید کی سزا ہوئی تھی جبکہ اس کے اسپتال کو بھاری ہرجانہ ساجد احمد کی نیکی کو ادا کرنا پڑا تھا۔

”کل عدالت میں تمہیں گواہی کے لیے طلب کیا جائے گا..... سچ کہہ دو حرا اس دن آپریشن تھیر میں تم نے جو کچھ دیکھا اور مناسب عدالت میں بتا دو..... تم اس کی گناہ کی گواہ پچی ہو اور میری آخری امید بھی..... میں اب چلتا ہوں حرا یہ ہمارے لیے آخری موقع ہے جرم کو روکنے کا اور مجرم کو سزا دلوانے کا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ حرا کم صدم کی کافی دیر وہاں بیٹھی رہی..... شام تک اس کے اندر حیر و شرم کی جنگ ہوئی رہی۔



شام کے پانچ بج رہے تھے جب حرا ڈاکٹر بلال کے روم میں گئی تھی۔ موبائل فون اور ایک لفافہ اس نے ہاتھ میں تھا، ہوا تھا لفافہ اس نے بلال کی طرف بڑھایا۔
 ”یہ کیا ہے؟“ بلال نے کہا۔
 ”میرا استغاثی۔“ حرا بولی۔

”کیا.....؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”لیکن تم جاب کیوں چھوڑ رہی ہو؟“

”میں نے اپنے پروفیشن سے غداری کی ہے میں اپنے ضمیر پر مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔“ حرا نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”بوجھ..... کیسا بوجھ؟ کیا گناہ کیا ہے تم نے..... کیا غلط کیا ہے؟“ حرا نے اچنبھے سے کہا۔

عکس ذات

— محمد عرفان راے

محمد عرفان راے کا شمار نئی نسل کے معتبر لکھاریوں میں ہوتا ہے وہ نہ صرف اپنے قارئین کی دلچسپی اور مطالعے کے لیے خوب صورت کہانیاں تراشتے ہیں بلکہ لاہور کے ایک معروف جریدے کے لیے معیاری تحریروں کا انتخاب بھی کرتے ہیں نئے افق کی یہ خوش نصیبی ہے کہ وہ ان کی خوب صورت اور بامعنی تحریروں سے اپنے صفحات کو سجاتا ہے۔

زیر نظر ناول کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہیں گے سوائے اس کے کہ انہوں نے یہ ناول لکھ کر اپنے نام کی لاج رکھی ہے



اس کی بات سننے لگا:

”میں تاریخ اور آمار قدیر کا طالب علم ہوں اور بہت دور سے آپ کے ہوٹل تک پہنچا ہوں۔ مجھے ایک ایسے گائیڈ کی ضرورت ہے جو صحرا میں کافی اندر سنگ سیاہ کے کنڈرات تک میری رہنمائی کر سکے۔ میں ان ہزاروں سال پرانے کنڈرات پر اپنا تحقیقی کام مکمل کرنا چاہتا ہوں۔“

سنگ سیاہ کا نام سننے ہی ہوٹل کے مالک نے چونک کر تابش کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ وہاں پہنچنا آسان نہیں۔ صحرا بہت ظالم چیز کا نام ہے یہ انسان کی عقلی کو معاف نہیں کرتا۔ اب تک بے شمار لوگ ریت کے اس خاموش سمندر میں غرق ہو چکے ہیں۔“

”آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں۔ وہ کنڈرات دیکھنا میری تحقیق کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کام سے بے شمار لوگ مستفید ہوں گے۔“ تابش نے اس کی ہمدردی کو نظر انداز کر دیا۔

”ٹھیک ہے..... جیسے آپ کی مرضی..... اگر آپ اس مہم کے لیے بلند ہیں تو میں اعتراض کیسے کر سکتا ہوں..... بہر حال اتنا بتا دوں کہ یہ جگہ بہت دور ہے۔ اس مقام تک کوئی عام گائیڈ نہیں جائے گا..... سچ تو یہ ہے کہ کوئی سیاح یا گائیڈ وہاں تک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن کوئی حل تو ہو گا اس مسئلے کا..... میں منہ مانگی اجرت دوں گا..... اور آپ کو انعام بھی۔“

تابش نے لفظ انعام پر خاص زور دیا تو ہوٹل کے مالک کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی۔ وہ سوچنے کی ادا کاری کرتے ہوئے بولا:

”اگر آپ دو تین روز انتظار کر سکیں تو میں آپ کو ایک قابل بھروسہ گائیڈ دے سکتا ہوں۔ وہ صحرا کا بھیدی ہے..... اُمید ہے مناسب معاوضہ لے کر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

”اگر اس نے بھی انکار کر دیا تو.....؟“ تابش نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تو پھر آپ کو اس مہم کا خیال ذہن سے نکالنا

اس سرحدی قصبے میں صرف ایک ہوٹل تھا جہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کی بھر مار رات گئی۔ بس کے تھکا دینے والے سفر کے بعد تابش نے انگڑائی لیتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ قصبے کی آبادی کافی مختصر تھی البتہ یہاں تمام بنیادی سہولیات میسر تھیں۔ اس مقام کی اصل رونق ان سیاحوں کی وجہ سے تھی جو یہاں اس عظیم صحرا کو دیکھنے آتے تھے جس کے پار پہنچنے کی ہمت بہت کم لوگ کر پاتے تھے۔

بس سے اترتے ہی تابش نے ہوٹل کا رخ کر لیا جس کی پرانی عمارت دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ جلد ہی وہ ہوٹل کی عمارت کے اندر موجود تھا۔ استقبال لڑکی سے مختصر مکالمہ کرنے کے بعد وہ ایک آرام دہ کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اپنا سامان کمرے میں رکھنے کے بعد تابش نے منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں جا پہنچا۔ سورج ڈھلے ہی ہوٹل کی رونق مٹی مٹا بڑھ گئی تھی۔ بہت سے مقامی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ بلند آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ جوان لڑکیاں ہال میں ساتی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ حیثیاتیں ہوٹل میں قیام کرنے والوں کی خاطر تواضع کے لیے ملازم رکھی گئی تھیں۔

تابش اس قسم کے ماحول کا عادی نہیں تھا۔ اس نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا اور اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔ اسے اپنے صحرائی سفر کے لیے ایسا قابل بھروسہ گائیڈ حاصل کرنا تھا جو اسے منزل تک پہنچا سکے۔

کھانے کے بعد تابش نے ویٹر کو پتہ دیتے ہوئے ہوٹل کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ ویٹر نے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُسے شور شرابے سے دور چھوٹی سی راہداری میں لے گیا اور پھر ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے واپس چلا گیا۔

ویٹر کے جاتے ہی تابش نے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ہوٹل کا اڈمیرل عمر مختار مالک حساب کتاب کا رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے نظری عینک ناک کے کونے پر نکالی ہوئی تھی۔ مالک نے خوشدلی سے تابش کا استقبال کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عینک اُتار کر توجہ سے

بڑے گا.... کیونکہ میں اس علاقے میں کسی دوسرے گاؤں کو نہیں جانتا جو آپ کو وہاں تک پہنچا سکے۔“
 ”کون ہے وہ شخص جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں؟“
 ”فیروز نام ہے اس کا.... کبھی وہ ایک بدنام صحرائی ڈاکو تھا۔ آج کل اسمگلنگ کر رہا ہے۔ کسی مشن پر گیا ہوا ہے، دو تین دن میں واپس آ جائے گا۔“
 ”کیا کہا.... ڈاکو! اسمگلر.... یہ کس قسم کا گائیڈ مہیا کر رہے ہیں آپ؟“ تابش حیرت سے اچھلا۔
 ”گھبراہٹ میں نہیں.... فیروز سے بہتر ہم سفر کوئی نہیں ملے گا آپ کو۔“

”میں کسی لیرے کے ساتھ نہیں جاؤں گا کوئی شریف اور اچھے کردار والا گائیڈ نہیں ہے آپ کے پاس؟“
 ”اس دنیا میں صرف وہی لوگ شریف کہلاتے ہیں جن کے کردار کے بارے ہم نہیں جانتے۔ ورنہ جس کے ماضی میں جھانکا جائے سوائے گناہوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا.... تجربے کی بات بتا رہا ہوں غور سے سنیں! گائیڈ جس قدر بد معاش ہوتا تھا ہی قابل اعتماد ہوتا ہے۔ یہ لوگ جس کام کی آہرت لیتے ہیں اس میں دھوکا نہیں دیتے۔ آپ انہیں رہنمائی کی آہرت دیں گے تو وہ آپ کو منزل تک پہنچا دیں گے اور اگر ان سے رزنی کروانا چاہیں گے تو وہ معاوضے کے بدلے یہ کام بھی سرانجام دینے کی ہامی بھر لیں گے۔ فیروز بہت اصول پسند ہے۔ وہ ڈاکو اور اسمگلری نہیں بہادر بھی ہے۔ وہ آپ کو صرف راستہ نہیں بتائے گا بلکہ صحرائی رزنیوں سے بھی بچائے گا۔ اس پیشے کے لوگ ایک دوسرے کے سیاہوں کو لٹختے نہیں، بلکہ مدد کرتے ہیں۔ یہ صحرائے کوئوں کھدروں سے واقف ہوتے ہیں۔ فیروز کی زبانیں بول سکتا ہے۔ آپ جس طرف جانا چاہتے ہیں وہ علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ فیروز سے اچھا گائیڈ آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ میں ہر طرح اس کی ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔“

ہوٹل کے مالک کی باتوں میں وزن تھا۔ چنانچہ تابش نے فیروز کے کردار کو نظر انداز کر دیا اور ہوٹل کے مالک کو خوش کرنے کے لیے کچھ رقم ایڈوانس دے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے فیروز کی آمد تک اسی ہوٹل میں رکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہوٹل میں قیام کے دوران پہلی رات ہی تابش نے دیکھ لیا تھا کہ وہ لڑکیاں جو دن بھر مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی تھیں، سورج ڈھلنے ہی جسم فروش بن جاتی تھیں۔ ان لڑکیوں کو مختلف علاقوں سے خرید کر یا اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ اکثر سیاح یہاں صرف ان عورتوں کی وجہ سے آتے تھے۔ ہر رات عورتیں یہاں سامان کی طرح فروخت ہوتی تھیں۔ تابش عمر بھر ان جسم فروش عورتوں سے دور رہا تھا لیکن اب نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے درمیان وقت گزار رہا تھا۔ یہ طوائفیں دن رات ہوٹل میں دندناتی پھرتی تھیں۔ تابش کو ان کے وجود سے کھن آتی تھی۔ وہ ان کے جسموں اور گناہوں کی بسانہ محسوس کر کے جھرجھری لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ہوٹل میں اس کی دوسری رات بھی کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی:
 ”کون ہے....؟“

تابش نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ ابھی بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ دستک دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ اٹھ کر آگے بڑھا اور دروازہ کھول دیا....

سامنے ایک خوب صورت اور جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر بیس ایس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لڑکی اتنی شوخ تھی کہ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ تابش بڑبڑا سا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ آفت حینہ یہاں کیوں آئی تھی۔ لڑکی کا ایک ایک دعوت گناہ دے رہا تھا۔ اس نے تابش کو بت کی مانند کھڑے دیکھا تو مسکرا کر بولی:
 ”گلتا ہے میں اس قابل نہیں کہ آپ مجھے نظر بھر کر دیکھیں....“ اس نے توبہ شکن انگڑائی لے کر اپنے ہر پوشیدہ راز سے پردہ اٹھا دیا۔

اس کی بے باکی دیکھ کر تابش کا خون کھول اٹھا۔ اس نے نفرت سے دروازہ بند کرنے کا فیصلہ کیا لیکن لڑکی اس کی اجازت کے بغیر ہی ادا سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور بستر کی سفید چادر پر ڈھیر ہو گئی۔

تابش ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نفرت اور غصے کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ تابش کے والد نے اسے کسی سے نفرت کرنے کی

تربیت نہیں دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ گناہ گار سے نفرت کر کے آپ اُسے مزید گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کی توجہ اور رہنمائی چاہتے ہیں۔ انھیں جینے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ باپ کی تربیت نے تابش کو سہرا پا محبت بنا دیا تھا بلکہ اس کی تودنیا ہی انسانیت سے محبت کی بنیاد پر کھڑی تھی۔

خود کو بر سکون رکھنے کے لیے تابش نے گہری سانس لی تو عطر کی بھنی بھنی خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو محط کر دیا جو یقیناً لڑکی کے بھڑکیلے لباس سے اُٹھ رہی تھی۔ وہ آرام دہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور دلچسپی سے تابش کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لڑکی کی باتوں اور اداؤں میں بے حیائی تھی۔ اس کا انداز بالکل کاروباری تھا:

”میرا نام یوسما ہے اور آپ کو کل سے دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔ آج ہول کے مالک نے بتایا کہ آپ بہت تباہ ہیں تو مجھے فکر لاحق ہوئی، چنانچہ سیدھی آپ کے پاس چلی آئی۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔“ تابش نے لڑکھاتی زبان سے کہا اور قریب پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”شاید آپ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔۔۔۔۔ اس گھبراہٹ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔“ یوسما نے کروٹ بدل کر منہ اس کی جانب کر لیا۔

”مجھے یہ سب پسند نہیں۔۔۔۔۔ یہ سب غلط ہے، دھوکا ہے، فریب ہے۔۔۔۔۔“ تابش نے دو ٹوک جواب دیا۔

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن کسی بھی دوسرے کاروبار کی طرح یہ کام بھی کچھ لو، کچھ دو کی بنیاد پر ایک تجارتی معاہدہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم سے لوگ کوئی چیز نہیں بلکہ مخصوص وقت کے لیے جسم خریدتے ہیں۔۔۔۔۔ اور بدلے میں معاوضہ ادا کر دیتے ہیں۔“ یوسما نے کندھے اُچکائے۔

”میں عورت کے جسم کا خریدار نہیں ہوں۔“ تابش نے کہا۔

”تو آپ کیا خریدنا چاہتے ہیں؟“ وہ طنز پر لبھ کر بولی۔

”میں روجوں کا دیوانہ ہوں۔۔۔۔۔ دے سکو تو مجھے اپنی

روح دے دو۔۔۔۔۔ میں اس کے عوض تمہیں اچھا معاوضہ ادا کر سکتا ہوں۔“

تابش کی بات سن کر یوسما نے اسے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر ہستے ہوئے بستر پر دوہری ہوئی:

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ روح دے کر بھی پیسے کمائے جاسکتے ہیں تو میں جسم اور روح الگ الگ بیچنا شروع کر دیتی۔“

”میری پیش کش پر غور کرو۔۔۔۔۔ اگر میری بات سمجھ نہیں سکی ہو تو بتاؤ کہ تم رات بھر کے لیے اپنے جسم کی کتنی قیمت وصول کرتی ہو۔“

”میں نے کبھی خود رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ اس کے باوجود میرے دیوانے اور قدر دان کبھی مایوس نہیں کرتے۔“

یہ سن کر تابش نے جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کے قریب بستر پر رکھ دیے۔ رقم شاید یوسما کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور جلدی سے نوٹ سمیٹ کر کٹھنی میں دبالیے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ سودا طے پا گیا۔ اب بتائیں کیا چاہتے ہیں آپ۔“ اس نے تابش کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔۔۔۔۔ اور تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”میری ماں۔۔۔۔۔“ یوسما زیر لب بڑبڑائی اور لمحہ بھر میں اس کی شوخ آنکھیں ویران کھنڈ بن گئیں۔ اس کی نظریں کمرے کی دیواروں پر پھٹکنے لگیں اور ہونٹوں پر ارتعاش سا تھا، جیسے جسم نہیں اس کی روح میں ماں کا لفظ بازگشت بن کر گونج رہا ہو۔

تابش بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے محض گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یوسما ماں کا لفظ سن کر یوں بجھ جائے گی۔

”مدت ہوئی میں اپنی ماں سے نہیں ملی۔“ یوسما کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

میں پہنچے ہی سب کا رویہ اور کردار ایک جیسا ہو جاتا تھا۔ ایسے لوگوں سے بھی اس کا واسطہ پڑ جاتا تھا جن کی وہ زبان نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن وہ ان کی خواہشات کو ضرور سمجھ جاتی تھی۔ ایک طوائف کی حیثیت سے یوہا اس حقیقت کو سمجھ چکی تھی کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جائیں گناہ کی زبان ایک ہی رہتی ہے۔۔۔ لیکن تابش میں اس نے درندگی کے بجائے وہ محبت دیکھی تھی جس کے لیے وہ ترس گئی تھی۔

”تم نے بتایا نہیں کہ اس ہوٹل میں تمہیں کون لایا تھا؟“ تابش نے اپنا سوال دہرایا تو یوہا ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آئی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی:

”مجھے یاد نہیں کہ میں کون ہوں اور کہاں پیدا ہوئی۔ بس اتنا یاد ہے کہ میرے والدین بہت غریب تھے۔ میرا

باپ ایک چرواہا تھا۔ ہم بھی کسی ایک جگہ مستقل نہیں رہتے تھے۔ ایک خیمہ اور ضرورت کی چند ضروری اشیاء ہی ہماری

کل کائنات تھیں۔ پھر ایک روز میرے باپ کی موت ہو گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماں نے گاؤں کے چند لوگوں

کے ساتھ مل کر میرے باپ کی لاش کو ایک گھنے درخت کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ باپ کے مرتے ہی ہمارے برے دن

شروع ہو گئے۔ ماں خود بھی بیمار پڑ گئی۔ لہذا ہم نے ریوڑ کی بکریاں بیچنا شروع کر دیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ

ہمارے پاس کوئی چالوند بچا۔ میں اور میری ماں گاؤں گاؤں چمکنے لگے۔ اگر کوئی چالوند مل جاتی تو ہم دونوں مل

کر کام کر لیتیں ورنہ بھیک مانگی پڑتی تھی۔ مجھے اپنی ماں کا بیمار اچھی طرح یاد ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

بیماری نے اس کو ادھ موا کر دیا تھا۔ میں تھوڑی بڑی ہوئی تو احساس ہوا کہ خدا نے مجھے اس حسن سے نوازا ہے جسے دیکھ

کر لوگ پلٹیں جھپکنا بھول جاتے ہیں۔ سچ کہوں تو یہی حسن میرا سب سے بڑا ذمہ تھا جس نے مجھے برباد کر

دیا۔۔۔ ایک روز میری ماں کے پاس دو گھڑسوار ملے آئے۔ انھوں نے تنہائی میں ماں سے کچھ بات چیت کی اور

خاموشی سے واپس چلے گئے۔ تین دن بعد وہ دونوں واپس آئے تو ان نے مجھے ان دونوں کے حوالے کر دیا اور کہا کہ یہ میرے دور کے رشتہ دار ہیں۔ یہ تمہیں شہر میں رکھیں گے اور بہترین پرورش کریں گے۔ ان کے ہاں تم بہتر زندگی

”کیا وہ یاد آتی ہے؟“ تابش نے پوچھا۔
”نہیں۔۔۔ کبھی یاد نہیں آئی تھی۔ آج آپ نے ذکر کیا تو یہ احساس جاگ اٹھا ہے کہ ماں کے بغیر انسان کی زندگی کتنی بے رونق ہوتی ہے۔“ وہ خالی نظروں سے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔
”میں نے بھی اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔ اسی لیے تم سے ماں کے متعلق پوچھا ہے۔“ تابش نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

”جو محبت ماں دے سکتی ہے۔ وہ دنیا کا کوئی اور انسان نہیں دے سکتا۔“ یوہا نے کہا۔ ”میرے پاس حسن ہے، جوانی ہے، دلکش جسم ہے، اتنے پیسے بھی ہیں کہ میں کسی کی محتاج نہیں۔۔۔ لیکن وہ محبت نہیں ہے جو صرف ماں دے سکتی تھی۔“

”درست کہتی ہو تم۔ محبت جسم سے نہیں روح سے

کی جاتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے تم سے روح مانگی ہے۔۔۔ تاکہ تمہارے اندر کے دکھ کو سمجھ سکوں، تمہیں سچی محبت کا

منسوب سمجھا سکوں۔“ تابش نے چند لمبے وقف اختیار کیا اور بولا ”تم اس ہوٹل تک کس طرح پہنچی ہو۔ کون لایا تھا تمہیں یہاں؟“

یوہا نے پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹوٹوں اور پھر تابش کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا جس کا رویہ ہر

اس شخص سے مختلف تھا جس کے ساتھ اس نے رات گزاری تھی۔

”یہ رقم اب تمہاری ہے۔۔۔ اور بے فکر ہو میں ایک انسان ہوں ورنہ نہیں۔ مجھے تمہارے جسم میں کوئی دلچسپی

نہیں۔ بلکہ سچ کہوں تو تمہارا خوب صورت جسم ہی تمہارا دشمن ہے جس نے تمہیں طوائف بنا دیا۔۔۔ البتہ یہ روح آج

بھی تمہاری ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اسی لیے تو مجھے تمہارے جسم سے نہیں

روح سے دلچسپی ہے۔“

یوہا حیرت سے بت بنی تابش کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ انسان نہیں کوئی غیبی مخلوق ہو۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اسے اپنی مختصر سی زندگی میں بھانت بھانت کے لوگ ملے تھے جن کی زبانیں، طور طریقے اور لباس تک مختلف تھے۔ لیکن اس کے پاس تنہائی

یوساہی رقم جان بوجھ کر چھوڑ گئی تھی... اگر اس کا خیال درست تھا تو یقیناً یہ اس کی زندگی میں ایک نئے دور کی شروعات تھیں... یہی سوچتے ہوئے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تابش کے والد ڈاکٹر دلاور ماہر آثار قدیمہ تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہزاروں سال قدم تہذیبوں کے مدفون خزانوں کی تلاش میں گزرا تھا۔ تقریباً پانچ سال قبل وہ ایسے ہی ایک خزانے کی تلاش میں مصر کے صحرائیں آئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ روایتی سے قبل انھوں نے اپنے بیٹے تابش کو یہ وصیت کی تھی کہ اگر تم سمجھو کہ مجھے بہت عرصہ گزر گیا ہے تو تمہارا فرض ہوگا کہ میرے نقش قدم پر چلو اور یہ خزانہ نکال لانے کے لیے صحرائے عظیم میں آ جاؤ۔ میں نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس مدفون خزانے میں سونا، ہیرے اور جواہرات ہیں۔ اگر تم اس کشفہ خزانے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤ تو خدا کی راہ میں خرچ کر دینا۔ یہ خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ خلق خدا پر خرچ کرنے کے بعد بھی تمہارے پاس بہت کچھ بچ جائے گا۔

جب تابش کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے والد زندہ نہیں رہے تو وہ بھی اپنے والد کا ادھورا مشن مکمل کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی وصیت میں ڈاکٹر دلاور نے لکھا تھا کہ میں تم سے امید رکھوں گا زیادہ خزانہ دیکھ کر تمہارا دل ہلک نہیں جائے گا۔ میں نے تمہاری تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے تمہارے دل سے دنیا کی رنگینی اور بیکار خواہشات نکالنے میں بیس سال صرف کیے ہیں اور تمہارے دل میں خدا کی محبت پیدا کی ہے۔ میں نے تمہارے ذہن کو پاک صاف رکھا ہے تاکہ جھکتے ہیرے اور جواہرات دیکھ کر تمہارے اندر عیش و عشرت کا خیال پیدا نہ ہو۔ اس خزانے کی تلاش تمہارا دین فرض ہے تاکہ یہ کسی دنیا دار کے ہاتھ نہ لگ جائے۔

ڈاکٹر دلاور کو رخصت ہوئے پانچ سال گزر گئے تو تابش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اب باپ کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی چنانچہ اس نے وہ نقشہ اور چند ایک بوسیدہ کاغذات جو ڈاکٹر دلاور وصیت کے ساتھ چھوڑ گئے تھے الماری سے نکالے اور ان کا جائزہ لینے بیٹھ گیا۔ نقشہ

میں بہت سے اشارے واضح نہیں تھے۔ ان کی زبان اور اصطلاحیں خفیہ تھیں۔ ڈاکٹر دلاور نے ایک مدت صرف کر کے ان اشاروں کا مجید پایا تھا اور ان کی زبانی بھی سمجھ لی تھی۔ ان اشاروں سے انھوں نے ایک واضح نقشہ بنالیا تھا جس کے مطابق خزانہ صحرا کے ایک خطرناک حصے میں تھا۔ صدیوں پہلے کسی بادشاہ نے یہ خزانہ صحرائیں چھپا دیا تھا۔ وہاں تک نقشے کے جو راستہ بتایا تھا اونٹ اور چمڑے کے سوا کوئی سواری نہیں جاسکتی تھی۔ پانی کے بغیر وہاں انسان چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس صحرائیں دو خطرے ایسے تھے جن کا مقابلہ آج تک کوئی انسان نہیں کر سکا تھا۔ ایک ریت کی آندھیاں اور دوسرا سراب۔

ڈاکٹر دلاور نے تابش کو صحرا کے خطروں سے آگاہ کر رکھا تھا۔ جانے سے پہلے انھوں نے اسے نقشہ بھی سمجھا دیا تھا۔ تابش ابھی بچہ تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ ڈاکٹر دلاور نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجہ بیٹے کی پرورش پر مرکوز کر دی تھی۔ یہ سبق تابش کے خون میں شامل تھا کہ باہر کی دنیا گناہوں سے بھری پڑی ہے اور خدا گناہ گاروں کو پسند نہیں کرتا۔ تابش اپنے والد کو بہت عظیم انسان سمجھتا تھا۔ ان کی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے والد کی ہدایت کے مطابق موت کے اس سفر کی تیاری شروع کر دے۔ اس نے صحرا کے خطرات کے متعلق تمام ممکنہ معلومات حاصل کر لیں اور پھر ضروری سامان لے کر خزانے کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہی تابش کی اس ہوٹل میں موجودگی کی وجہ تھی۔

-☆-

یوساہی ہر رات تابش کے کمرے میں آنے لگی تھی۔ وہ طلوع و غروب اس سے باتوں میں مصروف رہتی تھی۔ تابش کی باتوں سے اسے دلی سکون ملتا تھا جیسے اس نے یوساہی کے ضمیر اور روح سے زہریلے کانٹے نکال دیے ہوں۔

جلد ہی ہوٹل کے مالک کو بھی احساس ہو گیا کہ یوساہی کی توجہ اب اپنے گاہکوں پر ختم ہو گئی ہے۔ اس نے دو تین راتوں سے ہوٹل کے مالک کو ایک پیسہ نہیں دیا تھا اور پوچھنے پر یہی جواب دیا تھا کہ میں نے اتنی راتوں میں کچھ نہیں کمایا۔

ہو گئے۔ اگر تم تیار ہو تو مجھے اپنی اجرت بتاؤ۔“

فیروز نے اسے اپنی اجرت بتادی اور بولا:

”میں جانتا ہوں یہ رقم زیادہ ہے۔ لیکن تم مجھے سنگ سیاہ کے علاقے میں لے جا رہے ہو جس کا نام سن کر اچھے اچھے دل والے گائیڈ بھی کانپ جاتے ہیں۔“

”مجھے تمہاری اجرت منظور ہے۔ میں بہت جلدی روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ سامان اور جانور تیار کر لو، اس کی تحصیل الگ سے قیمت ادا کی جائے گی۔“

”تیاری میں کچھ وقت لگے گا۔ میں تم سے درخواست کروں گا کہ اتنے دن یوسا تمہارے کمرے میں نہیں آئے گی نہ تم اس سے ملو گے۔“

”فیروز میں اپنا پیشہ چھوڑ رہی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ تابش کچھ کہتا یوسا نے جواب دیا۔ فیروز نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور یوسا کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا:

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم.... میرے بغیر تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا تم میرے بغیر زندہ رہ سکو گی۔ کیا تم اس پاگل کی باتوں میں آ گئی ہو۔ کیا تمہیں اُمید ہے کہ وہ تمہیں اپنے ملک لے جائے گا اور تم سے شادی کر لے گا۔“

”اس نے مجھے کوئی لالچ نہیں دیا۔ اس نے میرے جسم کے ساتھ قطعاً دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ میری رُوح کو بیدار کر دیا ہے۔“

”روح....؟ فیروز نے قہقہہ لگایا ”تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تمہارے جسم میں روح نام کی کوئی شے بھی باقی جاتی ہے.... ہوش کے ناخن لو لڑکی، مٹی کے کھلونوں میں روح نہیں ہوا کرتی۔“

یوسا جانتی تھی کہ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور وہ فیروز کے سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ فیروز نے اس پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن وہ اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔

اور فیروز کسی صورت یوسا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ان کے جانے کے بعد یوسا ہوٹل سے فرار نہ ہو جائے۔ اس ڈر کے علاوہ فیروز کو اپنی تفریح کے لیے بھی یوسا کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے یوسا کو ساتھ لے

”کیا وہ نو جوان ساری رات اپنے کمرے میں رکھ کر ایک پیشہ بھی نہیں دیتا؟“

”نہیں.... میں اس کے پاس طوائف کی حیثیت سے نہیں جاتی۔ ہم صرف باتیں کرتے ہیں۔“

”لیکن میں تمہیں مفت میں کھانا اور رہائش نہیں دے سکتا۔ اگر تم نے اپنا روپ بدل لیا ہے تو جگہ بھی بدل لو۔“ یوسا کی بات سن کر ہوٹل کا مالک بھڑک اٹھا۔

”فیروز کو آنے دو۔ پھر میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

یوسا کا جواب سن کر ہوٹل کا مالک خاموش ہو گیا۔ وہ اسے فیروز کی اجازت کے بغیر ہوٹل سے نہیں نکال سکتا تھا۔

یوسا کی دل کش جوانی نے اس کے ہوٹل کی شہرت بہت بڑھادی تھی۔ وہ خود بھی اسے ہوٹل سے نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ ایک صبح فیروز بھی واپس آ گیا۔ ہوٹل کے مالک

نے پہلی ہی ملاقات میں اسے یوسا کے بارے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سیدھا تابش کے کمرے میں پہنچ گیا جہاں یوسا

بھی موجود تھی۔ فیروز کو دیکھتے ہی یوسا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ دوڑ کر فیروز کے سینے سے لگ گئی۔ تابش بھی

اس سے گرم جوشی سے ملا تھا۔ فیروز کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بنیادہ طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے چند لمحے غور

سے تابش کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا:

”ہوٹل کے مالک نے بتایا ہے کہ تمہیں سنگ سیاہ کے علاقے تک جانے کے لیے گائیڈ کی ضرورت ہے....“

اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے یوسا کو گمراہ کر کے اس کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ تم شاید اس کے متعلق کچھ

نہیں جانتے۔ یوسا کا یہی پیشہ ہے اور اسے اسی ہوٹل میں رہنا ہے۔ اگر اسے یہاں سے نکال دیا گیا تو یہ کہاں جائے گی۔ کیا تم اس کے ساتھ شادی کر لو گے؟“

تابش اپنی محدود دنیا کا قیدی تھا۔ وہ چند لمحے سوچ کر بولا:

”میں نے اس لڑکی کو بتایا ہے کہ تم ایک عورت ہو اور عورت مقدس ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اسے اپنے ملک نہیں لے جا سکتا۔ میں

بڑی خطرناک مہم پر جا رہا ہوں۔ جس میں تم میرے گائیڈ

اودھو! تم کس قدر حسین ہو....“

ہوٹل کی نسبت یوسا صحرا میں زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شب بیداری کا شمار تھا اور بالوں نے بکھر کر اس کے آدھے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی پاؤڈر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کا کاروبار لیپ نہیں تھا۔ صحرا کی صبح میں یوسا کے قدرتی رنگ میں تابش نے جاذبیت محسوس کی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ اس کی زندگی عورت کے وجود سے خالی ہے.... اور خالی ہی گزرے گی۔ اس نے ماں نہیں دیکھی تھی، اس کی بہن بھی نہیں تھی.... وہ عورت کے لمس سے ہی نا آشتا رہا تھا۔ اگر وہ اپنے آپ پر قابو نہ پالیتا تو ہاتھ بڑھا کر یوسا کی بکھری ہوئی زلفوں کو چھو لیتا.... پھر اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا:

”یہ گناہ ہے.... تم جسم کے حسن میں اُلجھ گئے ہو.... یہ لڑکی تمہارے ساتھ روح کی تلاش میں نکلی ہے۔ یہ تمہیں اپنا رہنا سمجھتی ہے۔“

تابش گھبرا گیا۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ وہ اسے گناہ سمجھتا تھا کہ کسی عورت کے جسمانی حسن کو غلط نظر سے دیکھے۔ وہ اپنی کمزوری سمجھ گیا اور اس خطرے کو بھی بھانپ گیا کہ یوسا ساتھ رہی تو وہ اس کے حسن کا گرویدہ ہو جائے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو.... تم کچھ پریشان ہو گئے ہو۔ شاید یہ سوچ رہے ہو کہ یہ سفر بہت ٹھن ٹھن ہوگا۔“ یوسا نے کہا تو تابش یوں ہڑبڑایا جیسے چوری چھڑی گئی ہو: ”ہاں میں یہی سوچ رہا ہوں کہ آگے سفر بڑا ٹھن ہوگا اور تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکو گی.... بہتر ہے تم یہیں سے واپس چلی جاؤ۔“

درحقیقت تابش کو یوسا سے نہیں خود سے ہمدردی تھی.... اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکی میں بے پناہ کشش ہے۔ اس کے جسم میں ایسی خوب صورتی ہے جو اسے کسی مقام پر بھی شکست دے سکتی ہے۔

”نہیں تابش! مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ ڈر ہے کہ تم ہارنہ مان جاؤ۔ تم پہلی بار صحرا

جانے کا فیصلہ کر لیا:

”کیا اس ایڈونچر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلنا پسند کرو گی.... اگر ہوٹل کی یہ زندگی تمہیں پسند نہیں تو میرے ساتھ چلی چلو۔ ہم خطرناک ہے۔ جگہ بہت دور ہے لیکن میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔“

یوسا بھی تابش سے دور نہیں رہنا چاہتی تھی، لہذا اس نے فوراً ہاں کر دی۔ اسے ایک خوشی تو یہ ہوئی کہ ہوٹل کے گندے ماحول سے نکل جائے گی اور دوسری خوشی یہ تھی کہ وہ فیروز کا ساتھ دینے کے بہانے تابش کے ساتھ رہے گی۔“

فیروز نے تین خچروں کا انتظام کر لیا۔ منزل کے دو طرفہ فاصلے اور سفر کی دشواریوں کے مطابق سامان وافر مقدار میں جمع کیا گیا تھا جس میں خشک خوراک، پانی کے مشکینے اور فیروز کے اپنے استعمال کے لیے شراب بھی شامل تھی۔

ایک صبح یہ قافلہ اس طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایک جرائم پیشہ آدمی طوائف کو اپنے مقصد کے لیے ساتھ لے جا رہا تھا جبکہ طوائف اس پاراسا کی پاک محبت کی خاطر جاری تھی جسے طوائف کے ارادوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔

☆-

جس وقت انھوں اپنا سفر شروع کیا رات کی تاریکی ابھی سحر کے ڈھندلکے میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یوں خاموشی جیسے ساری دنیا مر گئی ہو۔ فیروز سب سے آگے خچر کی باگ تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ اس خچر کی زین کے ساتھ دوسرے خچر اور اس کی زین کے ساتھ تیسرے خچر کی لگام بندھی ہوئی تھی۔

خچروں سے آٹھ دس قدم پیچھے تابش اور یوسا پیدل چل رہے تھے۔ سوئی ہوئی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ قصبے سے باہر نکل گئے۔ جب صبح کا اُجالا پوری طرح روشن ہو گیا تو تابش نے گھوم کر پیچھے دیکھا جہاں ریت کے گول گول ٹیلے تھے۔ انھی ٹیلوں کے عقب سے سورج ابھر رہا تھا۔ ریت چاندی کے برادے کی طرح چمک رہی تھی۔ ابھی رات کی خشکی باقی تھی۔ سورج کی زرد کرنوں نے صحرا میں ایسی دلکشی پیدا کر دی تھی کہ تابش کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا:

میں آئے ہو جب کہ میں تو صحرا کی بیٹی ہوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں اس ریت کا ایک ذرہ ہوں اور مجھ میں ایک نئی طاقت آگئی ہے۔“
تابش کچھ کہنے لگا تھا کہ یوسا نے اسے روک دیا۔ وہ جذباتی ہو گئی تھی:

”تابش نہ تم اس ہوٹل میں آئے، نہ میں تمہارے کمرے میں جاتی..... میں اسی پیشے میں مطمئن رہتی.... مرد میرے جسم سے کھینچتے رہتے..... مجھے بچپن یاد آتا تھا، ماں باپ بھی یاد آتے تھے لیکن میں نے ان یادوں کے ساتھ منجھوٹہ کر لیا تھا۔ دل زیادہ بے چین ہوتا تو شراب پی کر سب کچھ بھول جایا کرتی تھی۔ تم آئے تو مجھے نیا راستہ دکھایا۔ اب مجھے کہتے ہو کہ میرے ساتھ نہ چلو.... کیا تم مجھے اسی غلامت میں پھینک دینا چاہتے ہو جہاں سے تم ہی نے مجھے نکالا ہے؟“

”ہمیں میرا مطلب یہ ہرگز نہیں جو تم سمجھی ہو۔“ وہ ہکلا کر چپ ہو گیا۔

”تو پھر میری فکر نہ کرو.... میں اس ہوٹل میں واپس جانے کے بجائے اس صحرا میں پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جانا پسند کروں گی۔ تم نے مجھے ایسی روشنی دکھائی ہے کہ مجھے ان وحشی لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے.... اب میں ہر اس آدمی کے منہ پر تھوکوں گی جس کی نظر میرے جسم پر ہوگی۔ اب میں اس شخص کی تلاش میں ہوں جو میری روح سے پیار کرے۔ مجھے یقین ہے تابش کہ وہ آدمی تم ہو۔ مجھے اپنے ساتھ چلے دو.... میں جانتی ہوں کہ فیروز مجھے اپنی تفریح کے لیے ساتھ لایا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ اس سے بچی رہوں۔ لیکن وہ ہم دونوں کو بڑی آسانی سے قتل کر کے صحرا میں غائب ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے مجھ پر کچھ احسانات ہیں۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں.... کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فیروز صرف میرا آقا نہیں، وہ مجھے چاہتا بھی ہے۔ اس کے دل میں میرے لیے محبت ہے۔“

”بے فکر رہو! میرے پاس ریوا لور ہے.... فیروز ہمیں جک نہیں کرے گا۔“

”اس کے پاس بھی ریوا لور ہے۔ اسے ریوا لور سے ڈرانے کی غلطی مت کر بیٹھنا۔“ یوسا کی بات سن کر

تابش خاموش ہو گیا۔
یوسا اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی چال میں خود اعتمادی اور روانی تھی۔ جیسے پانی میں پھلکی تیر رہی ہو۔ فیروز شجروں کے آگے آگے چل رہا تھا۔ تابش دیکھ چکا تھا کہ فیروز پتھر ہے۔ اتنا مضبوط پتھر جو آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا۔

سورج سر پر آ گیا تھا اور ان تینوں کے جسم جھلنے لگے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ عمودی ٹیلے کے سائے میں بیٹھ گئے۔ فیروز زبردستی طاری تھی۔ تابش نے اس کے ساتھ باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مختصر جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر سے چل پڑے۔ فیروز صحرا کا بھیدی تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پانی کہاں کہاں مل سکتا ہے۔ رات وہ ایک تختستان میں جا کر وہاں پانی ہی نہیں درخت بھی تھے۔

صحرا کی رات بہت ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ فیروز نے شجروں سے سامان اُتار دیا اور تینوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد فیروز نے یوسا کی طرف دیکھا اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا:

”تم میرے ساتھ آؤ.... ہم الگ سوئیں گے۔“
”نہیں ہم تابش کے پاس ہی رہیں گے۔“ یوسا نے فوراً جواب دیا۔

”فیروز تم جہاں جی چاہے سو جاؤ، یوسا کو یہیں رہنے دو۔“

تابش کی بات سن کر فیروز نے سر ہلایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”جب سے تم صحرا میں آئے ہو چپ چپ اور پریشان ہو۔“ یوسا نے کہا
”میں تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ تابش نے موضوع بدل دیا ”تم سفر کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتی۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اپنے جھوٹ بولنے کا بھی احساس تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ یوسا کو بتادے کہ وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مگر اس میں اتنی جرات نہ

تھی۔ چنانچہ اس نے وہی باتیں شروع کر دیں جن سے یوسا کی زندگی تبدیل ہوئی تھی۔ لیکن اب ان باتوں میں پہلے والا اثر نہیں تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یوسا کو دھوکا دے رہا ہو۔

تابش کا جسم دن بھر کے سفر سے ٹوٹا جا رہا تھا۔ یہ ممکن صرف جسمانی نہیں جذباتی بھی تھی۔ اندرونی کش مکش نے اسے تھکا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے یوسا کو سونے کا کہا اور ریت پر بچھے بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یوسا سونے کے لیے کہاں چلی گئی تھی۔ تابش فوراً ہی سو گیا تھا۔

جانبے کتنی دیر بعد اسے یوں لگا جیسے کسی نے چھوڑ کر چگا دیا ہو۔ آنکھ کھلی تو فیروز اس کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا:

”یوسا کہاں ہے....؟“

”میرے پاس“ فیروز نے بے پروائی سے کہا۔ ”وہ مجھ سے دور نہیں رہ سکتی.... میں خجروں پر سامان باندھتا ہوں۔ تم یوسا کو جگا کر ناشہ کر لو، ہمیں جلدی روانہ ہونا ہے۔“ وہ خجروں کی طرف چل دیا۔ تابش نے انگڑائی لے کر سستی سے نجات حاصل کی اور یوسا کو جگانے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

”فیروز کہاں ہے....؟“ یوسا نے آنکھیں کھولتے ہی فیروز کے خالی بستر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ خجروں پر سامان باندھ رہا ہے۔“ تابش نے بے دلی سے کہا۔

”اوہ.... یہ شخص بہت عجیب ہے۔ مجھے اس کے لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ شخص میرے دل میں رچ بس گیا ہے۔ یہ میرا محافظ ہے۔“

”اور میں....“

تابش کے منہ سے بے اختیار لگلا۔ مگر دو الفاظ بول کر ہی اس نے ہونٹ سمجھ لیے۔ اسے اپنے الفاظ سے رقابت کی بو آ رہی تھی۔

”تم میری روح کے محافظ ہو۔ میں تمہیں فیروز کے ساتھ کھڑا کر کے تمہاری توہین نہیں کر سکتی۔ تم نے بتایا تھا کہ روح پاک ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے پاک چیز تمہارے قدموں میں رکھی ہے۔ میرا جسم ناپاک ہے۔“

تمہارے کہنے کے مطابق یہ فانی ہے۔ اسے کیڑے کھائیں گے۔ اس لیے میں نے فیروز کی ملکیت میں چھوڑ دیا ہے۔“

تابش کی پارسائی کو جسمانی جذبات نے دبوچ لیا تھا۔ وہ ایسے جذبات کے اظہار کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ وہ مضطرب ہو گیا۔ خجروں پر سامان بندھ چکا تھا۔ فیروز نے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تو دُور سے چلایا:

”یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ سورج نکلنے تک ہمیں کئی میل سفر طے کرنا ہوگا۔“

ناشتے کے بعد قافلہ اس منزل کی طرف روانہ ہو گیا جس کے بارے میں فیروز کو شک تھا کہ وہ ہے بھی یا نہیں۔ وہ صرف سنگ سیاہ نامی جگہ کو جانتا تھا جو کوئی شہر یا گاؤں نہیں تھا۔ یہ صحرا کا بے حد خطرناک حصہ تھا اور اسی حصے کو صحرائی ڈاکوؤں اور راہزنوں نے سنگ سیاہ کا نام دے رکھا تھا۔

سورج طلوع ہونے تک قافلہ اس پر اسرار اور خطرناک سفر کے دس بارہ میل مزید طے کرنے میں کامیاب ہو گیا.... اس کے بعد ان تینوں میں سے کوئی حساب نہ رکھ سکا کہ کتنے سورج طلوع اور غروب ہو چکے ہیں۔ وہ اتنی دور نکل آئے تھے جہاں کسی قافلے کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ یہاں ریت کے ٹیلوں کی بھول بھلیاں تھیں۔

بہت دن گزر گئے۔ شب و روز کا معمول یہ تھا کہ وہ دن بھر چلتے رہتے تھے فیروز کہیں کہیں رُک جاتا۔ وہ زمین پر جھٹکا، لدا لے کر گڑھا کھودتا اور وہاں سے پانی نکل آتا.... ریگستان کا یہ بھیدی پانی کی بو پالتا تھا۔ صحرا کے نیچے کہیں کہیں پانی کا ذخیرہ چھپا ہوتا ہے۔ صحرائی خانہ بدوش اور جانور پانی کی بو پالتے ہیں۔ فیروز نے اپنے قافلے کو پیاسا نہ رہنے دیا تھا۔

سفر میں ان کا معمول یہی رہا کہ دن بھر چلتے اور رات کو آرام کرتے۔ یوسا تابش کے پاس بیٹھ جاتی اور دونوں باتیں کرتے رہتے۔ جبکہ فیروز الگ جا کر سو جاتا۔ پھر تابش بھی سو جاتا اور جب سحر کے اندھیرے میں فیروز اسے جگاتا تو وہ دیکھتا کہ یوسا کا بستر فیروز کے قریب ہوتا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر تابش کی پارسائی متزلزل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ایسی پیاس محسوس کرتا جو پانی سے نہ بجھتی تھی۔ وہ فیروز کو یہ کہنے سے بچھکتا تھا کہ وہ یوسا سے دور رہے۔ ایک روز تیز آندھی آئی اور اس کی پارسائی کو اڑا لے گئی....

تابش صحرائی آندھی سے واقف نہیں تھا۔ ان کے متعلق اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ آسمان تک اونچی مٹی اور ریت کی دیوار کو دیکھنے کے لیے رک گیا۔ یوسا نے اسے گھسیٹے ہوئے کہا:

”رکومت! ہم ریت میں دفن ہو جائیں گے۔“ یوسا نے اپنا بازو تابش کی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور بولی ”مجھے پکڑ لو....“

تابش ایک زوردار جھونکے سے مل گیا تھا۔ اس نے یوسا کی طرح اپنا بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ آندھی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ آندھی تیز اور تندھی۔ جنھیں ڈراؤنی تھیں۔ ان دونوں پر ریت اس طرح گری رہی تھی جس طرح سمندر میں موجیں جہازوں سے کتراتی ہیں۔

”آنکھوں پر پکڑا چڑھا لو....“ یوسا کی آواز سنائی دی۔ تابش نے ماتھے اور ہونٹوں سے پکڑا سر کا کر آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اس نے یوسا کے گرد بازوؤں کا گھیرا اور تنگ کر دیا۔ یوسا نے بھی اس کی کمر کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ تابش رُکنا چاہتا تھا ریت کے تھپڑے اسے رکے پر مجبور کر رہے تھے۔ لیکن یوسا اسے رکے نہیں دے رہی تھی۔ وہ رکے کے نتائج سے آگاہ تھی۔ آندھی کے شور میں انھیں چند بار فیروز کی پکار بھی سنائی دی تھی۔ وہ انھیں آگے بڑھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

تابش نے اسے دونوں بازوؤں سے جکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا اس نے کبھی کسی عورت کو نہیں چھوا تھا۔ مگر یہاں ایک جوان اور حسین دلکش عورت اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی کہ وہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ آندھی کے تھپڑوں سے یوسا کے بال اڑ اڑ کر تابش کے چہرے سے لپٹ رہے تھے۔ تابش نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ اس کے بالوں پر پھر اڑا تو وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا.... اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک آندھی چل رہی تھی۔ اس پر ایک ایسا سرد طاری ہونے لگا جس سے وہ نا آشنا تھا۔ اس نے یوسا کو چھوڑ دینا چاہا مگر کسی قوت نے اس کے بازوؤں کی گرفت مزید مضبوط کر دی۔

صحرا اور سینے کی آندھیاں کھٹم کھٹا ہوئی رہیں۔ وہ

دن کا وقت تھا۔ وہ چلے جا رہے تھے۔ لو چل رہی تھی۔ انھوں نے منہ اور سر مونے پکڑوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ ریت کی چمک میں آنکھیں کھول کر چلنا محال تھا۔ اچانک لوٹھم گئی۔ فیروز جو کہ خچروں کے ساتھ آگے آگے چل رہا تھا رُک گیا۔ خچر ریت پر کھر مار مار کر بے چینی کا اظہار کرنے لگے۔ صحرا کے جانور موسیٰ تبدیلیوں کو سمجھ لیتے ہیں۔ فیروز نے ادھر ادھر دیکھا۔ تین چار فرلانگ دور مٹی کا ایک ٹیلا کھڑا تھا۔ ایسے ٹیلے ریتیلی نہیں ہوتے۔ فیروز نے تابش اور یوسا کی طرف دیکھا اور چیخ کر بولا:

”جلدی میرے پیچھے آ جاؤ.... آندھی آرہی ہے۔“ ہوا کے سکوت نے فیروز اور خچروں کو جبردار کر دیا تھا۔ فیروز دوڑا تو خچر بھی اس کے پیچھے دوڑے مگر یوسا ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ اسے دیکھ کر تابش نے اپنی رفتار سست کر دی۔ فیروز کافی دور نکل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صحرائی آندھی کیا حال کرتی ہے۔ ریت کے ٹیلے اس کے آگے غائب ہو جاتے ہیں کوئی انسان یا جانور کہیں بیٹھ جائے تو اڑتی ریت اس کے جسم سے ٹکراتی ہوئی لگتی ہے اور تھوڑی دیر میں وہاں ٹیلا بن جاتا ہے۔

فیروز مٹی کے ٹیلے کی اوٹ میں پہنچنے والا تھا۔ وہی ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ لیکن تابش اور یوسا ابھی دور تھے.... اچانک ایک طرف سے آسمان سُرخ مائل ہو گیا تھا۔ آندھی بڑی تیزی سے آرہی تھی۔ ان دونوں کی رفتار آندھی سے بہت کم تھی۔ فیروز خچروں کو لے کر ٹیلے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ آندھی ان کے قریب پہنچ گئی تھی۔ زمین سے آسمان تک اونچی ریت کی دیوار ان کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ یوسا اس کی حقیقت جانتی تھی اس نے گھبرا کر تابش کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے ساتھ لگ گئی۔ اس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی:

”تابش یہ آندھی بہت خطرناک ہے....“

آپ کا دل

ملک کی مشہور معروف فلم کاروں کے سلسلے وار ناول
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

قیمت: 67 روپے

چاہت و محبت کے مونیٹ پر لکھی ایسی دلکش تحریر
جو آپ کی دل کی دنیا میں بل جلا کر دے

معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا فارغ دل کا ناول
جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کر دے گا

قیمت: 67 روپے

خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقرار آئینہ کا
بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کر دے

دونوں ایک جسم بنے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ حتیٰ
کہ آندھی کا زور ٹھمنے لگا۔ فضا صاف ہونے لگی۔ تو یوسا
تابش سے الگ ہو گئی۔ تابش نے آنکھوں سے کپڑا ہٹا کر
دیکھا تو اسے کچھ دور فیروز کھڑا نظر آیا۔ وہ مٹی کے ٹیلے کی
اُٹ میں آندھی سے محفوظ تھے۔

آندھی تھمتے ہی سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ فیروز کی
رہنمائی میں یہ قافلہ سورج غروب ہونے تک ایک بہتر جگہ
پہنچ گیا۔ ہر رات کی طرح کھانا کھانے کے بعد یوسا تابش
کے قریب بیٹھ گئی اور پھر کافی دیر بعد فیروز کے پاس چلی گئی

اس رات تابش اتنی جلدی نہ سوسکا۔ اس کے سینے
میں یوسا کے رشتی بالوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور اس کے
لمس کو وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔

تابش کے ذہن میں سوالات سر اٹھانے لگے تھے:
”خدا نے مجھے عورت بھی نعمت سے کیوں محروم
رکھا...؟“

”والد نے مجھے عورت سے دور رہنے کا سبق کیوں
دیا تھا...“

کچھ فاصلے پر فیروز اور یوسا بھی جاگ رہے تھے۔
یوسا جب اُٹھ کر فیروز کے پاس گئی تو اس نے شراب کی
بوتل نکال لی اور دو گلاس بھر کر دونوں چکیاں لینے لگے۔
”فیروز تمہارے اندر روح ہے...؟“ یوسا نے
گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم ہوتا ہے یہ تابش خزانے کی تلاش میں نکلا
ہے... اور تم روح کی جستجو میں ہمارے ساتھ آئی ہو۔“
فیروز نے کہا اور گلاس طاق میں اٹھل پل لیا۔ ”میرے نزدیک
تم دونوں بھٹکے ہوئے ہو۔ عورت کی زنجیریں پارسانی کی
زنجیروں سے مضبوط ہوتی ہیں اور تم جیسی دل نشین لڑکی کی
مسکراہٹ پارسانی کی زنجیروں کو لطیف سی ضرب توڑنے کی
طاقت رکھتی ہے۔“

”تابش کو میرے جسم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں
شاید بھٹک کر پھر اسی ہوٹل میں چلی جاؤں مگر تابش نہیں
بھٹک سکتا... وہ انسان کے روپ میں فرشتہ ہے۔ تم ٹھیک
کہتے ہو کہ میں روح کی تلاش میں ہوں۔ مجھے یقین ہے
تابش مجھے میری روح ڈھونڈ دے گا۔“

”مجھے ڈر ہے وہ کہیں اپنی روح نہ کھو بیٹھے۔“ فیروز نے قہقہہ لگایا۔

”تم عادی نہیں پیدا آئی جرائم پیشہ ہو فیروز... تمھاری وہ حسیں مرجی ہیں جو نیکی اور بدی میں تمیز کر سکیں۔ اگر تم کچھ وقت تائش کی باتیں سن لیا کرو تو تمھاری زندگی بدل جائے۔“ یوسا اس کا قہقہہ سن کر کھول اٹھی تھی۔

”نہیں.... میں پیدا آئی مجرم نہیں ہوں۔ میری وہ حسیں زندہ ہیں جو نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کیا ہونا چاہیے تھا، مجھے احساس ہے کہ میں کیا ہوں.... اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں کیا تھا۔“ فیروز کی آواز اُداس ہو گئی۔ اس نے گلاس اوپر کر کے چاندنی میں چمکتی ہوئی شراب کو دیکھا اور بولا:

”آج پہلی بار تمھیں بتا رہا ہوں کہ میری روح زندہ ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ مرجائے مگر نہیں سکی.... اور سنو! تم پہلی اور واحد لڑکی ہو جسے میں نے اپنی تسکین کا ذریعہ بنایا۔ میں نے لڑکیاں خریدیں، بچیں اور اغوا کی ہیں، انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا ہے۔ ان میں بعض بہت خوب صورت تھیں مگر کسی کے جسم کو ہوس کی نظر سے نہیں دیکھا۔ دل نے کسی کے حسن اور جوانی کو قبول نہیں کیا.... صرف تم ہو جسے میں نے دل سے چاہا ہے۔“ فیروز نے نشے میں اعتراف کیا۔

”پھر تم نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا.... مجھے ہوٹل میں ان گوشت نوچنے والے درندوں کے حوالے کیوں کر دیا۔“ یوسا کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”یہ درست ہے کہ میں نے تمھیں بیوی نہیں داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے.... میری زندگی کا ایک تازیک پہلو بھی ہے جو میں نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ جس طرح تمھاری غریب ماں نے تمھیں بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور ان سے تمھیں میں نے خرید لیا.... بالکل اسی طرح میری بہن کو بردہ فروش خرید کر لے گئے تھے۔ اس وقت میری عمر دس یا گیارہ سال تھی۔ میرا باپ مر گیا تھا۔ ہم بھی تمھاری طرح صحرائی خانہ بدوش تھے۔ میں اپنی بہن کے جانے کے بعد بہت رویا تھا۔ ماں نے مجھے بھلانے کے لیے کہا تھا کہ تیری بہن کو بیاہ دیا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ چلی

گئی ہے مگر میں سب سمجھتا تھا۔ عمر کے لحاظ سے میں بچہ تھا لیکن غریبوں اور خانہ بدوشوں کے بچے بچپن میں ہی جوان ہو جاتے ہیں۔ میں جان گیا تھا کہ ماں جھوٹ بول رہی ہے۔ میری بہن بک چکی تھی۔ ماں نے مجھے پالنے کے لیے میری بہن کو بیچ ڈالا تھا۔ تھوڑا بڑا ہوا تو ماں نے مجھے قاہرہ کے ایک ہوٹل میں نوکر کر دیا اور خود جانے کہاں چلی گئی۔ اسی ہوٹل میں پہلی مرتبہ میں نے ایک عیاش دولت مند کے قیمتی پتھر چرائے اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ یہ میرا پہلا جرم تھا۔ پھر یہی میری زندگی بن گئی۔ میں جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہو گیا اور استادوں سے ہنر سیکھ لیے۔ میں نے ساری عمر جرائم کیے ہیں مگر میری روح مری نہیں۔ تم جب میرے کاروبار میں داخل ہوئیں تو معلوم نہیں کیوں میں نے محسوس کیا کہ میری روح تروتازہ ہو گئی ہے۔ میں نے تمھیں کاروبار کے لیے خرید اٹھا۔ ارادہ تھا کہ زیادہ قیمت پر بیچ دوں مگر تمھیں اپنے آپ سے جدا نہ کر سکا۔ میں نے تمھیں ہوٹل میں رکھا اور جہاں گیا تمھیں اپنے ساتھ لے گیا۔ تم مجھ پر لخت بھیج سکتی ہو کہ میں نے تمھارے جسم سے پیسہ کمایا لیکن سمجھنے کی کوشش کرو کہ میرے ایک جسم میں دو انسان ہیں۔ ایک وہ جو جرائم پیشہ ہے اور دوسرا وہ جو محبت کا پیاسا۔ یہ پیار میں نے تم سے حاصل کیا ہے۔ میں نے تمھیں کبھی نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور جس روز تم نہیں رہو گی میں بھی اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا۔“

فیروز نے یوسا کو اپنے قریب کر کے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ فیروز کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ اچانک یوسا کے گالوں پر دو پانی کے قطرے گرے۔ اس نے انگلی سے دونوں قطرے پونچھ ڈالے اور ہنس کر بولی:

”برے انسان تمھارے منہ سے شراب ٹپک رہی ہے۔“

”یہ شراب نہیں میرے آنسو ہیں....“

یوسا اچھل کر اس کے سینے سے الگ ہوئی اور اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ کر پوچھا: ”آنسو.... اور تمھاری آنکھوں میں؟“

”نہیں.... یہ میری روح کے آنسو ہیں.... اب

تو یقین کر لو میری روح زندہ ہے۔“

فیروز شراب کا گلاس منہ سے لگانے لگا تو گلاس وہیں رک گیا۔ تابش بھی ریوالور ہاتھ میں لیے فیروز کے پاس جا بیٹھا۔ فیروز نے ریوالور نکال لیا۔ چند قدم کے فاصلے پر تین سائے کھڑے تھے۔ وہ لمبے ترنگے سیاہ پوش تھے۔ انھوں نے سر اور منہ سیاہ کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ فیروز نے آہستہ سے کہا:

”صحرائی ڈاکو ہیں.... ریوالور تیار رکھو۔“

ایک نقاب پوش آگے بڑھا تو فیروز نے ٹریگر پر انگلی رکھ لی۔ نقاب پوش اس کے قریب آ کر رک گیا۔ نقاب پوش نے فیروز کو قریب سے دیکھا تو چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا۔ سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ تینوں نے فیروز سے ہاتھ ملائے۔

انھوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ ان میں سے ایک نے یوسا کو بھی پہچان لیا۔ فیروز نے یوسا کو بھی لوگوں سے خرید لیا تھا۔ وہ خود بھی کچھ عرصہ ان کے گروہ میں رہ چکا تھا۔ ایک نقاب پوش نے بتایا:

”ہم نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ ہم پرسوں سے تمہارے نقاب میں ہیں۔ سوچا تھا ذرا آگے جا کر پکڑیں گے۔“ وہ فیروز سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔

”میں نے تم دونوں کو نہیں بتایا تھا۔“ فیروز نے تابش اور یوسا سے کہا۔

”میں ان نقاب پوشوں کو تین راتوں سے دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اور یوسا کو نہیں پہچانا تھا۔ کیوں کہ یہ رات کو دور سے ہمیں دیکھتے تھے اور میں ریوالور ہاتھ میں لے کر جا گتا رہتا تھا۔ اچھا ہوا یہ آج ہمارے قریب آگئے اور ملاقات ہو گئی ورنہ دور سے فائر کر کے ہمیں مار بھی سکتے تھے.... یہ میرے دوست ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بخش دیں گے۔ اگر ان کا پانی ختم ہو گیا تو وہ ہم سے چھین لیں گے۔ صحرائی کوئی انسان پیاسا نہیں مرنے چاہتا۔ ان رہزنوں کی صحرائی موجودگی ہمارے لیے مستقل خطرہ ہے۔“

تابش کو فوراً یوسا کا خیال آیا۔ اس نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ رہزن یوسا کو اٹھا لے جائیں گے۔ اس نے فیروز سے اس خطرے کا ذکر کیا اور غصے سے بولا:

”تم نے یوسا کو ساتھ لاکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

رہزنوں کا خطرہ تو اب پیدا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ ہماری مہم اتنی خطرناک ہے کہ زندہ واپس آنا مشکل ہے۔ میں سنگ سیاہ کے دو ہزار سال پرانے کھنڈرات میں جا رہا ہوں۔ جہاں میرے باپ کی وصیت کے مطابق خزانہ دفن ہے۔ خزانہ سونے کی ڈلیوں، ہیروں اور جواہرات کی شکل میں ہے۔ کھنڈرات ہزاروں فٹ اونچے پہاڑوں کی ایک وادی میں ہیں۔“

”تم پاگل ہو۔“ فیروز نے اس کی بات کاٹی۔

”جہاں تک میں صحرا کو جانتا ہوں آگے کوئی کھنڈرات نہیں اور نہ اس ریگزار میں کوئی پہاڑ ہے۔ میں صحرائی رہزن ہوں اور صحرا ہماری پناہ گاہ ہے۔ ہم لوگ تم جیسے دولت مند سیاحوں کے قافلوں کو لوٹ کر یہاں آ جاتے ہیں۔ پھر کوئی ہمیں نہیں ڈھونڈ پاتا۔ دو چار دن کے سفر کے بعد ہمیں یقین آ جاتے گا کہ ایسا بادشاہ کوئی نہیں تھا جس نے صحرا کے اس جہنم میں آ کر محل بنائے ہوں اور تمہارے لیے خزانہ چھوڑ کر مر گیا ہو.... میں زیادہ دور تک نہیں جاؤں گا۔ تین دن بعد ہم سنگ سیاہ کے علاقے میں ہوں گے۔ وہاں سے میں آگے نہیں جاؤں گا.... اور سنو تم یوسا کا تم نہ کرو۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ جہاں دیکھوں گا وہ خطرے میں ہے وہیں سے واپس چلا جاؤں گا۔“

تابش کے سینے میں ایک رقیب جاگ اٹھا تھا۔ اس نے حکیمانہ لہجے میں کہا:

”دیکھو فیروز! تم میرے گائیڈ ہو۔ مجھے راہ دکھاؤ، میری راہ میں نہ آؤ۔ میں تمہیں منہ مانگی اجرت دے رہا ہوں۔ خزانہ مل جائے گا تو اس میں سے بھی تمہیں کچھ دے دوں گا۔“ پھر اس نے فیروز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم یوسا کو گناہوں سے نکلنے نہیں دے رہے۔ اس سے ذرا دور رہنے کی کوشش کرو.... ہم صرف تین لوگ ہیں۔ کوشش کرو ہمارے درمیان امن قائم رہے۔“

فیروز زبردست مسکرا دیا۔ تابش اس کی مسکراہٹ کو نہ سمجھ سکا۔ فیروز کی مسکراہٹ میں ایک چیلنج تھا اور ایک منجھے ہوئے رہزن کی خود اعتمادی بھی تھی۔

اگلا دن چلتے رکتے اور قدم کھینٹے گزرا۔ سورج

روز سے اس کے منہ سے خون اور پیپ آ رہی ہے اور اب یہ ختم ہو رہا ہے۔
فیروز اور یوسا بھی تابش کے تعاقب میں وہاں پہنچ گئے۔

تابش نے مرنے والے کا کھلا ہوا منہ اور زیادہ کھولا۔ ایک آدمی نے ملتی ہوئی لکڑی آگے کی تو اس کی روشنی میں تابش کو سردار کے حلق میں پھنسی ہوئی بڑی نظر آ گئی۔ یہ چھوٹی سی بڑی تھی جس کے دونوں سروں کی نوکیں حلق کی دیواروں میں آ کر ٹکی تھیں۔ تابش نے بیک سے جراحی والا چمکا نکالا۔ اس نے گردن کو باہر سے دبا کر چمکا حلق میں ڈالا اور بڑی پکڑ کر باہر نکال لی۔ پھر اس نے ایک پاؤ ڈرائنگ کی مدد سے مریض کے حلق میں مل دیا۔ جلد ہی مریض نے آنکھیں کھول دیں اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تابش نے اسے چند گولیاں دیں اور سمجھایا کہ کس طرح کھانی ہیں۔

فیروز نے سکون کا سانس لیا کہ سب ٹھیک ہو گیا۔ وہ اس گروہ کو بھی جانتا تھا۔ وہ تینوں نقاب پوش اسی گروہ سے تھے جو انھیں لوٹے آئے تھے۔ ان سب نے بھی فیروز کو پہچان لیا تھا۔ اب دف اور شہنائی نے ماتم کے بجائے طریقہ نغمہ چھیڑ دیا۔ وہ لوگ تابش کو دیوتا سمجھنے لگے تھے۔ ان تینوں کی خوب خاطر تواضع کر کے رخصت کر دیا گیا۔
”دیکھنا تم نے..... میں نہ بتاتی تھی کہ اس شخص کے ہاتھ میں کرامت ہے تم اس کے پاس بیٹھو تو سہی۔“ وہاں ہی پر یوسا نے فیروز کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

-☆-

یوسا پر فیروز کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بے شک فیروز نے اسے داشتہ بنا رکھا ہوا تھا مگر وہ اس کی ممنون تھی۔ اب جبکہ فیروز نے اسے اپنی زندگی کی کہانی سنا دی تھی تو اسے فیروز کی ذات سے جو دلچسپی تھی وہ کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

اس رات جب سونے کا وقت آیا تو فیروز یوسا کو تابش سے دور لے گیا۔ تابش کے ذہن پر اس لمحے یوسا نہیں منزل سوار تھی۔ اس کے خیال کے مطابق منزل قریب آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نزانہ کیسا اور کتنا ہوگا۔ پھر وہ اپنے باپ کے بارے میں سوچنے لگا جو انھی راہوں پر مارا

غروب ہوا تو فیروز نے قافلے کو ایک ایسی جگہ روکا جہاں مٹی کے ٹیلے تھے۔ پانی بھی تھا اور کچھ ہنرہ بھی۔ قافلہ ایک ٹیلے کے قریب قیام پذیر ہو گیا۔ یہ رات بھی صحرا کی ہر رات کی طرح خاموش اور سرگرمی۔

تھوڑی دیر بعد صحرائی دف کی تھاپ سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی شہنائی کا اداس نغمہ سنائی دینے لگا۔
فیروز نے یوسا کی طرف دیکھا:
”کیا تم یہ آواز پہچانتی ہو.....؟“

”ہاں! ایسی قبیلے کا سردار مر رہا ہے..... یہاں کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ یوسا بولی۔

تابش کے لیے یہ ساز و آواز پر اسرار تھی۔ فیروز نے اسے بتایا کہ یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہے۔ جب صحرائی ڈاکوؤں کا سردار مر رہا ہوتا ہے تو وہ ماحی دف اور شہنائی بجاتے ہیں۔ وہ ہمارے قریب ہی کہیں خیمہ زن ہیں۔
”اگر کوئی مر رہا ہے تو ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے..... ممکن ہے ہم اسے بچالیں۔“ تابش جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

فیروز اور یوسا نے اسے روکا اور خبردار کیا کہ اگر وہ وہاں گیا تو ڈاکو اپنے سردار کی موت کے انتقام میں اس کی جان لے لیں گے..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قربانی کے طور پر ذبح کر دیں۔ لیکن تابش یہ سوچ کر جا رہا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی دوا سیر نہیں آتی۔ اس لیے معمولی تکلیف سے بھی مر جاتے ہیں۔ اس کے سامان میں ابتدائی طبی امداد کا بیک بھی تھا۔ جس میں ضروری ادویات اور سامان تھا۔ اس نے بیک اٹھایا آواز کی سمت چل پڑا۔

ڈاکوؤں کا قبیلہ ٹیلے کی دوسری طرف خیمہ زن تھا اور پورا قبیلہ جمع تھا۔ انھوں نے آگ جلا رکھی تھی۔ تابش ان کے درمیان چلا گیا۔ اسے دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ صحرائیں اتنی دور ان کے سوا کون آ سکتا تھا۔ انھوں نے اسے کوئی جن بھوت سمجھ لیا۔ دف اور شہنائی خاموش ہو گئی۔

زمین پر ایک اُدھیر عمر آدمی اونٹ کی کھال پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور چہرے پر شہیدانہ ذہیت اور درد کے آثار تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یوحنا نے بتایا گیا کہ چھ روز قبل گوشت کھاتے ہوئے اس کے حلق میں بڑی چلی گئی تھی۔ وہ حلق میں پھنسی ہوئی ہے۔ نکل نہیں سکی۔ تین

میں تمھاری محبت کو تابش کی عقیدت کی طرح پاک رکھنا چاہتی ہوں۔“

فیروز کو غصہ آ گیا۔ اسے روح، پاکیزگی اور عقیدت جیسے الفاظ سے چڑھتی تھی۔ اس نے شراب سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور یوسا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

”میرے ہاتھ سے گلاس لو.... اور پی جاؤ۔“
 ”وہ یوسا مرگئی فیروز.... اگر اپنی محبت کو میرے دل میں زندہ رکھنا چاہتے ہو تو مجھے حکم نہ دو۔ مجھے کھلونا بھٹنا چھوڑ دو۔“

فیروز کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے گلاس آگے بڑھایا اور غضب ناک لہجے میں چلایا:

”احسان فراموش طوائف.... خزانے کے لالچ میں پاکبازی کا تانک کھیل رہی ہے.... اور مجھے ٹھکرارتی ہو۔ تابش کے پاس پارسیا کا جھانسا ہے اور میرے پاس ریوالتور ہے.... خاموشی سے یہ گلاس پی کر خالی کر دو ورنہ....“

جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ صحرا کی سرد چاندنی رات دھماکے سے کانپ اٹھی۔ فیروز کے ہاتھ میں شراب کا گلاس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ شراب ریت میں جذب ہو گئی تھی۔ فیروز تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یوسا اس ناگہانی صورت حال سے بدک کر چیخے ہٹ گئی۔ اسی وقت تابش کی تھکسانہ آواز سنائی دی:

”ریوالتور جھکا لو.... ورنہ دوسری گولی تمھاری کھوپڑی سے پار ہو جائے گی۔“

یہ گولی تابش کے ریوالتور سے ٹکلی تھی۔ فیروز نے اسے دیکھا تو اپنے ریوالتور کو نیچے کر کے تابش کی طرف بڑھا۔ تابش ریوالتور ہاتھ میں لیے وہیں کھڑا رہا:

”آئندہ تم اسے زبردستی شراب پلانے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

فیروز نے کچھ نہ کہا۔ وہ تابش کی طرف بڑھتا رہا قریب جا کر اس نے تابش کے منہ پر اتنی زور سے ٹھونسا جنایا کہ وہ اچھل کر گرا۔ ریوالتور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ فیروز نے اس کا ریوالتور بھی اٹھالیا۔ تابش جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فیروز پھر اس کی طرف بڑھنے لگا۔

یوسا فیروز کو جانتی تھی۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ

گیا تھا۔ اب اسے اپنے مرنے کا دکھ نہیں تھا.... پھر وہ یوسا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب آندھی کے دوران اس نے یوسا کو اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے رکھا تھا۔

یوسا کی یاد نے اس کی نیند اڑادی تو وہ بے تاب سا ہونے لگا۔ جب باوجود سے بڑی تو وہ یوسا کو اپنے پاس بلانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا.... کچھ دور ہی چاندنی میں فیروز اور یوسا بیٹھے دکھائی دینے لگے۔ صحرا کی شفاف چاندنی میں وہ اسے پوری طرح نظر آ رہے تھے۔ تابش نے دیکھا کہ فیروز نے شراب کا گلاس یوسا کی طرف بڑھایا تھا۔ مگر یوسا نے گلاس نہ لیا۔ تابش سر کٹا ہوا ان کے اوپر قریب چلا گیا۔ وہ دونوں آپس میں اتنے ممکن تھے کہ تابش کو نہ دیکھ سکے۔

”مجھے شراب نہ پلاؤ فیروز....“ یوسا بولی ”اب مجھے شراب کی بوسے ہی ملنی آتی ہے۔“

”تم پر جوشہ سوار ہے وہ بہت کچا ہے.... اور بہت جلد اتر جائے گا یوسا....“ فیروز نے کہا۔

”جوشہ روح تک اتر جائے وہ کچا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اب اسی شراب سے بے خود ہو جانے دو جو تابش نے پلا دی ہے۔“

”مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم اس کی معتقد ہو یا محبوبہ؟“ فیروز غصے سے بولا۔

”اگر تم یہ نکتہ مجھ سے قابل ہوتے تو میری طرح تم بھی تابش کے قدموں میں سر رکھ دیتے.... وہ مجھے ایسے مقام پر لے گیا ہے جہاں مرد اور عورت ان معنوں میں محبوب اور محبوب نہیں ہوتے جو تم سمجھتے ہو۔ میں اس کی معتقد ہوں۔ اس نے مجھے روح کی نجات کا راستہ دکھایا ہے۔“

فیروز زیادہ بولنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے شراب کا گلاس رکھ کر یوسا کی کلائی پکڑ لی اور اپنی طرف کھینچ کر بولا

میرے قریب آ جاؤ۔

”نہیں.... اب میں اپنے جسم کو پاک رکھنے کا عہد کر چکی ہوں۔“

”کیا تم یہ بھول گئی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔“

”یہ تو میں ساری عمر نہیں بھول سکیں گی۔ تمہیں میں نے اپنی روح کی گہرائیوں میں جگہ دے رکھی ہے۔ مگر

تابش کو جان سے مار دے گا۔ قریب ہی سامان پڑا تھا۔
یوسا کو پیچھے پڑا دکھائی دیا تو اس نے لپک کر اٹھایا اور پیچھے
سے فیروز کے سر پر دے مارا۔

فیروز چل کر گر پڑا۔ اس کے سر سے خون بہنے
لگا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

تابش نے اس کا زخم دیکھا اور دو اینٹوں والا بیگ
اٹھالایا۔ فیروز بے ہوش تھا۔ تابش اس کی مرہم پٹی کرنے
لگا۔ یوسا سسکیاں لے کر رونے لگی۔

تابش نے اس کی مرہم پٹی کر دی تو بھی یوسا فیروز
کے پاس بیٹھی رہی۔ چنانچہ تابش جا کر خاموشی سے سو گیا۔

یوسا رات بھر فیروز کا سر گود میں لیے بیٹھی رہی۔ سحر
طلوع ہوئی تو فیروز بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنا سر یوسا کی

آغوش میں دیکھا تو اٹھ بیٹھا۔ یوسا کو ڈر تھا کہ فیروز اسے
سزا دے گا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔

”میں نے تمہارے سر پر پیچ مار کر بے ہوش کر دیا
تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ تم تابش کو، یا وہ تمہیں قتل کر دے
گا۔“ یوسا نے بنا پوچھے وضاحت بیان کر دی۔

”وہ کہاں ہے؟“ فیروز چند لمحے توقف کے بعد
بولاً۔

”کیا تم اس سے انتقام لو گے....؟“ یوسا نے
پوچھا۔

”نہیں وہ میری ذمہ داری ہے۔ میں اس سے
انتقام لے کر امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ میں اسے
امانت کے طور پر سحرا میں لایا ہوں۔ اسے کہو سفر کی تیاری
کرے۔“

”تم چل سکو گے؟“ یوسا نے پوچھا۔

”میں رُک بھی تو نہیں سکتا۔ میں اسے سنگ سیاہ
تک جلدی پہنچانا چاہتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔“

تابش بھی بیدار ہو کر ان کے پاس آگیا اور فیروز
کے قریب بیٹھ کر دوستانہ لہجے میں بولا: ”دل برانہ کرو....

میں نے گولی تم پر نہیں چلائی تھی۔ میں تم کو مارنا نہیں چاہتا
تھا۔ میں تو شراب کا گلاس توڑنا چاہتا تھا.... تم میرے دشمن
نہیں بلکہ شراب تمہاری دشمن ہے۔ یہی تمہیں بدی پر

اکساتی ہے۔“

”اگر تم نے پھر کبھی فار کیا تو ہم میں سے ایک
رات کو قافلہ خمیہ زن ہوا تو فیروز نے ان دونوں
سے کوئی بات نہ کی۔ تابش نے اس سے پوچھے بغیر سر کی

ہوش ہو گئی تھی۔

چخروں پر لدی ہوئی پانی کی ٹینکیوں میں سے کچھ پانی اس کے منہ میں ڈالا گیا اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ تابش اُسے اٹھانے لگا تو فیروز نے خاموشی سے اسے پرے کر دیا۔ اس نے خود یوسا کو اٹھا کر خچر پر ڈال دیا۔

اس عمل پر تابش نے فیروز کو گھور کر دیکھا مگر اس نے پروانہ کی اور خچروں کے آگے چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر یوسا کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ خچر سے اترتا چاہتی تھی مگر فیروز نے سختی سے منع کر دیا۔

ایک شام وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ٹیلے اور کھائیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور وسیع صحرائی سطح آگے سے آؤچی ہو رہی تھی۔ قافلے نے رات کے لیے وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ بہت دنوں سے انھیں صحرائیں پانی نہیں ملا تھا۔ وہ خچروں پر لدی ٹینکیوں سے پانی پیتے رہے تھے۔ اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پانی جلدی ختم ہو جائے گا۔

”سنو تابش! میں تمہیں سنگ سیاہ کے ٹیلوں اور کھائیوں سے گزرا کر لے آیا ہوں۔ یہ آخری حد ہے۔ اس سے آگے موت کے سوا کچھ نہیں۔ میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ سنگ سیاہ کے کھنڈرات سے واقف ہو۔۔۔۔۔ وہ کھنڈرات کہاں ہیں؟ تابش نے پوچھا۔“ ان کے متعلق میں نے صرف سنا تھا۔ میں اُس امید پر آیا تھا کہ شاید کھنڈرات بھی نظر آجائیں۔ ہم ان ٹیلوں کے علاقے کو ہی سنگ سیاہ کہتے ہیں۔“

”تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔“ تابش بھڑک اٹھا۔ ”تم مجھے غلط جگہ لے آئے ہو۔ تم جانتے ہو کہ کھنڈر کہاں ہیں۔ تم مجھے صحرائیں ختم کر کے خزانہ نکالنا چاہتے ہو۔ آگے ایک بلند پہاڑ ہوتا چاہیے تھا۔“

”صحرا کو تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔“ فیروز نے غصہ پی کر کہا ”یہاں سے آگے پانی کی ایک بوند نہیں ملے گی۔ اپنے پاس پانی کا جو ذخیرہ رہ گیا ہے۔ وہ مشکل چند گھنٹوں کے لیے کافی ہے۔ یہیں سے واپس ہو جائیں تو ہم کہیں سے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ آگے گئے تو یہ پانی جو

پٹی کھولی۔ زخم دیکھا اور صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ فیروز نے الگ جا کر بستر بچھالیا۔ اس نے یوسا کو اپنے پاس نہیں بلایا تھا۔ یوسا بھی خاموش تھی۔ تابش نے چاندنی میں دیکھا۔ یوسا کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ صورت حال سمجھ گیا تھا چنانچہ کروت بدل کر آنکھیں موند لیں۔

اس کے سوتے ہی یوسا اٹھ کر فیروز کے پاس چلی گئی، وہ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس رات نہ فیروز نے خود شراب پی نہ یوسا کو پلائی۔

اگلا مرحلہ شروع ہوا تو فیروز نے خبردار کیا کہ آگے سفر بہت خطرناک ہوگا۔ ذرا سی بے احتیاطی جان لے سکتی ہے۔ صحرائی لومڑیاں بھی ہوں گی اور سانپ بھی۔

سفر اس سے نہیں زیادہ خطرناک تھا جو فیروز نے بتایا تھا۔ ریت کم ہو گئی تھی۔ پتھر کی طرح سخت مٹی بھی اور مٹی کے ٹیلے نہیں کہیں خشک سے پودے نظر آتے تھے۔ یہ فیروز ہی تھا جو سیاہ ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں سے راستہ بناتا چلا جا رہا تھا۔ یہ ایسی بھول بھلیاں تھیں جن میں سے کسی انجان شخص کا بچ بچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ صحرائی لومڑیوں کی کثرت تھی۔ اگر کوئی تھک ہار کر گر پڑتا تو لومڑیاں مرنے سے پہلے ہی اسے کھا جاتیں۔ وہاں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ قافلہ ٹیلوں کی پر بچ دنیا میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔

رات آئی اور گزر گئی۔ تابش کو ایسا خطر محسوس ہوا جیسے ٹیلوں میں ہی گھومتے اور چلتے عمر گزر جائے گی۔ مگر وہ اس علاقے سے بھی نکل گئے۔ آگے آفقی تک کھلا میدان تھا۔ دوراتوں بعد میدان ختم ہو گیا اور وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں گہری کھائیاں تھیں۔ یہ پہاڑیاں نہیں، صحرائیں گہری کھائیاں تھیں۔ بعض راستے تنگ تھے کہ ذرا سا بھٹلنے سے کھائی میں گرنے کا خطرہ تھا۔ یہ ایک بھیانک اور خوفناک جگہ تھی۔

جب وہ کھائیوں کی دنیا سے نکلے تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ آنکھیں لال سرخ تھیں۔ اور ان میں جلن پیدا ہو گئی تھی۔ خشکی سے ہونٹ ہونٹ بھٹ گئے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ جسموں میں نمی نہ رہی تھی۔

ایک جگہ پہنچ کر یوسا گر گئی۔ اس کے گھٹنے زمین سے جا لگے اور وہ لڑھک گئی۔ تابش اور فیروز نے دیکھا وہ بے

ٹینکی میں رہ گیا ہے صحرا کی گرمی سے ہی ٹینکی میں خشک ہو جائے گا۔ اگر مرنا چاہتے ہو تو آگے چلے جاؤ، میں نہیں جاؤں گا۔“
تابش نے نقشہ کھول لیا بولا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

”فیروز ہم غلط جگہ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو نقشے پر نیلے اور کھانیاں۔ ہم منزل کے قریب ہیں۔ یہاں سے چند میل آگے ایک خشک دریا ہونا چاہیے۔ اس سے آگے بہت دور ایک اونچا پہاڑ ہوگا۔ دریا اور پہاڑوں کے درمیان کم بلند پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس میں وہ کھنڈر ہیں جہاں ہمیں جانا ہے۔“

”وہاں تک صرف تھیں جاننا ہو گا.... میں نہیں جاؤں گا۔“ فیروز نے کورا جواب دیا۔

”ہم منزل کے قریب ہیں۔ میرے باپ کی کتاب اور نقشے جھوٹ نہیں بول سکتے۔“ تابش نے کہا۔

رات بہت دیر تک جھگڑا چلتا رہا۔ فیروز فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ آگے نہیں جائے گا۔ صبح طلوع ہوئی تو فیروز نے تابش سے اپنی اجرت کا مطالبہ کر دیا کہ وہ آگے نہیں جائے گا۔ یوسا نے فیروز سے کہا:

”یہاں تک تم اجرت کی خاطر آئے تھے۔ آج کا دن میری خاطر آگے چلے چلو۔“

”میں تمہاری خاطر ہی تو آگے نہیں جا رہا۔“ فیروز نے یوسا کو سمجھاتے ہوئے کہا ”اگر تم نہ ہو میں تو تابش کو میں بہت دور آگے تک لے جاتا۔ میں تمہیں اذیت ناک اور بے مقصد موت سے بچانا چاہتا ہوں۔“

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو خجروں نے کان کھڑے ہو گئے۔ فیروز صحرا کے جانوروں کی زبان سمجھتا تھا۔ یہ خبر اسی نسل سے تھے جو میلوں دور سے پانی کی بو پالیتے تھے۔ ہوا اُدھر سے ہی آرہی تھی جدھر تابش کو جانا تھا۔ پھر خجری سے دوڑ بڑے۔

”آگے کہیں کھلا پانی ہے.... ہم سب خوش قسمت ہیں، تم یہیں ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔ وہ خجروں کے پیچھے چلا گیا۔ آگے صحرا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ تابش اور یوسا بھی ان کے پیچھے چل دیے۔

خجروں دور آگے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس سے

ظاہر ہوتا تھا کہ جہاں بلندی ختم ہوئی وہاں سے آگے اترائی شروع ہو گئی تھی۔ آگے آگے فیروز جبکہ پیچھے تابش اور یوسا تھے۔ ایک گھنٹے بعد فیروز اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے خجروں غائب ہوئے تھے۔

اسے ایسا منظر نظر آیا جو خواب اور سراب معلوم ہو رہا تھا۔ وہ سراب سے اچھی طرح واقف تھا۔ روز راستے میں اس قافلے کو کئی سراب نظر آئے تھے۔ اگر فیروز ساتھ نہ ہوتا تو تابش کی سراب کے تعاقب میں ہی جان دے دیتا۔ فیروز اسے سراب کے دھوکے سے بچاتا لے گیا تھا۔ مگر فیروز کو سامنے جو منظر نظر آیا تھا وہ اس سے پہلے اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے متعلق بھی کسی سے نہیں سنا تھا۔

اسے وہاں ایک خشک دریا نظر آ رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ کسی زمانے میں بہتا دریا تھا۔ تابش کے مطابق اس دریا کو پانی سے محروم ہوئے دواڑ حانی صدیاں گزر گئی تھیں۔ دریا کے پار میلوں دور پہاڑ نظر آرہے تھے۔ پہاڑوں کا سلسلہ اونچا تھا، لمبا نہیں پہاڑوں کے درمیان کم اونچی پہاڑیاں تھیں۔ چٹانیں تھیں او یہ سلسلہ دریا سے تھوڑی دور ختم ہو گیا تھا۔ ان چٹانوں کے دامن میں کھنڈروں کے آثار نظر آرہے تھے۔ یہ سراب نہیں تھا اور پہاڑ فیروز کے لیے عجوبہ نہیں تھے۔ صحرائے عظیم میں چند اور جگہوں پر ایسے پہاڑ تھے۔ دو تین تو ایسے تھے جن پر برف جمی رہتی تھی مگر ان کے نیچے خشک اور بے رحم صحرا تھا۔ برف اُپر ہی اوپر پھیل کر ہوا میں تحلیل ہوئی اور راتوں کو جمی رہتی تھی۔ مگر یہ پہاڑ فیروز کی معلومات میں شامل نہیں تھا۔

اس نے دیکھا کہ خجروں خشک دریا میں اتر گئے اور اگلی ٹانگیں دوہری کر کے پانی پینے لگے۔ تابش اور یوسا بھی اس سے جا ملے۔ تینوں نے نیچے جا کر دیکھا، دریا خشک تو تھا لیکن ایک جگہ سے چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ جس کا پانی ارد گرد پھیل کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ تابش خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ خجروں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور واپس آ گئے۔ ٹینکیوں میں پانی بھرنے کے بعد قافلہ کھنڈروں کی طرف روانہ ہو گیا۔

شام تک وہ کھنڈروں کے قریب پہنچ گئے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تابش نے رات کے وقت کھنڈروں میں

آنچل کی چاب سے ایک ماہنامہ

ماہنامہ حجاب کرچی

شائع ہوگیا ہے

ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریذہ مگر بھرکی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف "حجاب" آج ہی ہا کر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

نوبل سمورت ایشیائی نوبل
اور انعامات برائے مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی
صورت میں

021-35620771/2

0300-8264242

جاننا مناسب نہ سمجھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہاں کیسے کیسے
خفیات ہوں گے۔ ان کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس رات بھی فیروز پوسا سے دور رہا۔ پوسا نے بستر
تابش کے قریب ہی پچھالیا۔ لیکن تابش نے اس کے ساتھ
کوئی بات نہ کی۔ وہ منزل پر پہنچ گیا تھا اور اس سوچ میں
غرق تھا کہ خزانہ کس طرح ڈھونڈا جائے۔ اس نے وہ
دستاویز کھول لیں جو باپ اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ تاریخ
کی روشنی میں وہ ان کا مطالعہ کرتا رہا۔

صبح طلوع ہوئی تو وہ کھنڈرات میں داخل ہو گئے۔
خجروں سے سامان اتار لیا گیا۔ فیروز کو اس کی مہم سے کوئی
دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ گاڑی کی حیثیت سے
نا کام نہیں رہا تھا۔ تابش اور پوسا کھنڈروں میں گھومنے
پھرنے لگے۔ کہیں ایک دیوار کھڑی تھی اور کہیں چار
دیواریں کھڑی تھیں مگر چھت نیچے آ رہی تھی۔

یہ مختلف قسم کی عمارتیں تھیں۔ جن کی ساخت بتا رہی
تھیں کہ وہ کسی شاہی خاندان کے محالات تھے۔ یہ دو ہزار
سال پرانی تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ تابش اور پوسا غلام
گردشوں میں گھومنے لگے جو آگے جا کر تاریک ہوئی چلی جا
رہی تھیں۔ ان کے سروں پر بڑی زور سے کوئی پرندہ
پھڑپھڑایا تو ڈر گئے۔

یہ ایک بہت بڑا چمکاؤ تھا جو کہیں سے نکلا اور وہیں
غائب ہو گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہاں ایک دو چمکاؤ
دکھائی دے جاتے تھے۔ تابش اور پوسا ایک کمرے کے
دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اچانک اندر
سے ایسا شور اٹھا جیسے بے شمار بچے چیخ چلا رہے ہوں۔ پھر
کمرے کے اندر سے سیاہ بادل سا اٹھا اور دروازے کی
طرف بڑھا۔ تابش نے پوسا کو سمجھ کر نیچے بٹھالیا اور خود بھی
بیٹھ گیا۔ یہ چمکاؤں کا غول تھا جو ان کے پاؤں کی آہٹ
اور باتوں سے بدک کر اڑا تھا۔ اگر تابش اور پوسا بیٹھ نہ
جاتے تو چمکاؤ ان کے چہروں سے گوشت اڑا کر لے
جاتے۔

یہ غول کمرے سے نکل گیا تھا۔ غلام گردش میں ان
کے پروں کی آواز آندھی کے پھیڑوں کی طرح سنائی دی۔
تابش نے اندر جھانکا۔ چمکاؤں سے چھت کی لکڑی کے ساتھ
الٹے لٹکتے جا رہے تھے۔ ان کا شور کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب

وہ آگے بڑھنے لگے۔

کھنڈرات بہت ہیبت ناک تھے لیکن تابش کو ان میں ایک گونہ گو حسن اور وقار نظر آ رہا تھا۔ یوسا بی الویج محسوس کرنے لگی جیسے وہ لوگ جو صدیوں پہلے یہاں رہتے تھے یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں یا ان کی روئیں یہیں موجود ہیں.... ہو سکتا ہے چمکا ڈی ان کی روئیں ہوں۔

وہ لڑکی تھی ڈرگنی اور تابش کے ساتھ لگ گئی۔ تابش نے ایک بازو اس کے گرد لپیٹ دیا یوسا کا منہ اس کے سینے سے جا لگا۔ تابش ایک ہاتھ سے اس کا گال سہلانے لگا اور اپنے منہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ وہ منزل پر پہنچ جانے کی خوشی میں دیوانہ ہوا چلا جا رہا تھا۔ یوسا کے گالوں اور بالوں نے اس پر نشے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ یوسا کے لیے مرد کے جسم کا لمس کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ لیکن تابش کے بازوؤں کی پناہ میں وہ یوں قرار محسوس کرنے لگی جیسے ہر آفت سے پناہ مل گئی ہو۔

وہ اتنی جلدی تابش سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ ڈری ہوئی، راہ گم کردہ لڑکی تھی اور اپنے مستقبل کے متعلق بھی ابھی اسے یقین نہیں.... ایک چاک تابش کو فرس پر شوں شوں کی آواز سنائی دی اور کوئی چیز بڑی تیزی سے اس کے قریب سے گزری۔ اس نے بدک کر دیکھا ایک صحرائی سانپ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ سانپ دیوار کے شکاف میں غائب ہو گیا۔ یوسا بہت ڈر گئی تھی۔ تابش اسے غلام گرد شوں کی تاریکی سے نکال لے گیا۔ آگے وسیع صحرائے ویاں ایک تالاب تھا جس میں کافی پانی موجود تھا۔ یقیناً یہ پانی بارشوں سے جمع ہوا تھا۔

یہ تھکن کھنڈرات کی سیر تھی۔ تابش نے ابھی خزانے کی تلاش شروع نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک دن آرام کر کے اگلے روز دستاویزات کی رہنمائی لے کر خزانے کا سراغ لگایا جائے۔ فیروز کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باقی دن انھوں نے آرام کیا۔ رات کو فیروز ان سے الگ سویا۔ تابش اور یوسا کھٹے رہے۔ ایک بار یوسا فیروز کے پاس گئی تھی مگر فیروز نے اس کے ساتھ پہلی سی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ شراب پی رہا تھا۔ اس نے یوسا کو شراب کی پیش کش نہ کی۔ یوسا فیروز کے اس سلوک سے دو حصوں میں بٹ گئی مگر چپ رہی۔

اگلے روز تابش نے کاغذات سنبھالے اور اکیلا کھنڈروں میں چلا گیا۔ اس کے پاس کھنڈروں کا نقشہ تھا۔ جس کی وضاحت کے لیے تحریریں بھی تھیں۔ اس نے یوسا سے کہا تھا کہ اس کا کام خطرناک ہے۔ وہ ڈرئی رہے گی اس لیے کھنڈرات میں نہ جائے۔ فیروز کو وہ ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔

یوسا، فیروز کے پاس رہی اور اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اسے تو تھا کہ فیروز اس سے ناراض ہے لیکن فیروز نے اس کا وہم دور کر دیا:

”یوسا مجھے میری دنیا میں رہنے دو۔ تمہیں تابش کی دنیا اس آجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں خوش ہوں کہ تم نے شراب چھوڑ دی اور تمہاری روح پاک ہوگئی۔ میں تمہیں ناپاک نہیں کروں گا۔ اگر تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں تمہارے لیے اپنی جان بھی دے دوں گا۔“

یوسا جذبات میں ڈوب گئی۔ اسے فیروز اپنی طرح مظلوم نظر آیا۔ بے تاب ہو کر اس نے سر فیروز کے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔ فیروز اس کے پال سہلانے لگا۔ سورج سر پر آیا اور آگے چلا گیا۔ فیروز نے یوسا سے کہا:

”یہ پاگل جانے کہاں غائب ہو گیا ہے، اکیلا چلا گیا ہے۔ چلو اسے دیکھتے ہیں کہیں اسے کسی سانپ نے نہ ڈس لیا ہو۔ یہ جگہ بہت ہی خطرناک ہے۔“

فیروز نے ریو اور ہاتھ میں لیا اور دونوں تابش کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ وہ کردوں میں گئے، جھگی ہوئی چھتوں تلے جھانکا۔ غلام گرد شوں میں دیکھا۔ تالاب والے صحرائے گز رکھ دوسرے کھنڈروں میں چلے گئے۔ مگر تابش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ ایک جگہ فیروز نے تابش کو پکارا مگر کھنڈروں میں اس کی آواز گونج کر آئی۔ اندر جا کر آوازیں دیں تو چچا ڈوڈو کے غول اڑنے لگے۔ وہ ایک کمرے کے قریب گئے تو انھیں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی سسکیاں لے رہا ہو۔ یہ کسی انسان کی آواز تھی۔

”شاید کوئی بدروح رورہی ہے....“
یوسا ڈر کر فیروز کے پیچھے ہو گئی۔ فیروز دبے پاؤں کمرے کے دروازے تک گیا۔ کمرہ روشن تھا کیونکہ ایک جگہ سے چھت گری ہوئی تھی۔

فیروز نے دیکھا کہ تابش فرش پر بیٹھا سر ہاتھوں میں تھامے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس کے سامنے انسانی ہڈیوں کا ایک مکمل ڈھانچہ پڑا تھا۔ کوئی ہڈی اپنی جگہ سے ہلی نہیں تھی۔ بنجر کے پاس ایک کتاب پڑی تھی۔ فیروز تیز قدم اٹھاتا تابش کے پاس گیا اور اس کا سر اُپر اٹھا کر پوچھا:

”کیا ہوا... رو کیوں رہے ہو؟“

”یہ میرے باپ کی لاش ہے.... کتاب پر اس کا نام بھی لکھا ہے۔“

فیروز جراثیم پیش تھا۔ اس نے بنجر کو غور سے دیکھا۔ کھوپڑی کے ماتھے میں ایک سوراخ تھا اور کھوپڑی کے اندر ریو الور کی گولی کا اگلا حصہ پڑا تھا۔ اسے سامنے سے گولی ماری گئی ہے۔

یہ ایک فراخ کمرہ تھا۔ سامنے دیوار سے ذرا ہٹ کر ایسے ہی دو انسانی بنجر پڑے تھے۔ وہ ہنگیر تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مرتے وقت بغل گیر ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک ریو الور پڑا تھا۔ فیروز نے ہڈیوں کے ان ڈھانچوں کو دیکھا۔ ایک بنجر عورت کا تھا کہ اس کی گردن کی ہڈی کے گرد سونے کا ہار تھا۔ دو انگلیوں کی ہڈیوں میں زنانہ انگوٹھیاں تھیں۔ کھوپڑی کے قریب لمبے لمبے بال پڑے تھے۔ قریب ہی زنانہ پرس تھا جسے کیڑے کھوڑوں نے کٹی جگہ سے کھالیا تھا۔ مردانہ بنجر کی پسلیوں میں بنجر پھنسا ہوا تھا۔ عورت کے بنجر سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا۔ فیروز نے پرس اٹھایا تو اس میں چند ایک چیزیں گریں ان میں لپ اسٹک اور لفٹ پاؤڈر، کچھ سکے اور چھوٹا سا آئینہ تھا۔

تابش نے فیروز کے ہاتھ سے پرس لے کر کھولا تو ایک لفافہ برآمد ہوا جس پر اس عورت کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ تابش نے تحریر فوراً پہچان لی۔ یہ اس کے باپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ لفافے میں ایک خط تھا۔ تابش کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کے باپ کے تعلقات کسی بری عورت کے ساتھ تھے.... اس نے اپنے آپ کو یہ فریب دیا کہ جس طرح وہ یوسا کو اپنے ساتھ لایا ہے اسی طرح اس کا باپ بھی کسی طوائف کو اسی ارادے سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوگا جس ارادے سے وہ یوسا کو لایا ہے۔ اس کا باپ

پارسا اور تارک الدنیا آدمی تھا۔ اس نے تابش کو عورت سے دور رکھا تھا۔ تابش سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا باپ عیاشی کے لیے اس عورت کو ساتھ لایا ہوگا۔

تابش نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا تو اس کے باپ کی اصلیت سامنے آگئی۔ تابش نے خط اوپنی آواز سے پڑھنا شروع کر دیا جسے باقی لوگوں نے بھی سنا۔ کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ یہ خط اس کے باپ نے ہی عورت کو لکھا تھا۔

خط میں صرف محبت کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ قش اور عریاں فقرے بھی شامل تھے جن سے صاف پتا چلتا تھا کہ ان دونوں کے ناجائز مراسم تھے۔ خط سے پتا چلا کہ یہ عورت مصر کی رہنے والی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ملاقات کہاں ہوئی تھی.... البتہ خط میں تابش کے باپ ڈاکٹر دلاور نے جذباتی باتوں کے بعد لکھا تھا کہ فلاں تاریخ کو مجھے رائل ہوٹل میں ملو۔ میں تمہیں خزانے کی تلاش میں ساتھ لے جاؤں گا۔ پھر میں تمہارے ساتھ شادی کر کے تمہیں ملکہ بنادوں گا۔

تابش کو باپ کی نصیحتیں اور تعلیم و تربیت یاد آنے لگی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں واپس نہ آسکوں تو تم خزانے کی تلاش میں نکل جانا۔ خزانہ مل جائے تو اسے لوگوں کی فلاح کے لیے خرچ کر دینا۔

تابش سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یوسا بھی سشدر کھڑی تھی۔ تابش نے روتے ہوئے کہا:

”اگر وہ خود عیاش تھا تو مجھے پابندیوں میں کیوں جکڑ دیا.... میرا دماغ پکڑا رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھاؤ۔“

فیروز کی عمر پوئیس اور کھوجیوں سے آنکھ مچولی کھیلنے گزری تھی۔ اس نے تابش کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

”باپ کے گناہوں پر تم کیوں روتے ہو.... وہ مر گیا ہے، جو کچھ بھی تھا خدا کے پاس چلا گیا۔ اپنے گناہوں کا جواب وہ خود دے گا۔ اس کے گناہوں کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوگی۔ اس میں شک نہیں رہا کہ وہ اس عورت کو عیاشی کے لیے ساتھ لایا تھا۔ اب غور سے سنو کہ یہ تینوں مرے کیسے.... میرے اندازے کے مطابق یہ آدمی تمہارے باپ کا گائیڈ تھا جس طرح میں تمہارا گائیڈ ہوں۔ یہ عورت یوسا کی طرح گائیڈ کی طوائف دوست تھی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی گائیڈ کو جانتی ہو۔ یہاں آکر وہ تمہارے باپ کی جگہ اس گائیڈ کو چاہئے لگی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عورت نے اور گائیڈ نے تمہارے باپ کو اس ارادے سے قتل کرنے کی کوشش کی ہو کہ وہ خزانے پر قبضہ کر لیں گے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ خزانہ کہاں ہے؟“

فیروز نے سراغرساں کی طرح ادھر ادھر دیکھا ”پہلے تمہارے باپ نے اس آدمی کے سینے میں خنجر مارا تھا۔ اس کے جواب میں آدمی یا عورت نے تمہارے باپ کو گولی سے مار ڈالا.... اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے باپ کے پاس ریوالتور نہیں تھا۔ ریوالتور اس آدمی اور عورت کی لاشوں کے قریب پڑا ہے اور گولی تمہارے باپ کی کھوپڑی میں لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے باپ نے دوئل کیے ہیں اس عورت کو بھی خنجر سے ہلاک کیا گیا ہو گا.... ہو سکتا ہے عورت کے پیٹ میں خنجر لگا ہو۔ پھر اس نے آدمی کے سینے میں خنجر مارا ہو۔ اس آدمی نے ریوالتور کی گولی فائر کی جو تمہارے باپ کی کھوپڑی میں داخل ہوئی اور خنجر اس آدمی کے سینے میں ہی رہا.... تمہارا باپ کو تو فوراً مر گیا ہو گا لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے، وہ فوراً نہیں مرے۔ خنجر کے دھم سے فوراً موت واقع نہیں ہوتی۔ انھیں موت کا ریتین ہو گیا تو وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے.... ذرا دیکھو تو اس خونی ڈرامے کی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جاتی ہیں.... سنو میرے دوست! تم ایک عورت کو پا کباز بنانے کے لیے ساتھ لائے ہو، مگر تمہارا باپ ایک داشتہ کو ساتھ لایا تھا۔ تمہارا باپ جو تھیں پارسانا گیا خود بدکار آدمی تھا۔

تابش کے دل میں درد کی ٹینس اٹھنے لگیں۔ اسے اپنے باپ کا ضمیر ہڈیوں کے خنجر میں جیسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تابش کے اندر بھیانک کشمکش شروع ہوئی۔ اس نے فیروز کو اور پھر یوسا کو عجیب نظروں سے دیکھا تو ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ہڈیوں کے ان تینوں ڈھانچوں نے جو خونی ڈرامہ کھیلا تھا اس کے بھی یہی تین کردار تھے۔ ایک پارسا، ایک جرائم پیشہ گائیڈ اور ایک طوائف۔

اس کے ذہن میں یہ سوال بیدار ہوا کہ کیا ان

کھنڈروں میں یہی ڈرامہ پھر کھیلا جائے گا؟ اس کے بھی یہی تین کردار تھے۔ کیا یہ جرائم پیشہ گائیڈ اور طوائف اسے قتل کر دیں گے۔ تابش فرش پر بیٹھا بچوں کی طرح رونے لگا۔

☆-

تابش کو روتا دیکھ کر فیروز نے یوسا کی طرف گردن گھمائی۔ یوسا نے جب اس کی طرف دیکھا تو فیروز کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نظر آئی جو اس نے پہلے بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے نظریں ہٹا کر تابش کی طرف دیکھنے لگی۔

یوسا کے دل میں درد سا اٹھا اس نے تابش کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ فیروز انھیں الگ کھڑا دیکھ رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ شوخ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ بھٹکا ہوا کون ہے؟ میں اور یوسا.... یا تابش۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اس پارسا سے تو ہم اچھے ہیں جو گناہ کرتے ہیں اور چھپاتے نہیں۔ اپنے آپ کو گناہ گار اور مجرم ہی سمجھتے ہیں۔ اسے تابش پر ترس آ رہا تھا اور یوسا پر بھی۔ اس لیے کہ یہ عصمت فروش لڑکی جسے اپنا رہنما سمجھتی تھی وہ خود بھٹک گیا تھا۔

مگر یوسا تابش کو بھٹکا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔ رات کے وقت کھنڈروں میں جہاں انھوں نے سونے کا انتظام کیا یوسا تابش کے پاس بیٹھی تھی۔ تابش کم تھم تھم۔ اس پر خاموشی طاری تھی.... فیروز دانستہ طور پر ان سے الگ رہا۔ رات کو یوسا نے تابش کا سراپے سینے سے لگا کر بڑے پیار سے کہا:

”گناہ گار تمہارا باپ تھا، تم نہیں.... فیروز نے بھی تمھیں یہی کہا کہ باپ کے گناہوں پر مت روؤ۔ اپنے گناہوں کی سزا وہ خود بخٹکتے گا۔ وہ اس خزانے سے ایک بدکار عورت کو ملکہ بنانا چاہتا تھا جب کہ تم یہ خزانہ ڈھونڈ کر نیک کاموں پر خرچ کرنا چاہتے ہو۔“

”نیک کاموں پر.... تم مجھے کیسے یقین دلا سکتی ہو کہ دنیا میں نیکی کا وجود ہے۔ میں اپنے باپ کو نیکی کا مجسمہ سمجھتا تھا۔ تم نے اسے دیکھ لیا ہے۔ میرے ذہن میں دوسرے بھر گئے ہیں، شکوک نے مجھے اندھا کر دیا ہے۔ میری روح بھی اندھی ہوئی ہے۔“

بڑھنے لگا۔ فیروز نے گلاس آگے کر دیا۔ تابش کے کانپتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں نے گلاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرے لمحے گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں شراب پی لی اور گلاس فیروز کی طرف بڑھا کر بولا:

”اور ڈالو.....“

فیروز نے اب پہلے سے زیادہ شراب گلاس میں ڈالی تو تابش نے یہ بھی حلق میں انڈیل لی۔ اس نے خالی گلاس ہوا میں اچھال کر ہتھکڑیا۔ یہ ہڈیانی ہتھکڑیا۔ یوسا دہشت کے مارے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے سامنے یارسانی کا بت ٹوٹ گیا تھا۔ تابش نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ مگر اب پہلی بار ہی اتنی زیادہ پی گیا کہ ہڈیاں بکتے بکتے بے ہوش ہو گیا۔

یوسا کے لیے یہ صدمہ معمولی نہیں تھا۔ اسے گناہوں کی ہستی سے نکالنے والا خود گناہوں کے راستے پر چل پڑا تھا..... فیروز یوسا کو اپنے پاس لے گیا اور بولا:

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ سحر کی ڈاکوؤں کے متعلق میں قسم کھا سکتا ہوں لیکن تابش کے متعلق یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص کسی وقت بدل جائے۔“

”تم نے تابش کو پہلا پھسلا کر شراب پلا دی۔ اب میں اسے نہیں پینے دوں گی۔ وہ سیدھا سادا آدمی تھا۔ وہ باتوں میں آگیا ہے۔“ یوسا دھاڑی تو فیروز نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے لیٹ گیا۔

☆

صبح تابش کی آنکھ کھلی تو یوسا اور فیروز سو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے خزانے کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ وہ باپ کی وصیت، اس کی کتاب اور نقشہ اٹھائے کھنڈروں کی بھول بھلیوں میں چلا گیا تھا۔

وہاں کمرے ہی کمرے تھے۔ بعض کمروں کے دروازے کی جگہ بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے جو کمرے کھلے تھے وہ خوفناک غاروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ جانے کیسی کیسی چیزوں کے رینگے اور اڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تابش نقشے کی مدد سے چلا جا رہا تھا۔

گھوم پھر کر وہ ایک کمرے کے آگے ٹک گیا۔

”تم تو مجھے سیدھی راہ پلے جا رہے تھے..... میں اس کو سیدھی راہ سمجھتی ہوں جو تم نے مجھے دکھائی۔“

”ہاں میں اسی کو سیدھی راہ سمجھتا رہا ہوں۔ مگر یہ راہ مجھے میرے باپ نے دکھائی تھی۔ اس لیے میں اب یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہی راہ ہے جو مجھے منزل تک لے جائے گی۔“ تابش کی آواز غم سے بوجھل تھی۔ ”میری ماں کے مرنے کے بعد اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے مجھے عورت سے دور رکھا مگر خود اسی رنگینوں کا دلدادہ رہا۔ کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“

فیروز ہلکا ہلکا ان کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ تابش کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا بستر قریب ہی تھا اور کھانے پینے کا سامان بھی پڑا تھا۔ فیروز نے سامان میں سے شراب کی بوتل نکالی اور دو کے بجائے تین گلاس رکھ کر ان میں شراب ڈالنے لگا۔

ایک گلاس یوسا کو دیا لیکن اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے..... فیروز نے وہی گلاس تابش کے آگے کر دیا۔

یوسا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ یوں خوف سے کانپ اٹھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اسے یقین تھا کہ تابش گلاس توڑ دے گا..... چند ہی دن پہلے سفر کے دوران ایک رات تابش نے فیروز کے ہاتھ میں شراب کا گلاس دیکھ کر یوسا اور سے فائر کر دیا تھا..... آج فیروز نے شراب کا گلاس تابش کے سامنے کر دیا تھا اور تابش خالی نظروں سے گلاس کو دیکھ رہا تھا۔

”میں تینوں لاشوں کو ایک گڑھے میں دفن کر آیا ہوں۔ فیروز نے دانش سے کہا ”میں تمہاری جذباتی حالت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن تمہاری سی پی لو..... دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“ تابش کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کی نظریں شراب پر جمی ہوئی تھیں۔

”تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو شراب کے سوا کوئی نہیں جوڑ سکتا۔“ فیروز نے کہا تو یوسا دم بخود اسے دیکھنے لگی۔

تابش کو شراب کی بو سے نفرت تھی۔ اس کا ہاتھ کانپا..... پھر یہ ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا اور گلاس کی طرف

نقشے پر بڑی غور سے نشان لکیریں اور اشارے دیکھے۔ ان کے مطابق یہی کمرہ تھا جس میں خزانہ ہونا چاہیے تھا۔ کتاب بھی اسی کمرے کی نشاندہی کر رہی تھی اور نقشہ بھی تائید کر رہا تھا۔

دروازہ ایک بھاری پتھر سے بند تھا۔ یہ پتھر ہی اس کا کوڑا تھا۔ اس نے پتھر کو ہاتھ لگایا۔ وہ اکیلا اسے نہیں ہلا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ واپس دوڑ پڑا۔ اس کے قدموں کی آوازوں سے گونوں کھدروں سے اندھے چکاؤ لکل رہے تھے اور کھنڈروں میں طوفان آ گیا تھا۔ کئی چکاؤ اس کے چہرے سے ٹکرائے۔ وہ سر نیچے کیے دوڑا گیا۔

یوسا اور فیروز وہیں بیٹھے تھے جہاں رات کو سوئے تھے۔ انھیں بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر تابش کی چیخ دیکر سنائی دینے لگی۔

وہ ان دونوں کو پکار رہا تھا۔ فیروز یہ سمجھ کر کہ تابش کسی خطرے میں ہے ریوالتور نکال کر دوڑ پڑا۔ تابش سامنے آ گیا، وہ چلا رہا تھا۔ میں نے وہ کمرہ ڈھونڈ لیا جس میں خزانہ ہے تم دونوں میرے ساتھ چلو۔“

یوسا اور فیروز اس کے ساتھ چلے گئے۔ تاریک اور بلے سے اٹے ہوئے راستوں، گلیوں اور برآمدوں سے گزرتے وہ اس کمرے تک پہنچے۔ تابش نے انھیں کہا کہ یہ پتھر ہٹانے میں مدد کرو۔ تینوں نے پورا زور لگایا پتھر اتنا سارک گیا کہ ایک آدمی آسانی سے اندر جاسکے۔

تابش جلدی سے اندر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں نارنج تھی۔ یوسا اور فیروز ابھی باہر تھے کہ اندر سے دو ناگ باہر آئے اور ایک سوراخ میں غائب ہو گئے۔ کمرے کے اندر ابھی اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ یوسا کو تابش کی فکر ہو رہی تھی وہ اندر جانے لگتی تو فیروز نے اسے پکڑ لیا:

”اس خطی کے پیچھے نہ مرو.... ذرا دیر یہیں ٹھہرو۔“

”فیروز....“ اندر سے تابش کی آواز آئی۔ ”اندر آ جاؤ، یہ دیکھو میرے باپ کا ایک اور فریب۔“

فیروز اور یوسا اندر گئے تو کمرہ تاریک تھا۔ تابش کے ہاتھ میں نارنج تھی۔ اس کی روشنی میں کمرے کے وسط میں لوہے کے دو کھلے ہوئے بکس نظر آ رہے تھے۔ تابش ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس نے فیروز اور یوسا سے کہا:

”ان بکسوں میں سے خزانہ نکال لیا گیا ہے۔“ انھوں نے نارنج کی روشنی میں دیکھا تو ایک بکس میں سونے کی صرف ایک ڈلی بڑی تھی دو ہیرے فرش پر پڑے تھے، دوسرا بکس بالکل خالی تھا۔

دیکھ لیا تم نے...“ تابش نے دانت پیس کر کہا۔“ میرے باپ کا ایک اور فریب۔ اس باپ نے خزانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے چھپائے رکھنے کے لیے اس نے خزانہ کہیں اور رکھ دیا ہوگا۔ بد بخت معلوم نہیں کہاں چھپا کر مر گیا ہے۔ یہاں خزانہ ضرور تھا۔ اس نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ میں خزانہ ڈھونڈ کر دم لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

یوسا اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر فیروز نے اسے روک لیا:

”یہ اب بالکل بالکل ہو گیا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں خود کو نقصان نہ پہنچالے۔ مجھے اس کی اور تمھاری حفاظت کرنا ہوگی۔ میں اسے تین چار دن اور دیکھوں گا.... اس کا دماغ یوں ہی بگڑتا چلا گیا تو میں اسے واپس چلنے کو کہوں گا۔ اگر یہ نہ گیا تو میں تمھیں ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔“

”میں تابش کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی.... مجھے تم پھر گناہوں کی دنیا میں لے جاؤ گے۔“ فیروز کی آنکھوں نے جانے کیا دیکھ لیا تھا۔ اس نے یوسا سے کچھ نہ کہا اور مسکرا دیا۔

اگلے دو روز تابش دیوانگی کے عالم میں کھنڈروں میں بھٹکتا رہا۔ غاروں جیسے کمروں میں نارنج اٹھائے خزانہ ڈھونڈتا رہا۔ ابھی وہ زمین پر پاؤں کے نشان دیکھنے لگتا.... بعض اوقات تو اپنے ہی پاؤں کے نشان دیکھ کر ان کا تعاقب کرنے لگتا۔ فیروز اور یوسا اسے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مگردن کے وقت وہ انھیں نظر نہیں آتا تھا۔ شام کے بعد وہ ان کے پاس آ جاتا اور تھکے ہوئے لہجے میں پہلی بات یہ کہتا:

”فیروز! پول اور گلاس لاؤ۔“ وہ خوب پیتا۔ یوسا پہلے کی طرح اس کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی مگر تابش نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ تابش کے چہرے پر کربناک تاثرات چھا گئے تھے۔ جیسے کسی اندرونی درد نے اسے مار ڈالا ہو۔ یوسا کے دل میں اس کی محبت پہلے سے

زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں پہلا شخص تھا جس نے اس کے جسم کے بجائے روح میں دلچسپی لی تھی۔۔۔۔۔ وہ اکثر تابش کو اس حالت میں دیکھ کر رو پڑتی تھی۔

☆-

ایک روز تابش شام سے پہلے ہی کھنڈروں میں سے نکل آیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے ساتھ قہر بھی تھا۔ آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ یوسا اور فیروز کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے باپ کی دی ہوئی کتاب جسے وہ سینے سے لگا کر رکھتا تھا زمین پر پھینک دی:

”میرا باپ بھی جھوٹا اور اس کی کتاب بھی جھوٹی ہے۔“

یوسا لرز کر رہ گئی تھی۔ وہ کتاب اٹھانے کے لیے ابھی تو تابش نے گرج دار لہجے میں کہا۔ ”پڑی رہے دوہیں۔ اس میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

ہوا کے جھوٹے تیز ہونے لگے۔ کتاب کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ جانے کیا سوچ کر فیروز نے کھلی کتاب سمیٹ کر وہاں تابش کے سامنے رکھ دی۔

تابش کے آنسو بہہ رہے تھے۔ فیروز نے تسلی دی تو تابش کی نظر کھلی کتاب کے ایک صفحے پر جم گئی۔ غیر ارادی طور پر اسے کتاب پر یہ الفاظ نظر آئے:

”وہ زمین میں ایک اندھیرے کنوئیں میں چلے جائیں گے۔۔۔۔۔ ایک آدمی سونے کی ڈلیاں چگا دوڑوں کے اندھیرے مسکن میں پھینک دے گا۔“

”اندھیرا کنواں۔۔۔“ تابش نے ہم کی طرح پھٹتے ہوئے کہا۔ ”فیروز یہاں ایک اندھیرا کنواں ہونا چاہیے۔ مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ برسوں رات میں نے شراب کی خالی بوتل زور سے دوڑھٹتی تو چگا دوڑوں کا غول اڑ کر ہر طرف پھیل گیا۔ میں نے بوتل گرنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ بوتل اس کنوئیں میں گری ہوگی۔ خزانہ اس کنوئیں میں ہے اور وہ کنواں چگا دوڑوں سے بھرا ہوا ہے۔“ اس نے یہ فقرے فیروز کو بڑھ کر سنائے۔

فیروز کے ہونٹوں پر طنز بے مسکراہٹ تھی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ تابش اٹھا اور اس طرح دوڑ پڑا۔ جس طرف اس نے خالی بوتل پھینکی تھی۔ راستے میں ایک دیوار حائل تھی، آگے ایک چبوتر تھا۔ اس کے ساتھ بارہ

دری تھی۔

تابش گھوم کر دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آوازیں دور ہٹتے ہٹتے خاموش ہو گئیں۔۔۔۔۔ پھر ذرا سی دیر بعد اس کی بلند آواز سنائی دی:

”فیروز، یوسا۔۔۔ بھاگ کر آؤ۔۔۔ کنواں مل گیا ہے۔“

”کس پاگل سے واسطہ پڑ گیا ہے۔۔۔۔۔ چلو یوسا۔ اس بد بخت کا کنواں بھی دیکھ لیں۔“ فیروز نے کہا تو دونوں کنوئیں کی طرف چل پڑے۔

تابش کھنڈروں کے ایک اندھیرے گوشے میں ٹارچ جلائے کھڑا تھا۔ فیروز اور یوسا کو دیکھ کر وہ کنوئیں میں جھکا:

”یہ رہا کنواں۔۔۔“

فیروز نے جھک کر دیکھا۔ یہ صدیوں پرانا کنواں تھا جو۔ چند گز گہرائی تک نظر آ رہا تھا۔ اس سے نیچے گھب اندھیرا تھا۔ تابش اس میں اترتا چاہتا تھا مگر فیروز نے روک دیا:

”تمہارا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ اور تم نشے میں بھی ہو۔ ذرا دماغ کو ٹھکانے آنے دو۔ پھر کچھ سوچتے ہیں۔“ مگر تابش نے ان سنی کرتے ہوئے کہا:

”فیروز جو میں کہتا ہوں تم وہ کرو۔۔۔۔۔ بھاگ کر جاؤ اور سامان سے رسہ لے آؤ۔“

فیروز ہادخو استہ چلا گیا اور رسہ لے آیا۔ تابش نے ٹارچ سے کنوئیں میں روشنی ڈالی فیروز نے جھک کر دیکھا۔ انھیں کنوئیں کی تہہ نظر آ گئی۔ وہاں قالین قسم کا کوئی بڑا لمبا کپڑا پڑا تھا۔ دیواریں پر مارنے سے چگا دوڑوں کا طوفان اٹھا اور باہر نکل گیا۔

اب تابش نے رسے کا ایک سرا اپنی کمر کے گرد باندھ لیا اور فیروز سے کہا مجھے نیچے اتار دو۔ فیروز اور یوسا نے مضبوطی سے رسے کو پکڑ لیا اور پاؤں جمالیے۔ تابش کنوئیں میں اتر گیا۔

جب وہ کنوئیں کی تہہ تک پہنچ گیا تو ٹارچ کی روشنی میں اندر کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی قالین تھا۔ جو دو ہزار سال پرانا تھا۔ تابش نے قالین کھولا تو اس میں سے بے شمار

ہو گئے ہو۔“

جواہرات میں چند ایک بیش قیمت انگوٹھاں بھی تھیں۔ تابش نے سب سے دلکش انگوٹھی یوسا کی انگلی میں پہنا دی۔ یوسا نے ایسی قیمتی اور عجیب و غریب انگوٹھی کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمکنے لگیں۔

تابش نے خزانہ سمیٹا اور فیروز کی مدد سے اٹھالے گیا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ تابش نے فیروز سے جتنی شراب مانگی اس نے اتنی ہی پلا دی۔ تابش پر خزانے کا نشہ بھی طاری تھا۔ فیروز ذرا جلدی سو گیا۔

آدمی رات کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو تابش اور یوسا کے بستر خالی تھے۔ اس سے پہلے یوسا تابش کے ساتھ تنہا بیٹھی رہتی تھی تو فیروز نے بھی شک نہیں کیا تھا۔ مگر اس رات فیروز کو کچھ ایسی ننگی کا احساس ہونے لگا جیسے اسے یوسا کے ساتھ بے پناہ محبت ہے اور تابش نے اُسے اغوا کر لیا ہے۔

اس میں حقیقت بھی تھی۔۔۔۔۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ تابش کی پارسائی شراب میں ڈوب گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ انھیں تلاش کرے یا سو جائے۔ وہ اُٹھی سوچوں میں کھویا رہا۔ اس کے شکوک بالکل ختم تھے۔

اس وقت تابش اور یوسا کھنڈر میں ایک ایسی جگہ بیٹھے تھے جو اس بھیانک جگہ کا ایک خوب صورت گوشہ تھا۔ وہاں چھوٹا سا تالاب تھا۔ تالاب میں پانی بھی تھا۔ ارد گرد گھاس بھی اور چاندنی اس منظر کو اور زیادہ دلکش بنارہی تھی۔ یوسا اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھی تھی کیوں کہ اس وقت تابش ایک پارسا نہیں، گامک بن چکا تھا۔۔۔۔۔ ویسا ہی گامک جیسے یوسا کے پاس ہوئی میں آیا کرتے تھے اور وہ ان سے اجرت وصول کر کے رائیں گزارا کرتی تھی۔۔۔۔۔ تابش نے اسے اپنے قریب کھینچ کر بازوؤں میں جکڑ لیا اور وہ ہیرے اس کے پھٹیلے پر رکھ کر بولا:

”یہ ہیرے رکھو اور آج کی رات بھول جاؤ کہ میں کوئی نیک آدمی ہوں۔ آج اس روح کو ایک بار پھر مار ڈالو۔ جسے میں نے تمہارے اندر زندہ کر دیا تھا۔“ یوسا پرے ہٹ گئی۔

”تابش میں تمہیں ان گامکوں کی قطار میں کھڑا

ہیرے جواہرات اور سونے کے دیسے ہی چکوز کھڑے لگے جیسا ایک کھڑا اس نے غار نما کمرے میں دیکھا تھا۔

تابش کو ڈر پیدا ہوا کہ اگر اس نے یہ خزانہ قالین میں لپیٹ کر اُپر بھیجا تو فیروز کی نیت خراب ہو جائے گی۔ اس نے ایک ترکیب سوچی اور خزانہ قالین میں لپیٹ کر رے سے قالین کو مضبوطی سے باندھ دیا اور فیروز کو آواز دی:

”رے مضبوطی سے پکڑ لو۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔“ وہ دیوار کے ساتھ پاؤں جما کر اُپر چڑھ گیا اور باہر آیا۔ تب اس نے فیروز کو بتایا کہ خزانہ مل گیا ہے۔ انھوں نے مل کر رے کھینچنا شروع کر دیا اور خزانہ باہر نکال لیا۔

فیروز کو ہیروں کی پہچان تھی۔ وہ ہیرے سمگل کرنے والے گروہ کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ ان ہیروں میں پیشتر انوکھے اور نایاب تھے۔ فیروز نے ایک ہیرا پھیلی پر رکھ کر مشاہدہ کیا۔۔۔۔۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا کہ تابش نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ہیرا چھین لیا اور نخوت سے بولا:

”اس خزانے کا مالک صرف میں ہوں۔۔۔۔۔ اپنے وعدے کے مطابق تمہارا حصہ ضرور دوں گا۔۔۔۔۔ تم اس طرح سے ہاتھ نہ مارو۔“

فیروز کو اس اوجھی حرکت پر غصہ آیا گیا۔ اس نے کرخٹ آواز میں کہا:

”میں نے انسانی ہڈیوں کے تین بیجر انھی کھنڈرات میں دفن کیے ہیں۔۔۔۔۔ دوسرا اور ایک عورت تھے وہ۔۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے ہم تینوں کے روپ میں وہ پھر سے زندہ ہو گئے ہیں، ایک بار پھر ایک دوسرے کے ہاتھوں مرنے کے لیے۔۔۔۔۔ خزانہ دیکھ کر تمہاری عقل جواب دے گئی ہے۔ دماغ ٹھکانے پر لے آؤ۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ برسوں بعد تم جیسا کوئی اور سر پھر ایک گائیڈ اور ایک طوائف کے ساتھ خزانے کی تلاش میں آئے گا تو اسے بھی انسانی ہڈیوں کے تین بیجر ملیں گے۔“

”تم خزانہ دیکھ کر مجھے دھمکیاں دندو۔۔۔۔۔ میں تمہیں حصہ ضرور دوں گا۔“ تابش بے پروائی سے بولا۔

”مجھے تمہارے خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف اپنی اجرت چاہیے۔ تم ہیروں کی چمک سے اندھے

نہیں کر سکتی جن سے تم مجھے آزاد کرالائے ہو.... میں اس خدا سے ڈرتی ہوں جس کا تقدس تم نے میرے دل میں پیدا کر دیا ہے۔“

”میں آج سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں خزانہ پیش کر رہا ہوں کہ میری خواہش پوری کر دو۔“ یوسا رو پڑی۔ اس کے لیے یہ سب نئی بات نہیں تھی۔ مگر تابش کو وہ آسانی مخلوق سمجھتی تھی۔ وہ اس سے دور ہٹ گئی تو تابش نے التجا کرتے ہوئے کہا:

”تمہیں خزانہ منظور نہیں تو میری بات غور سے سن لو۔ میں وہ انسان ہوں جس نے ماں کے پیار کی لذت نہیں پائی۔ بہن کا پیار بھی نہیں دیکھا۔ بچپن میں باپ نے مجھے کسی لڑکی کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا.... اس نے مجھے عورت کے وجود سے دور رکھا اور اخلاقیات کی زنجیروں میں باندھتا رہا۔ میں تارک الدنیا تھا۔ دنیا کی رنگینیوں میں رہتے ہوئے ان رنگینیوں سے کنارہ کش اور متفر رہا۔ میں اسی کو اصل زندگی سمجھتا رہا مگر یہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ ایک نفسی میرے وجود میں پرورش پا رہی ہے اور میں انسانی فطرت کا گلا دو بارہا ہوں.... تمہیں شاید یاد نہ ہو کہ سفر کے دوران جب آندھی آئی تھی اور تم مجھ سے بے تکلیف ہو گئی تھیں، ہم بہت دیر آندھی سے بچنے کے لیے ایک ہی جسم بنے رہے تھے۔ تمہارے جسم کی خوشبو اور پیش پانی، تمہارے بالوں نے میرے گالوں کو سہلا کر مجھ میں وہ نفسی بیدار کر دی تھی جسے میرے باپ نے بے رحمی سے دبا دیا تھا.... آندھی گزر گئی۔ لیکن میرے سینے میں ایسی آندھی ابھی کہ میں تمہیں اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا کہ میرے اندر جو تہذیبی آئی کیا ہے۔ میں نے تمہارے وجود کو عورت کے تقدس کی توہین سمجھا تھا۔ میں تم میں عورت کے سارے ہی اچھے روپ دیکھنا چاہتا تھا.... مگر باپ کی ہڈیوں کا بجز اور اُس کے ساتھ ایک طوائف کا بجز دیکھ کر میرے سامنے واضح ہو گیا کہ عورت کے ہذا زندگی احواری ہے.... یوسا میرے باپ کی طرح تم بھی مجھے دنیا کی رنگینیوں سے محروم نہ کرو۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”نہیں...“ یوسا نے سسکی لے کر کہا۔ ”مجھے اس تابش سے محبت ہے جس نے مجھے گناہوں سے بچایا۔“

مجھے اس تابش سے نفرت ہے جو میرے جسم کے ساتھ کھلتا چاہتا ہے اور ہیروں کی شکل میں اجرت دے رہا ہے۔“

☆- فیروز کو خیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ غالب آ گئی کہ تابش اس سے یوسا کو چھین کر لے گیا ہے۔ وہ اٹھا اور انھیں دے باؤں ڈھونڈنے لگا۔

ایک موڑ پر اُسے تابش کی باتیں سنائی دیے لگیں۔ وہ آواز کی سمت چلتا گیا۔ آخر وہ دونوں اُسے نظر آ گئے۔ وہ چاندنی میں تھے۔ فیروز اندھیرے میں ان کے قریب چلا گیا۔ اس وقت تابش یوسا سے کہہ رہا تھا:

”سنو حسین لڑکی! تمہارے لیے میری خواہش انوکھی تو نہیں، تم کنواری نہیں ہو۔ تم پاکباز بھی نہیں ہو.... مجھے گاہک سمجھ لو۔ مجھ سے دور نہ ہو۔“

”تابش ہوش میں آؤ....“ یوسا نے روتے ہوئے کہا۔ ”تم ہی نے کہا تھا یوسا اب تم پاکباز ہو، تم نے ہی میری عصمت مجھے لوٹائی تھی۔“

فیروز سن رہا۔ تابش درندہ بنتا جا رہا تھا۔ عورت کی دل کشی اور ہیروں کی چمک نے پارسانی کا لبادہ تار تار کر دیا تھا۔ وہ اس عورت کی طرف لپک رہا تھا جو آبرو باختہ ہوتے ہوئے بھی اپنی عصمت کو ہیروں سے زیادہ قیمتی سمجھنے لگی تھی۔ پھر اس نے بھوکے بھیڑیے کی طرح حملہ کر دیا اور یوسا کو بوجھ لیا:

”بدکردار، عصمت فروش حیرتی اصلیت کیا ہے.... خانہ بدوشوں کی بچی ہوئی لڑکی جو چند پیسوں کے لیے رات بھر اپنی عصمت نپلا م کرتی رہتی تھی۔ اب ہیروں کو بھی ٹھکرا رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں تجھے کون چمڑاتا ہے مجھ سے۔“

”مجھے چھوڑ دے شیطان.... میں تجھ فریب کا رپر لعنت بھیجتی ہوں۔“ یوسا کی آواز گھٹی گھٹی تھی۔ اب مزید انتظار ممکن نہیں تھا۔ فیروز نے اندھیرے میں جست لگائی اور تابش کے پہلو میں زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ لڑکھاتا ہوا دوڑ جا کر ا۔ تابش نے کمر بند سے ریو اور نکال لیا لیکن فیروز نے اسے مہلت نہ دی۔

اس نے دوڑ کر تابش کے چہرے پر گھونسا مارا۔ تابش کھنڈر کی دیوار سے جا ٹکرایا لیکن فوراً ہی جھنجھل گیا۔ فیروز سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوڑتا ہوا

اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ کھنڈروں کی بھیاں تک خاموشی میں اس کے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور فیروز ان آوازوں کی کھوج لگاتا رہا۔۔۔ وہ دور نہیں گیا تھا اور کھنڈروں میں ہی بھٹک رہا تھا۔ پھر اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں:

”تم مجھے قتل کر دو گے۔۔۔ میرے باپ کو بھی اس کے گائیڈ اور طوائف نے قتل کیا تھا۔۔۔ تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔۔۔ میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”اس نے ہوا میں فائر کیا تو دھماکے سے ہزاروں چمکاؤں کھنڈروں سے اڑے۔ اور ان کے پروں کا شور قیامت بن کر سنائی دینے لگا۔ فیروز نے یوسا کا بازو پکڑا اور لمبے کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپا دیا۔ یوسا دیکھ رہی تھی کہ کھنڈر پھر خاموش ہو گیا تو فیروز نے کہا:

”ڈرنا نہیں۔۔۔ اور یہیں رہنا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ وہ ضرور وار کرے گا۔“ یوسا کو لمبے کے پیچھے چھپا کر فیروز دبے پاؤں کھنڈروں میں گھومنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا اور دل میں ارادہ کہ تابش کو دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ مگر اسے تابش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ چھپتا چھپتا یوسا کے پاس واپس پہنچ گیا:

”تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں جاگتا رہوں گا۔ وہ سامنے آنے کی جرات نہیں کرے گا۔۔۔ مجھے جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔“

”میں اس شخص کو خدا کی مدد سمجھتی رہی۔“ یوسا نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اسے تمھاری شراب نے گمراہ کیا ہے۔“

”وہ اپنے باپ کا بچاری ہے۔ اُسے خدا پر نہیں اپنے باپ پر اعتماد تھا۔ اس کا مذہب خدا کا نہیں اپنے باپ کا تھا۔۔۔ اگر اس نے خدا پر اعتماد کیا ہوتا تو شراب کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ہیرے جواہرات اسے پاگل نہ کرتے۔ وہ اپنے باپ کی راہ پر چل رہا ہے۔“

فیروز نے یوسا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا:

”دیکھو یوسا میں ایک راہزن ہوں۔ گناہ گار ہوں، پارسا نہیں ہوں۔۔۔ تم ایک طوائف ہو۔ ہم دونوں دنیا کے دھکارے ہوئے ہیں لیکن میں تمھاری عصمت اس بھٹکے

ہوئے پارسا کے ہاتھوں داغدار نہیں ہونے دوں گا۔“

”اب تم پاکباز رہو گی۔“ فیروز نے اس کی بات کاٹی ”ایک پارسا نے بھٹک کر مجھ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھا دیا ہے۔ لعنت ہے اس پارسائی پر جو بدی کی ایک بھی ضرب نہ سہ سکے۔ اس سے تو ہم گناہ گار اچھے، جواچھے برے کو پہچان لیتے ہیں۔ تم اب میری پناہ میں ہو۔ ہم کل صبح واپس روانہ ہو جائیں گے۔“ فیروز نے اسے تسلی دی۔ ”کیا میں پھر اسی ہوٹل میں چلی جاؤں گی۔ تم مجھے وہیں لے جاؤ گے؟“ یوسا کے لہجے میں خوف تھا۔

”نہیں۔۔۔ ہماری منزل وہ نہیں جہاں سے ہم آئے تھے۔“ فیروز نے اعتماد سے کہا۔

اس تسلی پر یوسا پرسکون ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ فیروز رات بھر جاگتا رہا۔ تابش لاپتہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی فیروز یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ چوری چھپے فائر کر کے انھیں قتل کر دے گا۔

☆-

سورج کی کرنیں کھنڈر میں داخل ہوئیں تو فیروز نے یوسا کو جگایا۔ وہ دونوں اس مقام کی طرف بڑھے جہاں ان کا سامان پڑا تھا۔ فیروز ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ ہر طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ جب وہ قیام گاہ تک پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تابش خچروں اور سامان سمیت غائب تھا۔

”وہ چلا گیا ہے۔۔۔ وہ ہمیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔۔۔ بانی کا ایک قطرہ بھی چھوڑ کر نہیں گیا۔“

فیروز کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”کھنڈروں میں پانی کا تالاب موجود ہے۔“ ریتا نے کہا۔

”وہ پانی نہیں زہر ہے۔ جانے اس میں کتنے بچھو، مگرمٹ اور سانپ مرے ہوں۔ اب ہماری واپسی پانی کے بغیر ہوگی۔“ فیروز نے کہا۔ ”ہم اسے راستے میں جا پکڑیں گے۔ وہ صحرائی راستوں اور خطروں سے واقف نہیں۔ وہ خچروں کو بھی نہیں سنبھال سکے گا۔ ہم زندہ رہیں یا نہ رہیں وہ

صحرا سے زندہ نہیں نکل سکے گا۔“

سورج سر پر آ کر آگے نکل گیا۔ وہ صحرائی چٹانوں میں سے گزرے تو آگے خشک دریا آ گیا۔

فیروز کو یاد تھا کہ جب وہ کھنڈروں کی طرف جا رہے تھے تو اس خشک دریا میں انہیں ایک جگہ پانی مل گیا تھا، مگر واپسی کے وقت انہیں کہیں پانی نظر نہ آیا۔ وہ یہ بھی کہ واپسی کا راستہ کوئی اور تھا۔ وہ خجروں کے پاؤں کے نشان دیکھتا جا رہا تھا۔ ان سے اسے پتہ چل گیا تھا کہ تابش غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اس کے تعاقب میں فیروز کو بھی غلط راستے پر جانا تھا۔ وہ تابش کو پانی اور خجروں کے لیے پکڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ دریا کے خشک پاٹ سے بھی گزر گئے۔

اب یوسا کے لیے چلنا محال تھا۔ یوسا کا حوصلہ بڑھاتے بڑھاتے اس کا اپنا حوصلہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح ٹھٹھا ہو چکے تھے۔ پھر انہیں ایک خجر نظر آیا۔ جو اُن سے چند سو گز دور آوارہ پھر رہا تھا۔ اس کی زین ڈھیلی ہو کر ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ زین کے چڑے کی رسیاں الگ لٹک رہی تھیں۔ تابش اس کی زین کس نہیں سکا تھا۔

فیروز نے تیز چلنے کی کوشش کی تو ناگہان جواب دے گئیں۔ جسم خشک ہو چکا تھا۔ زبان اکڑنے لگی تھی۔ خجر ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ فیروز نے مخصوص صحرائی آواز میں خجر کو پکارنا شروع کر دیا۔ اس کے حلق میں دردی نہیں اٹھنے لگیں۔ آخر اس کی آواز خجریک پہنچ گئی۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ مگر جتنی ریت نے چند گز کا فاصلہ صدیوں لمبی مسافت بنا دیا۔ فیروز پاؤں کھینٹا ہوا خجریک پہنچ گیا۔

خجریک کے بغیر خجروں پر سامان باندھنا اور انہیں سنبھالنا تابش کے لیے آسان نہیں تھا۔ فیروز نے خجر کو پکڑ لیا اور اس کی زین کس دی۔ وہ اس پر سوار ہو کر یوسا کے پاس پہنچا جو ریت پر چت پڑی تھی۔ ریت اس کے جسم کو جھلسا رہی تھی۔ فیروز نے اسے جھجھوڑا:

”اٹھو یوسا! خجر پر سوار ہو جاؤ۔ اب سفر سہل ہو گیا ہے۔“

اس کی بات سن کر یوسا نے دونوں بازو اٹھائے اور لرزتی آواز میں کہا۔ تم کہاں ہو فیروز میرے قریب آ جاؤ۔۔۔۔۔ یہ دھند کیسی ہے۔ تم مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے۔“

فیروز نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے

فیروز وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوسا عورت تھی۔ وہ ڈر گئی تھی۔۔۔۔۔ موت سے نہیں صحرائی اذیت سے۔ وہ کھنڈروں میں ہی مرنا چاہتی تھی۔ اس نے فیروز سے کہا کہ تم اکیلے چلے جاؤ، مجھے یہیں مرنے دو۔ میں نے کتنی بار مرنے کی خواہش کی تھی مگر موت نہ آئی۔۔۔۔۔ میں پاکستانی میں مرنا چاہتی ہوں۔ میری قسمیں نہ تو فیروز۔“

”تم پاکستانی میں جو گی۔ یوسا میں تمہیں پاک منزل کی طرف لے جا رہا ہوں۔“

یوسا فیروز کا لب و لہجہ جانتی تھی۔ مگر اب اس کا لب و لہجہ بدلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس نے فیروز پر بھروسہ کیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ ریوا اور اور چند گولیوں کے سوا اُن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس ظالم صحرائی پانی کے بغیر جانا خود کشی تھی۔ فیروز نے خجروں کے نقوش پادیکھے اور بولا:

”یہ نشان پانچ چھ گھنٹے پرانے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“

وہ خجروں کے نقوش پادیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ سورج اٹھتا گیا اور صحرا جلنے لگا۔ کھنڈر دور ہٹتے جا رہے تھے۔ فیروز نے خزانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ تابش ساتھ لے گیا یا نہیں پتہ نہ تھا۔ وہ اب اپنی اور یوسا کی جان کو جتنی خزانہ سمجھ رہا تھا۔

فیروز صحرا کا سمجھتی تھی۔ مگر پانی کے بغیر وہ صحرائی صحرانوں کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے یوسا کو باتوں میں الجھائے رکھا۔ فیروز اسے حسین مستقبل کے خواب دکھاتا رہا اور وہ چلتی رہی۔

یوسا کا رنگ چلا پڑتا جا رہا تھا۔ ہونٹ جھٹکتے لگے تھے۔ آنکھیں ویران ہو گئیں اور اس کا منہ کھل گیا تھا۔ وہ بول بھی نہیں پارتی تھی۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ تھوڑی دور چل کر گر پڑے گی۔

ان دونوں کو احساس تھا کہ صحرائی جو پیاس کی شدت سے گر پڑتا ہے وہ دوبارہ کبھی نہیں اٹھ پاتا۔ خود فیروز کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی، لیکن وہ سخت جان آدمی تھا۔ برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے یوسا کا حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ لیکن یوسا کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے نیند میں چل رہی ہو۔

سے لگائے تو یوسا نے سسکتی آواز میں کہا:

”ہم اب گناہگار نہیں ہیں فیروزہ.... دیکھو میں پاکباز ہوں۔ میں نے ہیرے اور جواہرات ٹھکرا دیے اور اپنی عصمت و ادب دار نہ ہونے دی۔“ یوسا کی باتیں حالت نزع کی سسکیاں تھیں۔ فیروز نے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور خچر پر بٹھا دیا۔

جیسے ہیسے دن گزرا تو رات کی ننگی بوہ گئی۔ اندھیرا گہرا ہوا تو فیروز کو ایک ستارہ نظر آ گیا۔ صحرائی ڈاکو اسی ستارے کو دیکھ کر مست معلوم کیا کرتے تھے۔

وہ رات بھر چلتے رہے۔ صحرا کی رات ٹھنڈی ہوا کرتی ہے۔ فیروز رکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی یوسا کے پیچھے خچر پر سوار ہو گیا۔ رات انھوں نے کچھ پیدل اور کچھ خچر کی پیٹھ پر چلے گزاردی۔ صبح ہوئی تو یہ مجڑو تھا کہ وہ زندہ تھے۔ یوسا خچر پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر ڈول رہا تھا۔ صبح کا اجالا صاف ہونے لگا تو فیروز کو دور دو خچر نظر آئے۔ پہلے تو اسے کچھ شک ہوا لیکن وہ خچر ہی تھے۔

فیروز نے ادھر کا رخ کیا.... فیروز پیاس سے مر رہا تھا۔ لیکن خچروں کو دیکھ کر اس کے جسم میں جان آگئی۔ جب ان دو خچروں کے قریب گئے تو وہاں اور ہی مظہر نظر آیا۔

تابش گرم ریت پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں اندر کو دھنسن گئی تھیں۔ اس کا چہرہ لاش کا چہرہ بن گیا تھا۔ وہ زندہ تو تھا لیکن آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خچر کی باگ تھی۔ دونوں خچروں کی زینیں ڈھیلی تھیں اور دونوں پر سامان نہیں تھا۔ تابش میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سامان مضبوطی سے لا دسکا۔ پانی کے مشکیزے بھی وہ کہیں پھینک آیا تھا۔

تابش نے بغل میں چڑے کا ایک بیگ دہار کھا تھا۔ اس بیگ میں ہیرے جواہرات اور سونے کی ڈلیاں تھیں۔ فیروز اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ یوسا خچر کی پیٹھ پر بیٹھی پیاس اور تھکات سے اُدھک رہی تھی۔ فیروز کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر تابش نے کراہنے کے انداز میں کہا:

”یوسا میں نے تمہیں بدی سے بچایا تھا۔ میں نے تمہیں بڑی قیمتی انگوٹھی دی تھی.... اب تجھے اس ڈاکو سے بچاؤ۔ دیکھو یہ مجھے قتل کرنے لگا ہے۔“

تابش کی آواز اتنی دبی دبی تھی جیسے وہ ریت کے

ٹپے سے بول رہا ہو۔ یوسا نے اس کی آواز سنی تو بیدار ہوگئی۔ اس نے ایک نظر تابش کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دنیا سے لاتعلقی ہوئی جا رہی تھی۔

”بد نصیب انسان....“ فیروز نے تابش سے کہا اور افسردہ سی ہنسی ہنس پڑا۔ ”پانی تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے اور تم پیاسے مر رہے ہو۔ یہ ہیرے جواہرات اور خزانے کی کی پیاس نہیں، بجھا سکتے، نہ تمہیں موت کے منہ سے نکال سکتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے خزانہ چھیننا چاہتے ہو۔“ تابش نے چڑے کے بیک کو بغل میں دباتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

فیروز کے لیے اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ اور یوسا پیاسے تھے۔ فیروز پانی کا کھوج لگا سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ دس بارہ گز دور ریت کے نیچے پانی ہے۔

ایک خچر کی زین کے ساتھ بیلچہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے بیلچہ کھولا، چند قدم دور جا کر زمین سو سمی اور بیلچے سے ریت ہٹانے لگا۔

یوسا نے اسے دیکھا تو وہ بھی خچر سے اتر کر فیروز کی بدو کے لیے کھینچ گئی۔ اس نے تابش کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ پہلو کے بل پڑا سر گوشاں کر رہا تھا:

”یوسا! اس ڈاکو سے کھو مجھے قتل نہ کرے....“

اب ریت کی گلی کھنسنے لگی تھی اور پھر کچھ دیر بعد پانی دکھائی دینے لگا۔ یہ صحرا کا مجڑو ہوتا ہے کہ اوپر سے ریت جل رہی ہوتی ہے اور چند فٹ نیچے کی کسی جگہ پانی ہوتا ہے۔ تابش نے فیروز کو کڑھا کھودتے دیکھا تو وہ سر گوش میں بولا:

”یہ صحرائی ڈاکو میری قبر کھود رہا ہے۔“

اس نے خزانے کا بیگ وہیں رکھا اور کمر بند سے خچر نکال لیا۔ اس کا اپنا رونا اور کہیں گرتا تھا۔ وہ اپنے جسم کی بچی بچی طاقت کو سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دبے پاؤں فیروز کی طرف بڑھنے لگا۔ فیروز گڑھے سے ریت نکال رہا تھا تاکہ پانی صاف ہو جائے۔ یوسا اسے دیکھ رہی تھی۔ تابش دونوں کے عقب میں جا کھڑا ہوا اور خچر تان کر فیروز پر وار کر دیا۔ یوسا نے اسے دیکھا تو چیخ کر بولی:

”فیروز سنبھل کر....“

لگتا ہے جیسے خدا نے میری دعا سن لی ہو۔ میں نے اپنے
 خدا کو پایا ہے۔“ اس نے تابش کی لاش کی طرف دیکھا اور
 بولا ”اس کی لاش گڑھے دفن کر دو.... اور غور سے سنو.... اگر
 میرے کان دھوکہ نہیں کھا رہے تو مجھے آؤٹوں کی گھنٹیوں کی
 آواز سنائی دے رہی ہے.... شاید کوئی قافلہ آ رہا ہے۔“
 یوسا نے تابش کی لاش گھسیٹ کر گڑھے میں پھینک
 دی اور گڑھا ریت سے بھر دیا۔ اس نے خچروں کو پکڑ لیا تو
 فیروز نے ہدایت کی:

فیروز نے بچنے کی کوشش کی مگر تابش کا خنجر اتنی تیزی سے آیا کہ اس کی پیٹھ میں اتر گیا۔۔۔ فیروز لڑکھڑایا تو تابش نے اس کی پیٹھ سے خنجر نکال کر دوسرے وار کا ارادہ کیا۔ اسی دوران یوسانے پھرتی سے فیروز کا ریو الور نکال لیا۔۔۔ فیروز گڑھے میں تابش کے دوسرے وار سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یوسانے ریو الور سیدھا کر کے تابش پر گولی چلا دی۔

غیر دہشیدہ تکلیف کے باوجود ہمت کر کے گڑھے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مخمّر کا دار گہرا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر یوسا کو ہوش سا آ گیا۔ خون فوارے کی طرح اس کی پیٹھ سے ابل ابل کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔

”یانی...“

فیروز کی سسکی کانوں سے گھرائی تو یوسا نے گڑھے میں دیکھا۔ وہاں پانی چمک رہا تھا۔ اس نے چلو بھر کر فیروز کے منہ میں پانی ڈالا۔ بھر سر کا کپڑا اُتار کر پانی میں بھگوایا اور فیروز کے زخم پر باندھ دیا۔ اس نے خود بھی پانی پیا اور فیروز کے پاس بیٹھ لی۔ فیروز پر ریشی طاری ہو رہی تھی لیکن وہ یوسا کی خاطر ہوش میں رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ خون بہت ضائع ہو چکا تھا۔ صحرا سے اس حالت میں لکھنا ممکن نہیں تھا۔

یو سائے فیروز کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا:
 ”فیروز تم بھی تو خدا کو مانتے ہو..... چلو خدا سے دعا
 کریں.... آؤ اس مشکل وقت میں اپنے خدا کو پکاریں۔“
 فیروز سرکوشی میں خدا سے مدد مانگنے لگا۔ یو ساؤ دعا
 کے لیے ہاتھ اٹھائے رو رہی تھی۔ فیروز نے اس کا ہاتھ
 پکڑ لیا اور بولا:

”تابش بھگ گیا.... اور ہم سیدھی راہ پر آ گئے۔ یہ
عجی محبت کا کرشمہ ہے۔ یوٹاہ میں نے ہمیشہ میں چاہا ہے۔



بہر و بیہ

خلیل جبار

دین اور تعلیم سے دوری انسانوں کو ضعیف العقائدی کی طرف لے جاتی ہے اولیاء اللہ دنیا میں اللہ کے دین کو پھیلانے کی تیک و دو کرتے ہیں لیکن جاہل لوگ انہیں اللہ کے ہم پلہ قرار دے کر اپنی دنیا سنوارنے پر تل جاتے ہیں اور ان کی تعلیمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک جاہل خاتون کا المیہ، وہ ضعیف العقائدی میں اپنے گھر کی عزت لٹا بیٹھی تھی

بولی۔

امیر الدین کے پاس بی بی کلثوم کی بات کا کچھ جواب نہ تھا اس لیے خاموش رہا اس کے خاموش ہونے پر وہ اور شیر ہو جاتی۔

”خاموش کیوں ہو بولتے کیوں نہیں ہو۔“

”میں کیا بولوں میں پہلے ہی تمہارے احسانوں تلے دبا ہوا ہوں میں اکثر اپنے دوستوں کے سامنے تمہاری تعریف کرتا ہوں کہ میری بیوی بہت اچھی ہے اس نے جس طرح گھر کو سنبھالا ہوا ہے کوئی اور نہیں سنبھال سکتا۔“

امیر الدین اس کی خوشامد پر اتر آتا۔

اس طرح بیوی کی خوشامد کر کے وہ یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو جائے گی اور اسے کچھ نہ کہے گی بی بی کلثوم نے چپ رہتا سیکھا تھا وہ فوراً سے کہتی۔

”میں دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہوں جو اپنی ذرا سی تعریف سن کر خوشی سے پھولے نہ سادس گئی دیکھو میاں جی میری ایک بات کان کھول کر سن لو میں دس سال سے برداشت کر رہی ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا“ بچے جو ان ہو رہے ہیں جنہیں اب کچھ کرنا ہوگا۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں کچھ نہیں کرنا چاہتا“ جس طرح تم مستقبل کے لیے فکر مند ہو ایسے ہی میں بھی فکر مند ہوں۔“ امیر الدین نے کہا۔

”یہ ایک دن کی بات نہ تھی آج دن ایسا ہوتا رہتا تھا اور امیر الدین بی بی کلثوم کی تعریفیں کر کے بات کو ہوا میں اڑا دیتا تھا“ حقیقت یہی تھی کہ امیر الدین ایک

بی بی کلثوم کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انتہائی ضدی اور خود سر قسم کی خاتون ہے اس کا شوہر امیر الدین بھی اپنی بیوی سے ڈرا اور سہارا ہوتا تھا اس کی وجہ بی بی کلثوم کا لہجہ تھا وہ بات ایسے کرتی تھی کہ جیسے لڑ رہی ہو امیر الدین کی آمدنی کے ذرائع ایسے نہ تھے کہ وہ معاشی طور پر محکم ہو سکے۔ بی بی کلثوم س کے معاشی طور پر کمزور ہونے کا فائدہ اٹھا کر آئے دن لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ امیر الدین بے چارہ اسے سمجھانے کو کہتا۔

”اری بھگوان تو کیوں فکر کرتی ہے ایک دن ضرور ہمارے دن پھریں گے۔“

”کیا خاک پھریں گے دس سال ہو گئے ہیں تمہارے ساتھ رچے ہوئے بچے بڑے ہونے کو ہیں تم کوئی ڈھنگ کا کام ہی نہیں کرتے اتنا سمجھایا ہے کہ پیشے کی بجائے کام چھوڑ دو اس میں کیا ملتا ہے۔“

”تو فکر نہ کر میں کچھ کرنا ہوں۔“

”کیا خاک کرو گے دس سال سے یہی جملہ سن رہی ہوں میرا حوصلہ ہے جو اتنا برداشت کر چکی ہوں میری جگہ کوئی اور تمہاری بیوی ہوتی وہ تمہیں لات مار کر بھاگ چکی ہوتی۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ تم نے میرا ساتھ نہیں دیا“ اتنی کم آمدنی میں تم میرے ساتھ گزارا کر رہی ہو اس دور میں بڑی بات ہے۔“ امیر الدین نے کہا۔

”اس گھر کی خاطر میں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں جیسی یہ گھر چل رہا ہے میرے کچھ نہ کرنے سے تمہارے سر کے بال نگر سے اتر جاتے اور تمہاری ٹنڈ نظر آتی۔“ بی بی کلثوم



میں اسکول سے تعلیم حاصل کرتا اور دوپہر میں ماموں کی کپڑے کی دکان پر ان کا ہاتھ بناتا اس طرح دو فائدے تھے وہ تعلیم حاصل کر لینے پر ابھی نوکری حاصل کر لینے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ کسی وجہ سے تعلیم حاصل کر لینے کے باوجود نوکری حاصل نہ کرنے پر کپڑے کی دکان کھول کر اچھی زندگی گزار سکتا تھا۔ اس طرح شاہنواز اپنے باپ جیسا نہیں بن سکتا تھا۔ امیر الدین نے بی بی کلثوم کے اس اقدام پر شدید احتجاج کیا مگر وہ اس کے احتجاج کو کب خاطر میں لاتی تھی۔ مگر میں وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتی تھی جب امیر الدین نے دیکھا وہ اس کی نہیں سن رہی وہ خاموش ہو گیا۔

بی بی کلثوم نے جو سوچا تھا وہ ٹھیک تھا۔ میر پور خاص میں ماموں کے پاس رہ کر شاہنواز کا ذہن مکمل رہا تھا وہ تعلیم میں بھی بھرپور طریقے سے حصہ لے رہا تھا اور دکان پر بھی بہت دھیان سے کام کر رہا تھا۔ ماموں فرحان جب عجمی اپنی بہن سے ملنے آتے تھے وہ شاہنواز کی بڑی تعریف کرتے تھے شاہنواز کی تعریفیں سن کر بی بی کلثوم کا سپردوں خون بڑھ جاتا تھا اور اسے اپنے کیے فیصلے پر خوشی ہوتی کہ اس نے بروقت بہت اچھا اقدام اٹھایا ہے۔

شاہنواز کے انتر کرنے پر ماموں فرحان نے اسے کرائے پر ایک دکان ولادی جس میں اس نے ادھار پر کپڑے لے کر کپڑے کی دکان کھول لی۔ بیٹے کے دکان کرنے پر بی بی کلثوم خوشی سے پھولے نہ سار ہی تھی۔

”امیر الدین تم اپنے بیٹے کو اپنے جیسا بنارہے تھے

کند ذہن انسان تھا ترقی کیا ہوتی ہے بہتر مستقبل کے لیے کیسے پلاننگ کی جاتی ہے وہ اس سے نااہل تھا۔ اسے صرف یہ یاد رہتا تھا کہ صبح جلدی اٹھنا ہے اور بیکری سے پیش لے کر کپڑا مارکیٹ نکل جانا ہے پیش بچ جانے پر شہر کی دوسری مارکیٹوں کا رخ کر کے ہر حال میں پیش کو ختم کرنا ہے پیش ختم ہو جانے پر گھر کا رخ کرنا ہے۔

شادی کی ابتدا ہی سے بی بی کلثوم نے امیر الدین کو ترقی کرنے کی غرض سے بہت نصیحتیں کی تھیں امیر الدین کی یہ خوبی تھی کہ اس نے انکار کرنا سیکھا ہی نہ تھا وہ بی بی کلثوم کی ہر بات پر ہاں ہاں کرتا رہتا تھا صبح ہونے پر رات کی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتیں اسے کچھ یاد نہ رہتا تھا۔ کچھ یاد رہتا تھا وہ یہ کہ بیکری جانا ہے دس سال کا عرصہ بیت جانے پر وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کے شوہر میں ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے پھر بھی فصاحت کرنے سے باز نہ آتی تھی۔ ان دس سالوں میں بی بی کلثوم کے ایک بیٹا شاہنواز اور دو بیٹیاں نازش اور نفیسہ پیدا ہوئیں۔ امیر الدین نے جب بی بی کلثوم سے اس بات کا اظہار کیا کہ شاہنواز کے پانچویں پاس کر لینے پر وہ اسے اپنے ساتھ رکھے گا وہ پیش جب کہ شاہنواز کیک بیچے گا اس بات نے بی بی کلثوم کو ڈرا دیا اسے یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ امیر الدین اپنے بیٹے کو بھی اپنے جیسا بنادینا چاہتا ہے اس لیے بی بی کلثوم نے شاہنواز کو اس کے ماموں فرحان کے پاس دوسرے شہر بھیج دیا بی بی کلثوم اپنے بیٹے کی ترقی چاہتی تھی۔ ماموں فرحان کے پاس رہ کر وہ صبح

مگر میری کوشش سے وہ ایک دکان کا مالک بن گیا ہے۔“
بی بی کلثوم نے کہا۔

”دکان مالک کیسے بن سکتا ہے وہ دکان شاہواز بیٹے
نے کرائے پر لی ہے اور مال بھی ادھار پر لیا ہے۔“

”مجھے بھی یہ بات پتا ہے یہ کام تم بھی کر سکتے تھے پھر
کیوں نہیں کیا تم میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی میرے بیٹے
میں وہ صلاحیت ہے آج کرائے پر دکان لے کر مال ادھار
ضرور لیا ہے مگر کچھ عرصہ گزرنے پر وہ اپنی محنت سے ذاتی
دکان بھی خرید لے گا اور دکان کا سارا مال بھی اس کا ذاتی
ہو چکا ہوگا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ امیر الدین نے کہا۔
شاہواز نے دکان کیا کر لی تھی کلثوم بی بی کو اس کے
ساتھ پر سہرا سجانے کی فکر لگ گئی۔

”امیر الدین ہمیں شاہواز بیٹے کی جلد سے جلد شادی
کرتی ہے۔“

”ارے بھئی اتنی جلدی کیا ہے پہلے اس کا کام اچھا
چل جائے پھر دیکھ لیں گے۔“

”مجھ سے اب یہ گھر کا کام نہیں ہوتا مگر میں بہو کے
آ جانے سے مجھے پچھا آرام مل جائے گا۔“ بی بی کلثوم نے
کہا۔

”اری بھگوان تم کیوں کام کرتی ہو ہمارے گھر میں
خیر سے دو بیٹیاں موجود ہیں ان سے کیوں کام نہیں لیتی
ہو۔“

”تم چاہتے ہو میں اپنی پھول سی بیچوں سے ابھی سے
کام لینا شروع کر دوں دوسرے گھر جا کر ساری زندگی انہیں
کام ہی کرتا ہے۔“

”بھگوان اپنی بچیاں گھر میں کام کیسے پر ہی دوسرے
گھر جا کر کام کر نکلیں گی نا۔“ امیر الدین نے اسے
سجھایا۔

”میں کچھ نہیں جانتی ہمیں شاہواز کی شادی کرنی ہے
اور بس۔“ بی بی کلثوم نے اپنا فیصلہ سنایا۔

امیر الدین کی کیا مجال تھی جو بی بی کلثوم کے فیصلے کے
سامنے جوں چراں کرتے وہ بولے۔

”بیٹم تم زیادہ بہتر سمجھتی ہو گھر کیسے چلاتا ہے اور کون گھر
کا کام کرے گا۔“

بی بی کلثوم امیر الدین کی رضامندی جان کر خوش ہوئی
اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی تھی۔
امیر الدین بھی اس خاص چمک کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ
سکا تھا۔ بی بی کلثوم نے شاہواز کے لیے لڑکی کی تلاش
شروع کر دی۔ وہ اس طرح کی لڑکی چاہتی تھیں جو اس کے
اشاروں پر چلے۔ وہ جو کہے بغیر کسی حجت کے اس پر عمل
کرے۔

بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اسے بیٹے شاہواز کے لیے
ایک لڑکی پسند آ گئی وہ ان کے دور پرے کے رشتے داروں
میں تھی۔ لڑکی کا نام مہ جبین تھا۔ بی بی کلثوم کو مہ جبین اس
لے پسند آ گئی تھی وہ کم گوئی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ
اپنے سے بڑے کو جواب نہیں دیتی کسی چپ چاپ سن لیتی
تھی۔ بی بی کلثوم کو ایسی ہی بہو کی تلاش تھی۔ اس لیے جٹ
منگنی اور پٹ بیابا والی بات ہوئی۔ بیٹے شاہواز کو بھی کیا
اعتراف ہو سکتا تھا وہ لڑکی کی تصویر دیکھ کر خوش ہو گیا تھا کہ
اس کی امی کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ حالانکہ اس کے
ماسوں کی خواہش تھی کہ اپنے بھانجے کو اپنی بیٹی دیں گے اس
کی لڑکی شریا بہت من زور اور خود بھی ایسی لڑکی جس طرح
سے بی بی کلثوم کو پسند آ سکتی تھی اس کے سامنے اس کے
شوہر کی مجال نہیں تھی کہ زبان کھولیں سکے۔

شادی پر خوب خوشیاں منائی گئیں بی بی کلثوم نے بھی
اپنے دل کے ارمان شادی پر پورے کیے تھے۔ وہ بہو
کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ شادی ہو جانے پر وہ ابھی
اس پوزیشن میں نہیں آ سکا تھا کہ اپنی بیوی اور والدین کو
میر پور خاص میں کرائے پر مکان دلا سکے۔ اس لیے ہر بیٹے
وہ پچھلی والے دن ملنے چلا آتا تھا۔ مہ جبین کو شاہواز کے
چھٹی کے دن آنے کا انتظار رہتا تھا۔ نئی نئی شادی تھی اس
لے پورا ہفتہ ایک ایک دن کیسے گن کر گزارتا تھا یہ وہی جانتی
تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے پاس رہے
یا انہیں وہاں لے جائے جہاں اس کا کاروبار ہے وہ جب
بھی اس سے ملنے آتا وہ شکوہ کرتی کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ
سکتی وہ یہی سمجھتا تھا۔ ”تم ذرا صبر کرو میں اس پوزیشن میں
آ جاؤں کہ تمہیں وہاں لے جا سکوں۔“

چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ وہ اسے میر پور خاص نہیں لے
جاسکا تھا۔ مہ جبین نے بی بی کلثوم سے شکوہ کرتے ہوئے

کہا۔

”امی جان میں کب تک ایسے گزرا کرتی رہوں گی۔“
”کیوں کیا ہوا؟“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”میں ادھر اور میرا شوہر مجھ سے پورا ایک ہفتہ دور رہتا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے لوگ اپنے بیوی بچوں کی خاطر ملک سے باہر چلے جاتے ہیں میرا بیٹا خیر سے شہر سے باہر ہی رہتا ہے جیسے ہی وہ اس پوزیشن میں آئے گا کہ تمہیں اور ہمیں اپنے پاس بلا لے گا۔“

”چنانچہ وہ دن کب آئے گا۔“ مہ جبین نے کہا۔
”تم ان باتوں کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ کچھ امید ہوتی ہے یا انتظار ہے۔“

”امی جان کیسی امید؟“ وہ چوکی۔

”ارے بھئی امید سے مراد بچے سے ہے۔“

”امی ابھی ایسا کوئی سلسلہ بتائیں ہے۔“

”کمال ہے شادی کو چھ ماہ گزر گئے ہیں ابھی تک کوئی امید نہیں جاگی۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“

”تو لگزنڈر میرے ایک جاننے والے بابا ہیں ان کے پاس چلیں گے۔“

”ان کے پاس کیوں چلیں گے۔“ مہ جبین نے کہا۔

”کمال ہے تجھے میں کیسے سمجھاؤں۔“ بی بی کلثوم نے

اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”کیوں امی میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔“

”تجھے اتنا بھی نہیں پتا کسی حامل کے پاس کیوں جاتے ہیں۔“

”کیوں جاتے ہیں؟“ مہ جبین نے کہا۔

”میری بیٹی میں تجھے حامل فضل الدین کے پاس اس لیے لے کر جا رہی ہوں کہ وہ پڑھائی کر کے تائیس گے کہ

تجھے اولاد کیوں نہیں ہو رہی ہے کہیں کسی نے کوئی بندش یا

آسیب وغیرہ کا سایہ تو نہیں ہے ایسا ہونے پر وہ کاٹ

کر دیں گے۔“

”امی جان تھوڑا صبر کر لیں۔“

”اور کتنا صبر کروں چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ بس تمہیں بابا

فضل الدین کے پاس چلنا ہے۔“ بی بی کلثوم نے اپنا فیصلہ

سنادیا۔

”بابا فضل الدین ایک 60 سال کی عمر کا آدمی تھا، سر پر ٹوپی اور قمیص پر کالی شیر دانی قمیص کے نیچے دعوتی چہرے پر داڑھی تھی آستانے پر کئی عورتیں اور بھی بیٹھی تھیں جب

ان کی باری آئی بابا فضل الدین نے مہ جبین کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”ہوں..... آسیب؟ اس بچی پر آسیب کا سایہ ہے اور آسیب بھی بہت خطرناک ہے اتنی آسانی سے نہیں جائے گا۔“

”آسیب ہے۔“ بی بی کلثوم چوکی۔

”ہاں آسیب ہے یہ نہا کر بال کھولے چمت پر چلی گئی تھی اس وقت آسیب نے اسے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گیا ہے۔“

”بابا کچھ کریں اس کی آسیب سے جان چھوٹ جائے

اس کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک بچے کا کوئی

آسرا نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”بچے کا آسرا کیسے ہوگا آسیب ہونے ہی نہیں دے گا۔“

”وہ کیوں؟“

”بی بی تم بھی بہت بھولی ہو یہ آسیب ہے وہ انسان کا پکا دشمن ہے وہ کب چاہے گا کہ انسانوں کی آبادی میں

اشافہ ہو۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

”بابا یہ بات تم کچھ کہہ رہے ہو میرے بیٹے کی شادی کو

چھ ماہ ہو چکے ہیں مگر وہ آسیب بچے نہیں ہونے دے رہا ہے

بابا کچھ ایسا کرو کہ ہماری اس آسیب سے جان چھوٹ

جائے۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”بی بی یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا

ہے۔ تمہاری بہو پر جو آسیب ہے وہ خطرناک ہے اتنی

آسانی سے نہیں جائے گا۔“

”چاہے کچھ بھی کرو بس اس آسیب کو بھگا دو۔“ بی بی

کلثوم نے کہا۔

”تجھے اس کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی ایک

اذیت سے گزر کر ہی اس کا آسیب سے چھٹکارا حاصل

ہو سکتا ہے۔“

”بابا میں کچھ نہیں جانتی بس تمہیں اس آسیب

کو بھگانا ہے۔“

”بی بی تم میرے آستانے پر آئی گئی ہو تو مجھے کچھ نہ کچھ کرتا پڑے گا“ تمہاری بہو پر جو آسیب ہے وہ جلائی ہے علاج کے دوران ہم پر حملہ آور بھی ہو سکتا ہے مگر میں اس کا بھی علاج کر لوں گا تاکہ اس کے حملے سے محفوظ رہا جاسکے۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

”بابا میں تمہارے آستانے پر بڑی امیدوں سے آئی ہوں تمہاری میں نے بہت شہرت سنی ہے۔“ بی بی کلثوم نے مسکرا لگایا۔

”شہرت بھی جیسی ہوتی ہے جب لوگوں کے مشکل کام آسانی سے ہو جاتے ہیں میں جب آستانے پر بیٹھتا ہوں تو پورے آستانے کا حصار کر کے بیٹھتا ہوں“ جانتی ہو میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

”کیوں کرتے ہو؟“

”میں اس لیے کرتا ہوں کہ جو عملیات کا کام کرتے ہیں ان کے آسیب بہت بڑے دسمن ہوتے ہیں وہ اس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کب ہمیں موقع ملے اور عامل پر حملہ کر کے اپنا انتقام لیں۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

”بابا جیسے بھی ہو اس کا علاج کر دیں۔“ کلثوم نے کہا۔

”کیا یہ علاج کی سختی برداشت کر لے گی؟“

”بابا سختی سے کیا مراد ہے؟“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”میں اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کچھ تشدد کروں گا تاکہ آسیب گھبرا کر اس کے جسم سے نکل جائے ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ جلائی جنات آسانی سے قابو نہیں آتے جب ان پر تشدد ہو تو یہ بھاگنے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔“

”بابا تم اس کا علاج شروع کر دو“ ہمیں اس جن سے جان چھڑانا ہے اس لیے ہو کو یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔“

”میں آج تمہیں چند تعویذ دے رہا ہوں یہ اس کے جسم پر ملنا ہیں روزانہ ایک تعویذ جسم پر مل کر جلانا ہے ایک ہفتے بعد تمہیں پھر یہاں آنا ہے۔“

”ٹھیک ہے بابا“ بی بی کلثوم نے تعویذ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

گھر جاتے ہوئے جب وہ ساس بہور کشتے میں بیٹھیں بہو سے برداشت نہ ہوا اور وہ بول پڑی۔

”امی مجھے یہ بابا ڈھونگ لگ رہا ہے۔“

”اے کیا منہ سے اول فول بک رہی ہے بابا بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔“

”میری سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آ رہی ہیں۔“

”کون سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”یہی کہ ہاتھ پیر باندھ کر علاج کریں گے۔“

”تیری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آ رہی ہے کہ بابا نے کہا تھا کہ وہ دوران علاج اپنے بچاؤ کی غرض سے تمہارے ہاتھ پاؤں باندھیں گے۔“

”وہ ٹھیک ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ عملیات والے بابا جنات سے بچاؤ کی غرض سے اپنا حصار باندھ لیتے ہیں تاکہ جنات ان پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔“

”تو چپ کر بابا زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کب کیا کرنا ہے جو بھی ہوگا وہ ہمارے سامنے ہی ہوگا“ اور میں خود بھی وہاں موجود ہوں گی تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بی بی کلثوم غصے سے بولی۔

”ساس کو غصے میں آنا دیکھ کر وہ سہمی گئی اور اس نے چپ رہنے میں عافیت جانی۔“

بی بی کلثوم نے بابا کی بات پر مکمل عمل کیا وہ روزانہ بہو کے جسم پر ایک تعویذ مل کر جلا دیتی وہ بہت خوش تھی اور وہ کیوں خوش نہ ہوئی اس کی مراد بڑانے کی امید بھی تھی امیر الدین نے اس کے ضرورت سے زیادہ خوش ہونے پر پوچھ ہی لیا۔

”بھانگوان کیا بات ہے آج کل تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“

”ہات ہی ایسی ہے۔“

”ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے بھی چھپائی جا رہی ہے۔“

”تم سے کیا چھپاؤں گی بہو کے حوالے سے میں خوش ہوں کہ کچھ امید پیدا ہوئی ہے۔“

”کیا بہو امید سے ہے۔“ امیر الدین نے پوچھا۔

”ابھی کہاں امید سے ہو جائے گی۔“

”بھانگوان تم خوش ایسے ہو جیسے وہ امید سے ہو گئی ہے۔“

”میں بابا فضل الدین کے پاس گئی تھی اور اس نے یقین دلایا ہے کہ بہو امید سے ہو جائے گی۔“

”بابا فضل الدین کو کیا غیب کا علم آتا ہے کہ بہو امید سے ہو جائے گی۔“

”تم بھی نرمے بدھو ہو۔۔۔۔۔ بابا بہو کا علاج کریں گے۔“

”بابا کیا ڈاکٹر بھی ہیں؟“ امیر الدین چونکا۔

”میں تم سے کیا کہوں میاں جی اتنی عمر ہوئی ہے مگر عقل آج تک نہیں آئی بابا ڈاکٹر نہیں ہیں وہ بہو کا روحانی علاج کریں گے۔ انہوں نے سات تعویذ دیئے ہیں اور روزانہ ایک تعویذ بہو کے جسم پر مل کر جلاتا ہے پورے تعویذ جلانے پر بابا کے پاس جاتا ہے۔“

”بابا نے بہو کے لیے کیا بتایا ہے۔“ امیر الدین نے پوچھا۔

”بابا نے بتایا ہے کہ بہو پر ایک جن کا اثر ہے جس کو بھگتا پڑے گا، کیونکہ وہ جن بچے نہیں ہونے دے گا۔“

بی بی کلثوم نے بتایا۔

”بھاکوان مجھے تو پہلے ہی جنات سے ڈر لگتا ہے اب جن بہو کے ذریعے ہمارے گھر میں داخل ہو گیا ہے، تم بہو کا جلدی سے علاج کرا کے اس جن کو بھگا دو کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمارے بیٹے یا ہمیں کوئی نقصان پہنچا دے۔“

”میں اسی لیے بہو کا علاج کرا رہی ہوں۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”بیگم تم علاج میں کسی قسم کی کوتاہی مت برتنا۔“ امیر الدین نے کہا۔

وہ بچپن سے ہی ڈر پوک ثابت ہوا تھا۔ وہ جنات سے بہت ڈرتا تھا، بہو پر جن کا اثر سن کر وہ بری طرح سے ڈر گیا تھا۔

مہ جبین کو فضل الدین بابا پر کسی طور سے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اسے فراڈی بابا تصور کر رہی تھی۔ وہ بابا فضل الدین کے تعویذ بھی بہت بے دلی سے اپنے جسم پر مل کر جلا رہی تھی۔ مہ جبین کا دل اپنے شوہر شاہنواز کے بغیر گھر میں نہیں لگتا تھا، وہ ہر جتنے شوہر کے آنے پر شکایت کرتے ہوئے کہتی۔

”شاہنواز مجھے کب تک تمہارے بغیر یہاں

رہتا پڑے گا۔“

”تم یہاں اکیلی نہیں ہوتی ہو میرے والد والدہ اور بہنیں بھی یہاں ہوتی ہیں تم ان کے ساتھ مکمل کر رہا کر میرے والدین کو اپنے والدین اور میری بہنوں کو اپنی بہن سمجھ کر زندگی گزارو۔“

”شوہر کی خاطر میں اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں اور تم میرے پاس ہوتے نہیں ہو یقین کر دو میں تمہارے نہ ہونے پر کس قدر یوریت محسوس کرتی ہوں۔“

”تم یوریت کا شکار کیوں ہوتی ہو ارے بھئی ٹی دی پروگرام دیکھو گمانے سنو کتابیں پڑھو تمہیں کس نے روکا ہے۔“

”میں ہر وقت ہی کتابیں پڑھتی رہوں ٹی دی اور مکانوں سے دل نہیں بھلا سکتی مجھے شوہر کی رفاقت چاہیے۔“

”بس یہ کچھ دن کی دوری ہے پھر ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔“

”یہ سنتے ہوئے مجھے چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا ہے ابھی تک کچھ ایسے آثار ظاہر نہیں ہوئے کہ پتا چلے کہ ہم ساتھ رہ سکیں۔“

”جانو لوگ اپنے بیوی بچوں کی خاطر مستقبل سنوارنے بیرون ملک چلے جاتے ہیں اور کئی کئی سال بعد ملنے آتے ہیں تم خوش نصیب ہو کہ میں تم سے دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر رہتا ہوں ایمر جنسی کی صورت میں جب چاہوں تمہارے پاس آ سکتا ہوں۔“ وہ کہتا۔

”مجھے اس طرح جھوٹی تسلیاں مت دیا کرو سچ بتاؤ کہ یہ دوریاں کب ختم ہوں گی۔“

”میں تمہیں گیسے سمجھاؤں۔“

”میں کچھ سمجھتا نہیں چاہتی مجھے بس یہ بتاؤ کب ہمیں اپنے ساتھ رکھو گے۔“ وہ غصہ کرتی۔

ابتداء میں بہو مہ جبین بھل جاتی تھی مگر اب منکر کرنے لگی تھی شوہر کی جدائی اسے برداشت نہیں ہوتی تھی، بہو کی اکثر اس معاملے میں تو تو میں میں ہونے لگی تھی وہ بہو کا ساتھ رکھنا چاہتی تھی اور بہو شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

ایک دن ساس بہو میں ساتھ رہنے کے معاملے پر اس قدر ٹکراؤ برپا ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ بی بی کلثوم فوراً دوڑی

دوڑی ڈاکٹر کے پاس گئی ڈاکٹر نے بہوؑ میں کوکھڑا کر چیک کیا اور بتایا کہ اسے ذہنی صدمہ پہنچا ہے جس کے سبب بے ہوش ہوگئی ہے۔ انکشن لگنے اور دوائی کھانے سے اسے ذہنی آرام آ گیا تھا لیکن اب مہ جیسں کوٹھی کے دورے پڑنے لگے تھے۔

مہ جیسں کو عامل فضل الدین کے پاس لے جاتے ہوئے بی بی کلثوم کو پندرہ دن ہوچکے تھے۔ بابا فضل الدین نے ابھی تک مہ جیسں کو ہاندھ کر اس پر تشدد نہیں کیا تھا تیسری مرتبہ جانے پر بھی اسے ایسے ہی ٹھٹھا ہوا تھا وہ اپنی آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہے تھے۔ بابا فضل نے اپنی آنکھیں کھول کر غصے سے مہ جیسں کو گھورا۔

”بول تو اسے چھوڑے گا یا نہیں؟“

مہ جیسں خاموش رہی وہ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر غصے میں آ گئے اور اپنے پاس رکھی چھڑی مہ جیسں پر برسانی شروع کر دی۔ مہ جیسں اس آفت سے گھبرا کر اپنی ساس کے پیچھے جیسے کی کوشش کرنے لگی۔ ساس نے مہ جیسں کو دھکا دے کر واپس اسے عامل بابا فضل کے آگے کر دیا۔ بابا فضل الدین نے بڑی بے رحمی سے مہ جیسں پر لک چھڑی سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ سسک پڑی اور روتا شروع کر دیا۔ مہ جیسں کو روتا دیکھ کر عامل بابا فضل الدین نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

”بڑا ہی ڈھیٹ ہے اتنی مار کھا کر بھی بول نہیں رہا ہے۔“ عامل بابا فضل الدین نے کہا۔

”بابا اب کیا ہوگا؟“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”تو فکر نہ کر میرے آستانے پر آئی ہے تجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گا۔“

”بابا یہ جن بہو کو چھوڑ دے گا نا؟“

”یہ جن بہت ڈھیٹ ہے اتنی مار کھا کر بھی خاموش ہے میں اس کو بولنے اور بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے بابا فضل الدین نے کئی جگہ لگتی اگر جیتوں کا دھواں مہ جیسں کے چہرے پر کر دیا جس سے بہو کی حالت خراب ہوگئی اور اس کا دم ٹھٹھنے لگا کچھ دیر گزرنے پر مہ جیسں کے چہرے کے سامنے سے اگر جیتوں کو بھالایا اگر جیتی بیٹے پر اس نے سکھ کا سانس لیا اور نہ بہو کو یقین ہو چلا تھا کہ عامل بابا اس کا دم کھونٹ کر ہلاک کر دے گا۔

”ٹھیک ہے آج اس خبیث کے لیے انتہائی کافی ہے تم تین دن بعد آنا اور یہ تین عویز دے رہا ہوں تم بہو کے جسم پر روزانہ ایک عویز مل کر جلا دینا۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

بی بی کلثوم نے بابا فضل الدین کی بات پر پورا عمل کیا اور تین دن بعد پھر بہو کے لیے کر عامل بابا فضل الدین کے آستانے پر پہنچ گئی۔ مہ جیسں آستانے پر جانے کو تیار نہ تھی۔

”امی مجھے اس بابا کے پاس نہیں جانا۔“

”کیوں نہیں جانا۔“ بی بی کلثوم نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

”وہ خواہ مخواہ مجھ پر تشدد کر رہا ہے وہ جن کو مارنے کی بجائے مجھے مار رہا ہے۔“ مہ جیسں نے کہا۔

”یہ تمہارا وہم ہے اسکا بات نہیں ہے۔“

”مار مجھے پڑ رہی ہے اور کہہ رہی ہو مجھے وہم ہو گیا ہے۔“

”زیادہ باتیں مت بنا“ خاموشی سے اپنا علاج کرائے۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

مہ جیسں نے بہت ضد کی کہ وہ بابا فضل الدین کے پاس نہیں جائے گی بی بی کلثوم نے اس کی ایک نہ سنی اور زبردستی بابا کے پاس لے گئی۔

”بابا بہو آستانے پر آنے سے انکار کر رہی تھی میں اسے زبردستی لے کر آئی ہوں۔“ بی بی کلثوم نے بتایا۔

”عامل فضل الدین نے زیر لب کچھ بڑھا دیا آستانے کی صحبت کی طرف دیکھا۔“

”جن بہت پریشان ہو گیا وہ بہو کو کسی صورت میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے وہ بہو کو کسی نہ کسی طرح آستانے پر آنے سے روکنا چاہتا ہے تم بہو کی بھتری چاہتی ہو تو اسے آستانے پر لائی رہو میں اس جن کو بھگا کر ہی لوں گا۔“ بابا فضل نے کہا۔

”بابا میں نے اس لیے بہو کی ایک نہ چلنے دی اور یہاں لے آئی ہوں۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”تم نے بہت اچھا کیا۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

آستانے کے برابر میں ایک اور کمرہ تھا۔ بابا فضل الدین مہ جیسں کو اس کمرے میں لے گیا اور ساس کی مدد

کی پوری فوج بھی آجائے میں اس پوری فوج کو دیکھ لوں گا۔“ بابا نے کہا۔

بی بی کلثوم بابا کی بات سن کر خوش ہو گئیں۔

”امی میں اب اس بابا کے پاس نہیں آؤں گی۔“ مہ جیوں نے رکشے میں بیٹھے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں آئے گی۔“ ساس چوکی۔

”یہ بابا بہت ظالم ہے یہ دیکھو اس نے میرا بازو بھی کر دیا ہے۔“ مہ جیوں نے اپنا زخمی ہاتھ دکھایا۔

”بابا یہ سب تمہارے بھلے کو کر رہے ہیں تجھ پر جس جن کا اثر ہے وہ اپنا منہ نہیں کھول رہا ہے۔ اس کے منہ کھولنے پر کچھ کام بنے گا ورنہ بابا کو اس جن کو جلا تاڑ جائے گا۔“ بی بی کلثوم نے بتایا۔

گھر پہنچ کر مہ جیوں نے ہاتھ پر پٹے مگر بی بی کلثوم نے اس کی نہ سنی اور اپنا یہ فیصلہ برقرار رکھا کہ اسے بابا سے علاج کرنا پڑے گا۔

دوسرے دن رات گئے اس کا شوہر شاہنواز بھی گھر لوٹ آیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے بابا سے علاج کے بارے میں پتا چلی تھی اور وہ اس سے علاج نہ کرانے کا کہہ چکی تھی مگر وہ بھی اپنی ماں بی بی کلثوم کا حامی نکلا اور بولا۔

”دیکھو میری امی تمہارے بھلے کو یہ کر رہی ہیں کیا تم نہیں جانتی کہ تمہارا جن سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور اس گھر کے آگن میں ہمارے بچے نکلیں۔“

”کون عورت نہیں چاہے گی کہ اس کے بچے ہوں مگر وہ بابا بہت ظالم ہیں۔ میرے چھڑی مار مار کر جسم میں لکیریں ڈال دیں۔“ مہ جیوں نے اپنے اوپر کیے تشدد کے نشانات دکھائے۔

”یہ دیکھو میرا بازو اس پر چاقو گرم کر کے اس کی نوک میرے بازو پر کٹی بار لگائی ہے۔“

تشدد کے نشانات دیکھ کر شاہنواز کو ایک اذیت کا احساس ہوا مگر وہ پھر بولا۔

”دیکھو میری امی تمہارے بھلے کو یہ کر رہی ہیں ہر عامل کا اپنا اپنا علاج کا طریقہ کار ہوتا ہے ہو سکتا ہے تمہارا علاج اسی طرح ممکن ہو۔“ شوہر شاہنواز نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا تھا۔

دوسرے بچے شوہر شاہنواز کو دیکھ کر مہ جیوں نے اپنا دوسرا بازو دکھاتے ہوئے پھٹ پڑی۔

سے بہو کے ہاتھ پر باندھ دیئے اور اسے سیدھا زمین پر لٹا دیا اور ایک چراغ جلا دیا، عامل بابا نے ایک چمک کاٹنے والا چاقو بھی نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”بی بی تم اب کمرے سے نکل کر آستانے میں بیٹھ جاؤ۔“ کیونکہ تمہاری بہو کا جن اس میں سے نکل کر تمہارے جسم میں داخل ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ تمہارے جسم میں جن کا ایک بار داخل ہونے کا مطلب ہے کہ وہ تم دونوں کو تنگ کرے گا۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

بی بی کلثوم خوف زدہ ہو کر کمرے سے نکل گئی۔ بابا فضل نے چاقو کی نوک کو چراغ کی لو پر گرم کرتے ہوئے منہ میں کچھ پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ بہو خوف زدہ تھی کہ نہ جانے اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

”بول اس کا پیچھا چھوڑے گا یا نہیں۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

مہ جیوں پر جن کا اثر ہوتا وہ بولتی وہ خوف زدہ نظر سے بابا فضل کو دیکھ رہی تھی۔

اپنا ایک بابا فضل نے چاقو کی سرخ نوک مہ جیوں کے بازو میں لگا دی۔ مہ جیوں کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دھککا لگا رہا ہے اس کے بازو پر رکھ دیا ہے اس کی چیخ نکلی تھی۔ یہ عمل بابا فضل الدین نے ہی بار بار دہرایا اور مہ جیوں کی خاموشی پر اس نے بی بی کلثوم کو آواز دے کر کمرے میں بلا کر مہ جیوں کے ہاتھ پر کھولنے کا حکم دیا۔ بی بی کلثوم نے مہ جیوں کے ہاتھ پر کھول دیئے۔ بابا فضل نے تین توہیز جلائے کے دے کر تین دن بعد انہیں بلا لیا، مہ جیوں کو گرم گرم چاقو گلنے سے بازو میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

”یہ جن بڑا ڈھیٹ ہے اپنی زبان نہیں کھول رہا ہے مگر میں اس کی زبان کھلو کر رہوں گا اور جب تک یہ بہو کا پیچھا نہیں چھوڑ دیتا میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

”بابا یہ جن کب تک پیچھا چھوڑے گا۔“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ جلد سے جلد اس کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں اس جن کو جلا کر جسم کر دوں گا۔“ بابا فضل الدین نے کہا۔

”بابا بہو کو تو کچھ نہ ہوگا۔“

”بہو کو کیسے کچھ ہو سکتا ہے ہم کس لیے بیٹھے ہیں جنات

”دیکھو اس بوڑھے ڈھونگی بابا نے میرے دوسرے بازو کو بھی چاقو سے زخمی کر دیا ہے ابھی اس نے دونوں بازو زخمی کیے ہیں کل کو وہ ظالم میرے پورے جسم کو زخمی کر کے رکھ دے گا۔“

دونوں زخمی بازو دیکھ کر ایک لمبے کوشا ہنواز کو بہت دکھ ہوا اور پریشانی کے عالم میں اپنی امی سے بابا کے ظلم پر احتجاج کیا۔ بی بی کلثوم غصے سے پھٹ پڑیں۔

”میں کیا تمہارا برا چاہا ہوگی؟“

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم میرا برا چاہو گی؟ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ.....“

”میں خوب سمجھ رہی ہوں یہ بہو نہیں وہ حرامی جن کہہ رہا ہے وہ چاہتا نہیں ہے کہ ہم بھوکا علاج کرائیں اس لیے وہ بھوکا بابا سے بدظن کر رہا ہے یہ تشدد بھوکا پر ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تکلیف پڑھانی کے ذریعے حیثیت جن کو بچھ رہی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح بھوکا علاج رک جائے۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”امی یہ بات تم ٹھیک کہہ رہی ہو واقعی ایسا ہی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”ہاں کیا بولیں امی؟“ بہو نے شاہنواز کو اپنے کمرے میں دیکھ کر پوچھا۔

”امی جان سے میری بات ہو گئی ہے اور میں ان کی بات سے بالکل مطمئن ہوں۔ تم اپنا علاج جاری رکھو۔“

”چاہے وہ مجھے جان سے مار دے۔“ مہ جبین غصے سے بولی۔

”وہ تمہارا دشمن نہیں ہے جو تمہیں جان سے مارے گا تم شک و شبہ میں نہ پڑو اور اپنا علاج کرائی رہو میں تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچنے نہیں دوں گا میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔“ شاہنواز نے کہا۔

”اور یہ جو تکلیف پہنچ رہی ہے۔“ بہو نے دونوں بازو دکھاتے ہوئے کہا۔

”میں مانتا ہوں تمہیں تکلیف ہوئی ہے لیکن کسی بڑی تکلیف سے چھوٹی تکلیف اچھی ہے کم از کم اس منہوں جن سے تمہیں چھٹکارا مل جائے گا اور ہم سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔“ شاہنواز نے کہا۔

مہ جبین کو کئی بار بابا فضل الدین کے پاس

جانا پڑا اور ہر بار بابا فضل الدین اس کے جسم کو کسی نہ کسی جگہ سے داغ دیتا اس کا کٹی جگہ سے جسم داغ دار ہو چکا تھا ہر بار ساس اور شوہر سے ضد کرتی کہ وہ بابا فضل کے پاس نہیں جائے گی مگر بی بی کلثوم زبردستی لے جاتی مہ جبین بابا فضل سے بے زار ہو چکی تھی ایک دن غصے میں آ کر مہ جبین نے عامل بابا فضل سے بدتمیزی کر دی والی۔

”بابا تم کیوں ہر بار میرے جسم کو داغ دیتے ہو؟ کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کس اذیت سے گزرتی ہوں۔“

”میں تمہارے بھلے کو بہہ کرتا ہوں۔“

”تمہاری بیٹی کیسا تھ کوئی ایسا کرے پھر تمہیں کیسا لگے گا؟ کس قدر تکلیف ہوگی۔“

”تمہیں اپنا علاج نہیں کرنا مت کرنا اور یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بابا فضل نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں کب علاج کرانے آتی ہوں میری ساس زبردستی لے آتی ہے۔“

”میں بھی تمہاری ساس کے کہنے پر ہی علاج کر رہا ہوں وہ تمہیں نہ لائے تو میں بھی تمہارا علاج نہ کروں۔“ بابا فضل نے کہا۔

”مجھے تم دھوکے باز لگتے ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں میرا علاج کرتے ہوئے آج تک جن ظاہر نہیں ہوا اور میں نے جتنے بھی عامل دیکھے ہیں انہیں تعویذ اور پڑھانی سے جن کو ضرور بھگاتے ہوئے دیکھا ہے تم پہلے بابا ہو جو میرے جسم کو زخمی کیے جا رہے ہو۔“ بہو نے غصے سے کہا۔

بابا فضل الدین کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے بھوکا بات ناگوار گزرتی تھی۔ مہ جبین کے زبان چلانے کا یہ فائدہ ہوا اس دن بابا نے اس کا جسم چاقو سے نہیں داغا اس نے تین تعویذ چلانے کے لیے دے کر ساس بہو کو روانہ کر دیا۔

”کیا بات ہے آج بابا بہت غصے میں تھے۔“ بی بی کلثوم نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ میری بات پر غصہ ہو گئے تھے۔“

جگہ سے داغ دیتا اس کا کٹی جگہ سے جسم داغ دار ہو چکا تھا ہر بار ساس اور شوہر سے ضد کرتی کہ وہ بابا فضل کے پاس نہیں جائے گی مگر بی بی کلثوم زبردستی لے جاتی مہ جبین بابا فضل سے بے زار ہو چکی تھی ایک دن غصے میں آ کر مہ جبین نے عامل بابا فضل سے بدتمیزی کر دی والی۔

”بابا تم کیوں ہر بار میرے جسم کو داغ دیتے ہو؟ کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کس اذیت سے گزرتی ہوں۔“

”میں تمہارے بھلے کو بہہ کرتا ہوں۔“

”تمہاری بیٹی کیسا تھ کوئی ایسا کرے پھر تمہیں کیسا لگے گا؟ کس قدر تکلیف ہوگی۔“

”تمہیں اپنا علاج نہیں کرنا مت کرنا اور یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بابا فضل نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں کب علاج کرانے آتی ہوں میری ساس زبردستی لے آتی ہے۔“

”میں بھی تمہاری ساس کے کہنے پر ہی علاج کر رہا ہوں وہ تمہیں نہ لائے تو میں بھی تمہارا علاج نہ کروں۔“ بابا فضل نے کہا۔

”مجھے تم دھوکے باز لگتے ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں میرا علاج کرتے ہوئے آج تک جن ظاہر نہیں ہوا اور میں نے جتنے بھی عامل دیکھے ہیں انہیں تعویذ اور پڑھانی سے جن کو ضرور بھگاتے ہوئے دیکھا ہے تم پہلے بابا ہو جو میرے جسم کو زخمی کیے جا رہے ہو۔“ بہو نے غصے سے کہا۔

بابا فضل الدین کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے بھوکا بات ناگوار گزرتی تھی۔ مہ جبین کے زبان چلانے کا یہ فائدہ ہوا اس دن بابا نے اس کا جسم چاقو سے نہیں داغا اس نے تین تعویذ چلانے کے لیے دے کر ساس بہو کو روانہ کر دیا۔

”کیا بات ہے آج بابا بہت غصے میں تھے۔“ بی بی کلثوم نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ میری بات پر غصہ ہو گئے تھے۔“

”بابا فضل نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔“

”میں کب علاج کرانے آتی ہوں میری ساس زبردستی لے آتی ہے۔“

”میں بھی تمہاری ساس کے کہنے پر ہی علاج کر رہا ہوں وہ تمہیں نہ لائے تو میں بھی تمہارا علاج نہ کروں۔“ بابا فضل نے کہا۔

”مجھے تم دھوکے باز لگتے ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں میرا علاج کرتے ہوئے آج تک جن ظاہر نہیں ہوا اور میں نے جتنے بھی عامل دیکھے ہیں انہیں تعویذ اور پڑھانی سے جن کو ضرور بھگاتے ہوئے دیکھا ہے تم پہلے بابا ہو جو میرے جسم کو زخمی کیے جا رہے ہو۔“ بہو نے غصے سے کہا۔

بابا فضل الدین کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے بھوکا بات ناگوار گزرتی تھی۔ مہ جبین کے زبان چلانے کا یہ فائدہ ہوا اس دن بابا نے اس کا جسم چاقو سے نہیں داغا اس نے تین تعویذ چلانے کے لیے دے کر ساس بہو کو روانہ کر دیا۔

”کیا بات ہے آج بابا بہت غصے میں تھے۔“ بی بی کلثوم نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ میری بات پر غصہ ہو گئے تھے۔“

”کیا بات ہے آج بابا بہت غصے میں تھے۔“ بی بی کلثوم نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ میری بات پر غصہ ہو گئے تھے۔“

”وہ میری بات پر غصہ ہو گئے تھے۔“

”کون سی بات“

”مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نے کہہ دیا کہ جن ابھی تک ظاہر نہیں ہوا اور تم میرے جسم کو داغدار بناتے رہتے ہو۔“

”تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔
”کیوں نہ کہتی۔“

”کہیں بابا ناراض ہو کر تمہارا علاج کرنا نہ چھوڑ دیں۔“ بی بی کلثوم نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ علاج نہیں چھوڑیں گے ہاں ایک فائدہ ہو گیا کہ آج بابا نے میرے جسم کو داغ نہیں بس پڑھائی کر کے گھر بھیج دیا ہے۔“ مہ جبین نے کہا۔

بی بی کلثوم مہ جبین کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی تھی اسے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ بابا فضل الدین کہیں بہو کا علاج کرنے سے نہ روک دیں۔

گھر پہنچ کر مہ جبین بہت خوش تھی اس نے آج کے واقعے سے اعزاء لگا لیا تھا کہ اب عامل بابا فضل الدین اس کے جسم پر تشدد نہیں کریں گے۔ بہو یہ بات اچھی طرح سے سمجھ چکی تھی کہ اس پر جن کا اثر نہیں ہے اگر ہوتا تو وہ اب تک ظاہر ہو جاتا اب وہ محض ساس کی تسلی کے لیے علاج کر رہی تھی اور یہ چاہتی تھی کہ بابا فضل اس پر تشدد نہ کرے۔

مہ جبین کی یہ خوش فہمی تھی کہ بابا فضل کو اس کی بات کڑی لگی تھی مگر وہ اس وقت بات کو پی گئے تھے مگر انہیں مہ جبین پر سخت غصہ رہا تھا۔ اسے مہ جبین کا اس طرح سے بدتمیزی کرنا بالکل بھی پسند نہیں آتا تھا۔

بی بی کلثوم جب بہو کو لے کر گئی آستانے پر خواتین کا رش کم ہو چکا تھا ورنہ وہ جب بھی بابا کے پاس جاتی تھی خواتین کا آستانے پر ہجوم رہتا تھا۔ چند خواتین آستانے پر بیٹھی تھیں بابا نے انہیں جلدی سے رخصت کر دیا خواتین کے رخصت ہو جانے پر بابا ساس اور بہو کو برابر کے کمرے میں لے گیا اور ہر بار کی طرح بہو کے ہاتھ پیر باندھ کر سیدھا مین پر لٹا دیا۔ بی بی کلثوم جب کمرے سے نکل کر باہر جانے لگی تو بابا فضل نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”بی بی آج تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا بابا؟“

”یہ کچھ سامان ہے جلدی سے پنساری کی دکان سے لے آؤ۔“ بابا فضل الدین نے ایک لٹ اسے تھمادی۔
کاغذ پر چند چیزوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔
”بابا یہاں پنساری کی دکان کہاں پر ہے۔“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”باہر سڑک پر نکل کر دیکھو دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر پنساری کی دکان آ جائے گی۔“ بابا فضل نے کہا۔
”ای جلدی آ جانا۔“ بہو نے کہا۔

”ہاں ہاں جلدی آ جاؤں گی میں کون سا وہاں بسے جا رہی ہوں۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

بی بی کلثوم کے جانے پر بابا فضل الدین نے پانچ منٹ بعد کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ تھی جسے بہو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

”یہ دروازہ کیوں بند کر دیا۔“ بہو نے پوچھا۔

”مجھے اس دن بدتمیزی کرنے کا مزا چکھانا ہے۔“ بابا فضل نے کہا۔ ”ہاں مزا چکھانا ہے۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگا مہ جبین اپنا جسم بندھا ہونے پر بے بسی تھی وہ بہو کی طرف لپکا اور اسے بری طرح بھنبھونے لگا۔
”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“ وہ زور سے چیختی۔

”خاموش رہو تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جاسکتی۔“ بابا فضل نے کہا۔

بہو مہ جبین نے بندھا ہونے کے باوجود مزاحمت کی مگر وہ اپنی عزت بچانے میں ناکام رہی۔

بی بی کلثوم خامی دیر سے پہنچی تھی۔ بابا فضل نے دھوکے سے بی بی کلثوم کو خامی دور بھیج دیا تھا اور وہ پورے ایک گھنٹے بعد لوٹی تھی۔ وہ جب آستانے پر لوٹی بابا فضل زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا بی بی کلثوم سے وہ اشیاء کے ان پر دم کیا۔

”یہ سب اشیاء تمہیں بہو کو تین دن تین مرتبہ دن میں کھلانی ہیں۔“

”نیک ہے بابا میں ایسا ہی کروں گی۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”وہ مردود جن آج بول ہی پڑا کہہ رہا تھا کہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا جا ہے کچھ بھی ہو جائے۔“

بنایا ہے مگر بی بی کلثوم نے اس کی بات سنی ہی نہیں منہ جیس کو اپنی ساس پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی ہے۔

اس دن کے بعد بابا افضل کا حوصلہ بڑھ گیا تھا اس نے کئی بار منہ جیس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا وہ ہر بار بی بی کلثوم کو کچھ لینے بھیج دیتا تھا اور بی بی کلثوم کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا لیتا وہ ساس کو بتانے کی کوشش کرتی مگر بابا افضل نے اپنی باتوں میں ایسا پھنسا لیا تھا بی بی کلثوم منہ جیس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ وہ بابا افضل کی تحریکیں کرتے نہ تھکتی تھی۔ وہ ہر بار جیس کے حوالے سے بی بی کلثوم کو بات بتاتا کہ وہ خوش ہو جاتی تھی وہ یہی سمجھ رہی تھی بہت جلد منہ جیس کو جن سے چمکا رال جائے گا۔

منہ جیس جب بھی اپنے شوہر شاہنواز کو بابا کے بارے میں کچھ بتانے کو منہ جیس کوئی شوہر کا منہ غصے سے سرخ ہو جاتا تھا۔ وہ بھی بابا کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتا تھا وہ جب عامل بابا کا ذکر چھیڑتی وہ غصے میں آ جاتا اور کہتا۔

”میں بابا کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا مجھے امی نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ جن تمہارے علاج کو ادھورا رکھنے کو تم سے جموٹی ہاتھیں کھلوانے کا تاکہ ہم غصے میں آ کر تمہارا علاج کرنا بند کر دیں مگر ہم تمہارے منہ سے بابا کے متعلق کوئی بات نہیں سنیں گے تاکہ ہمیں غصہ نہ آئے اور تمہارا علاج بھی ہو جائے۔“

بہو منہ جیس کو اپنی ساس بی بی کلثوم اور شوہر شاہنواز سے اس قسم کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔ وہ ایک جموٹے اور فریبی بابا کے چکر میں آ چکے تھے اور وہ ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر بہو کو ہوس کا نشانہ بنارہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے بابا افضل الدین کی صورت دیکھ کر منہ جیس کو کراہیت کا احساس ہوتا تھا وہ بہت ہاتھ پیر زمین پر باری تھی کہ مجھے بابا کے پاس نہیں جانا مگر بی بی کلثوم اس کی ایک نہ سنی تھی اور اسے اپنے ساتھ لے جانی اور ساتھ یہ بھی ہتی جاتی۔

”میری بی بی مجھے پتا ہے کہ وہ مردود جن نہیں چاہتا کہ تیرا علاج ہو مگر میں تیرا علاج کرا کے دم لوں گی مجھے پوتا پوتی چاہیے اور وہ تیرے علاج سے ہی ممکن ہیں۔“ ایک

میں نے بھی کہہ دیا اس کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔“

”بابا اس مردود جن کو جلا کر بھسم کر دو تاکہ ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہاں چھوٹ جائے گی لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ یہ جن پوری کوشش کرے گا کہ کسی طرح منہ جیس کا علاج ادھورا رہ جائے اور اس مقصد کے لیے وہ بہو سے مختلف جھوٹ بھی کھلوانے لگا تاکہ تم غصے میں آ کر علاج نہ کراؤ اور وہ مردود اس کے جسم پر قابض رہے۔“

”بابا تم بے فکر ہو ایسا ہی ہوگا میں اس کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یہ جنات جب انسانوں پر آ جاتے ہیں پھر بڑی مشکل سے جان چھوڑتے ہیں۔“ بابا افضل نے کہا۔

منہ جیس بی بی کلثوم کو دیکھ کر سسک پڑی اور اس کے آنسو نکل پڑنے بی بی کلثوم نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے بہو ساس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

”میرے کمری بی بی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بی بی کلثوم نے اسے تسلی دی۔

بہو کے آنسو تھے کہ غم نہیں رہے تھے اس کا دل بھر بھر کڑا رہا تھا۔

”امی..... امی..... تم نے اتنی دیر کیوں لگادی۔“ منہ جیس نے گھر جاتے ہوئے پوچھا۔

”میں کیا کرتی وہ پسناری کی دکان دور تھی آنے میں دیر ہو گئی۔“

”تمہارے جانے کے بعد.....“

”مجھے پتا ہے آج جن بول پڑا تھا بابا نے مجھے سب بتا دیا ہے۔“ بی بی کلثوم نے کہا۔

”امی وہ.....“ منہ جیس نے اپنے بہتے آنسو پونچھے۔

”اب خاموش رہ مجھے پتا ہے کہ وہ مردود جن مجھ سے جھوٹ برجموٹ بولا کر تیرا علاج مکمل کرانے سے روکانے کی کوشش کرے گا مگر میں ہرگز بھی تیرا علاج ادھورا نہیں چھوڑوں گی۔“ بی بی کلثوم نے بہو کو چپ کرادیا۔

مگر پہنچ کر بھی کئی بار منہ جیس نے ساس کو یہ بات بتانے کی کوشش کی بابا افضل نے اسے زیادتی کا نشانہ

دن بی بی کلثوم کے سامان لے جانے پر مدد جیوں پھٹ پڑی۔

”جتنے شرم وغیرت نہیں آتی میں تیری بیٹی کے برابر ہوں پھر بھی تم میرے ساتھ ایسا کام کرتے ہو۔“

”یہاں آستانے پر آنے والی ہر عورت میرے نزدیک ایک عورت ہے جس پر میرا دل آجائے میں اسے لازمی اپنی ہوس کا نشانہ بنانا ہوں اور میں ایسا کیوں نہ کروں ہر کوئی اپنی عورتیں اپنی مرضی سے یہاں چھوڑ کر جاتے ہیں میں کسی کے گھر کسی عورت کو بلانے نہیں جاتا۔“

”تم مکاری اور فریب سے گھر والوں کو بے وقوف بناتے ہو۔“

”وہ بے وقوف بننا چاہتے ہیں اور میں ان کو بے وقوف بناتا ہوں۔“

”تم انتہائی گھٹیا انسان ہو میں تمہارے منہ پر قہر کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے بابا فضل کے قریب آنے پر اس کے منہ پر قہر دیا۔

بابا فضل کو اس طرح چہرے پر قہر دینا پسند نہ آیا اس نے غصے سے بہو کو دیکھا بہو کا خیال تھا کہ آج وہ اسے کچھ نہیں کہے گا مگر اس کا خیال غلط نکلا اور اس نے بہو کو ہوس کا نشانہ بنا کر چاقو کو چراغ کی لو پر گرم کرنا شروع کر دیا چاقو کو گرم ہوتا دیکھ کر بہو سمجھ گئی آج یہ ضرور اس کے جسم کو گرم چاقو سے دانے گا اور وہی ہوا بابا فضل نے بی بی کلثوم کے آنے سے پہلے پہلے یہ جیوں کی گردن اور کئی حصوں کو داغ دیا تھا۔

بی بی کلثوم کے آنے پر بابا فضل نے بڑے غر سے بتاتے ہوئے کہا۔

”آج میں نے جن کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ وہ بہو کو تنگ نہیں کرے گا پھر بھی وہ آیا تو میں سے جلا کر بھسم کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے بابا کیا اب بھی بہو کو لانا پڑے گا۔“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”میں جب تک منع نہ کروں بہو کو لاتی رہتا میں اس کو ایسا سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ دوسرے جن بھی اس سے سبق حاصل کریں۔“ بابا نے ایک مکروہ مسکراہٹ چہرے پر

لاتے ہوئے منہ جیوں کو دیکھا۔

مدد جیوں بابا فضل کو نفرت سے دیکھتی ہوئی گھر آ گئی مگر جاتے ہوئے مدد جیوں کے من میں کیا تھا یہ کسی کو نہیں پتا تھا وہ دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اسے اس پر عمل کرنا تھا۔ دوسرے دن صبح ہونے پر اس کی حالت بگڑ گئی بی بی کلثوم اور امیر الدین بہو کو لے کر اسپتال بھاگے۔

”مجھے اسپتال لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ بہو نے کہا۔

”کیوں فائدہ نہیں ہے۔“ بی بی کلثوم نے پوچھا۔

”تم لوگ میری بات سننے کو تیار نہ تھے اور وہ مردود بابا فضل ہر بار میری آبروریزی کر رہا تھا اس لیے روز بروز اپنی عزت گنوانے سے میں نے بہتر یہی جانا کہ اس زندقہ کا خاتمہ کر لوں میں نے کالا پتھر پیس کر لیا ہے کسی لمحے بھی مجھے موت آ سکتی ہے۔“ بہو نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

بہو کی بات سن کر دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا بی بی کلثوم کے ذہن میں یہ بات آئی نہیں تھی کہ اس کی بہو کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر بابا فضل اسے ہوس کا نشانہ بھی بنا سکتا ہے وہ سادگی میں ماری گئی تھی۔

اسپتال پہنچنے پر بہو نے پولیس کے سامنے اپنا بیان لکھوا کر مل ڈر دیا تھا۔

پولیس نے بابا فضل کو گرفتار کرنے کے لیے آستانے پر چھاپ مارا مگر بابا فضل کو اس کی خبر پہلی ہی ہو چکی تھی اس لیے وہ فرار ہو گیا تھا۔ پولیس نے ہر اس جگہ چھاپے مارے جہاں وہ مل سکتا تھا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

امیر الدین کے گھر میں ماتم ہو رہا تھا اس ماتم کا اب کوئی فائدہ نہ تھا بی بی کلثوم اگر پہلے اپنی بہو کی بات سن لیتی تو ممکن تھا کہ بہو کی زندقہ ختم جاتی۔



وہ تیس دن

عمار خان

قسط نمبر 05

یہ کہانی خود غرضی اور لالچ پر مبنی ہے کہ کیسے کچھ انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کا احساس کیے بنا ہی کچھ ایسے شرمناک کام انجام دے جاتے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے باعث شرم بن جاتے ہیں اپنے حال پر مطمئن رہنا بھی ایک شکر گزاری ہی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اس کہانی کے کچھ کرداروں کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ وہ غلط تھے یا درست، حالات کے بے رحم سمندر میں بہتے ہوئے کمزور انسان اپنے آپ کو بچانے کی خاطر، اکثر فطرت اور ضمیر کے خلاف بھی چلے جاتے ہیں جس کا خمیازہ اس کے ساتھ اولاد کو بھی بھگتنا ہوتا ہے مجھے یعنی صاحب تحریر عمارہ کان کو جیسے بتایا گیا تھا اسے جوں کا توں لکھ دیا ہے ہو سکتا ہے اس کو پڑھ کر آپ اپنے گھر کی بنیاد کے بارے میں بھی مشکوک ہو جائیں کیونکہ یہ کہانی ایک ایسے خونی گھر کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کسی نے بہت پیار سے اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کی بنیاد میں کالے جادو کے کچھ اثرات ہیں جن سے بچھا چڑھانا بے حد مشکل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہانی پڑھنے کے دوران آپ کو کچھ سوال ابھرن میں ڈال دیں لیکن جیسے جیسے کہانی اپنے انجام کی سمت جائے گی آپ کو سوالوں کے جوابات بھی ملتے جائیں گے اور پھر شاید فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ حقیقتاً قصور وار کون تھا کون تھا جس نے اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لگام نہیں ڈالی اور کتنے ہی گھروں کو اپنے ساتھ تکلیف میں ڈال دیا قصہ مختصر کرتے ہیں اور اس آسب زدہ خونی گھر کی کہانی کا حصہ بننے ہیں



شاہ جی خاموشی سے سر جھکائے اپنی بیوی کی بات سنتے رہے، ان کے پاس، رخ تاج کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا نارخ تاج سالوں سے ایک ہی بات کرتے تھکتی تھیں ناہی شاہ جی ان سوالوں کا جواب دے سکتے تھے لیکن وہ یہ سن کر کہ خونی رات قریب ہے کچھ سوچنے پر مجبور ضرور ہو گئے تھے۔ تیس دن کا ایک ایسا آسیب زدہ چکر جس کی وجہ کوئی نہیں جان سکا تھا۔ اس چکر کے پورے ہوتے ہی ایک خونی جان کی بلی چڑھتے دیکھتے یہ دونوں میاں بیوی وقت سے پہلے ہی اپنی عمر سے آگے جا چکے تھے۔

ایک طرف دو انجان ادھیڑ عمر میاں بیوی، سونیا کے لیے پریشان ہو رہے تھے تو وہی وہ اس تیس دن کے خونی چکر سے بے نیاز اپنے کمرے میں بے زار لیٹی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ چینل بدلنے کے لیے ریموٹ اٹھانے ہی لگی تھی کہ پاس رکھا ہوا اس کا موبائل بج اٹھا اور اس نے نمبر دیکھے بغیر ہی فون اٹھالیا۔

”ہیلو۔“

”میں شہیر بول رہا ہوں بھابی۔“

”شہیر۔“ سونیا نے کھوڑا ہوتے سوال کیا۔

”کون شہیر سوری میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔“

”ارے بھابی وہ اسٹیٹ ایجنٹ، جس نے یہ مکان

آپ کو۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا سوری۔۔۔۔۔ ایکٹو علی وہ میں نے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔

جی بولیں کیسے فون کیا۔“ سونیا نے ریموٹ سے چینل بدلا

اور سرسری سے اعزاز میں شہیر سے سوال پوچھا۔ کس کے

وہم وکمان میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اسٹیٹ ایجنٹ کسی

کرائے دار کو فون کرے گا۔ ویسے بھی اسٹیٹ ایجنٹ کا نمبر

کون اپنے موبائل میں فیز کرتا تھے جو وہ پہچان پاتی کہ شہیر

کافون ہے۔

”میں پوچھنا چاہ رہا تھا سب خیریت سے ہیں نا گھر

پر۔۔۔۔۔ جھجکتی ہوئی آواز سونیا کی ساعت سے گزرائی۔

”کیا مطلب۔“ سونیا کے حیران ہوتے ہوئے ٹی وی

کمیوٹ کیا اور اس سوال پر غور کرنے لگی۔

شاہ جی کتاب پڑھتے ہوئے مسلسل رخ تاج کو دیکھ رہے تھے جو آس پاس کے ماحول سے بے خبر کڑکی میں کھڑے سامنے گھر کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر شاہ جی نے برداشت کیا اور بالآخر ٹوکے بنانہ رہ سکے۔

”بس بھی کہو رخ کب تک کڑکی رہو گی ادھر۔“

”وہ، بچے آج اسکول نہیں گئے، مجھے فکر ہو رہی ہے۔“

بے ساختہ ہی رخ تاج کے لمبوں سے دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ پوچھ گئی۔

”اوہو دوسرا تیسرا دن ہوا نہیں ان کو آئے ہوئے اور تم پھر سے۔“ شاہ جی نے مصنوعی غصے سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

”باز کیوں نہیں آتی آپ آخر۔“

رخ تاج نے اپنے شوہر کی مصنوعی ناراضگی بھانپتے ہوئے فوراً ہی کڑکی چھوڑی اور ان کے پاس جا بیٹھیں۔

”اتنا پیارا بچہ ہے۔“

”میں دیکھ چکا ہوں۔“ اب کی بار شاہ جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کاشش۔۔۔۔۔“

”اے خیر ادا رہا جو مجھے زیادہ بلیک میل کیا تو۔“ شاہ جی فوراً نے انہیں احساس دلایا کہ وہ کچھ بھی نہیں بھولے

ہیں۔ رخ تاج سر جھکا کر گہری سانس لے کر رہ گئیں

”ویسے اب تم اس کاش کو چھوڑو اور مجھ بڑھے کو کوئی چائے پانی پوچھ لو تو بہتر رہے گا۔“

”وہ رات بھی قریب ہے۔“ رخ تاج نے کھوئے کھوئے اعزاز میں سر جھکائے کہا تو شاہ جی بری طرح

چونک گئے۔

”اس شیطانی چرخے سے نجانے کب پوچھا چھوٹے گا ہمارا۔“ شاہ جی نے بولتے ہی ہونٹ سمیٹنے کی جیسے غلطی

سے ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا ہو۔

”میں کبھی کبھی سوچتی ہوں اس پورے سلسلے کی باز پرس ہم سے بھی تو ہوگی نہیں پھر ہم اپنے بچاؤ کے لیے کیا بہانہ تراشے گئے بھلا۔“

”کس قسم کی خیریت اور اس سوال کا کیا مطلب ہوا۔“

”وہ..... وہ..... میرا مطلب تھا کہ تمہارے کیا کوئی

کام ہے تو بتا دیں مجھے اتوار کو کرانے کی کوشش کرونگا۔“

گھبرائے ہوئے انداز میں شہر نے ہر ممکن کوشش کی بات

سنجھل جائے اور شاید اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

”شاید کوئی کام نکل آیا ہو آپ بتا دیں مجھے۔“

”اودھ اچھا اچھا ہاں گھر تو بہت اچھا ہے، بڑے دل

سے بنایا ہے کسی نے پورے حساب کتاب کے ساتھ“ سونیا

نے ایک بھر پور نظر کمرے کے در و دیوار پر ڈالی اور

مسکراتے ہوئے جواب دیا اگر وہ اپنے پیچھے ایک نظر دیکھتی

تو یقیناً اس کی رائے اس مکان کے لیے بدل جاتی، جہاں

ایک ساہو دیواری جز سے اگنا شروع ہو رہا تھا۔

”چلیں یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کو گھر پسند آگیا۔“

شہر نے سکون بھری سانس لی۔

”جی جی ناصر ف گھر اچھا ہے بلکہ آس پڑوس کا ماحول

بھی مناسب ہے۔“ سونیا نے اپنی طرف سے بے چارے

اسٹیٹ ایجنٹ کی تسلی کرانی جاری رکھی۔

”آس پڑوس“ شہر نے زیر لب دہرایا۔ ”اچھا تو

پڑوسیوں سے کوئی ملاقات ہوئی آپ کی۔“

”ابھی تک تو کسی سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن سوچا تھا

ملنے جاؤں ان سے تاکہ.....!“

”تاکہ..... کیا ہوا..... مجھے بتائیں۔“ شہر نے تیزی

کے ساتھ سونیا سے سوال پوچھا۔ ”آپ کیوں ملنا چاہتی

ہیں پڑوسیوں سے۔“

”کیا ہو گیا شہر صاحب، کیا ملنا منع ہے کسی سے

ادھر۔“ سونیا نے ناگواری سے پوچھا۔ اس کو شہر کا فون کرنا

بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا پھر ایسے انکوائری کرنا۔

”نہ..... نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا اچھوٹا ہی وہ آپ

مجھ بتا دیں کیا کام ہے شاید میں بہتر طور پر ڈیل کر سکوں

آپ سے پہلے جتنے بھی کرائے دار ادھر تھے میرے ہی

توسط سے آئے تھے۔ اسی لیے بس اور کوئی بات نہیں پلیز

آپ غلط مت سمجھیں گا۔“ شہر نے بے ربط انداز میں

جواب دیا۔ وہ سونیا کا بدلتا لہجہ بھانپ رہا تھا۔

”اس اوکے دراصل لان کی گھاس کافی بڑھی ہوئی

ہے تو میں نے سوچا اسی بہانے ذرا اور گردلوگوں سے مل بھی

لوں اور مالی کا بھی پوچھ لوں۔“ سونیا نے شہر کی بات سمجھ کر

تفصیل سے جواب دیا۔ اچھا تھا اگر اسٹیٹ ایجنٹ کے

ذریعے ہی مکان کے مسئلے حل ہو جائیں تو اس سے بہتر کیا

بات ہو سکتی تھی۔

شہر نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سونیا کو تسلی دی۔

”آپ زحمت نہ کریں پھر بھی۔ میں کل ہی ایک بہت

اچھا مالی بیج دوں گا وہ پہلے بھی کام کرتا رہا ہے ادھر بلکہ ایسا

کرتا ہوں ابھی اس کو بول دیتا ہوں تاکہ کل آپ کو اپنے

دروازے پر ملے وہ..... ٹھیک کرنے تاکہ۔“

”اچھا، چلیں ٹھیک ہے۔“ سونیا نے کندھے اچکاتے

ہوئے چٹیل بدلا۔

سونیا کے پیچھے بننے والا سایہ اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ

اگر سونیا لمحہ بھر کو ہی نظروں کا زاویہ بدلتی تو اسے وہ نظر

آ جاتا۔

”اور کچھ.....!“ شہر نے ناجائز کیا جانتا چاہ رہا تھا۔

”نہیں فل الحال تو بس مالی ہی چاہیے تھا۔“ سونیا نے

صحت کی صفائی کے لیے بھی یوں اچھا لیکن کچھ سوچ کر

خاموش ہو گئی۔

”اس کی تو بس آپ فکر نہیں کریں میں کل ہی بیج دوں

گا۔“

”چلیں شکریہ۔“ سونیا نے فون رکھ کر ابھی ہوئی

نگاہوں سے موبائل کو دیکھا جیسے شہر کے رویے کا اندازہ

لگانا چاہ رہی ہو اور ٹی وی کی سمت متوجہ ہونے کی کوشش

کرنے لگی کچھ ہی دیر بعد دور سے الماس کی آواز سن کر

ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی یقیناً ایک بار پھر وہ وقاص کی ہی

بات کرنے آ رہی تھی کہ اسے ٹرانسفر کا کہہ دیا جائے الماس

کی آواز سنتے ہی سونیا کے پیچھے نمودار ہونے والا ہولہ

دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔



”خالہ! ماما اچھی نہیں ابھی تک۔“ مہر نے الماس سے سوال پوچھا جو ان کے لیے میکی بنا رہی تھی۔

”اٹھ گئی ہوں گی۔ ابھی دیکھتے ہیں پہلے یہ تو بتانے دو چھوٹی پٹانہ۔“ الماس نے پیار بھری نگاہوں سے اپنی بھانجی کو دیکھا جو چپکتی ہوئی گیند سے کھیل رہی تھی۔

”اسکول کیسا ہے بتایا ہی نہیں مجھے۔“ الماس نے مصنوعی انداز میں ٹٹک کے دونوں بچوں کو دیکھا۔ عمر نے ہوم ورک کرتے کرتے خالہ کو دیکھا تو فوراً ہی بلال کے بارے میں بتانے لگا۔

”میری مس تو بہت اچھی ہیں خالہ.....“ مہر نے عمر کی بات کاٹ کے فخریہ انداز میں دونوں کو دیکھا اور چہرہ آگے کر کے میکی کی خوشبو نکھلی۔

”مس تو میری بھی بہت اچھی ہیں لیکن وہ بچہ بہت گندا ہے..... جھوٹ بھی بولتا ہے۔“ عمر کو بلال کا گیند کے بارے میں بولنا یاد آ گیا کیسے اس نے مس سے جھوٹی شکایت کی تھی کہ عمر نے اسے بال ماری ہے اور پھر پتہ ہے خالہ اس نے مس کو بولا.....“

”چلو چھوڑو اسے اور یہ لوگر ماگرم میکی کھاؤ اور اب خبردار جو کسی نے تمہاری ہی دیر میں بھوک بھوک کا نعرہ لگایا ہو تو۔“ الماس نے چچہ لہراتے ہوئے بچوں کو دھمکایا۔

”ہرے رے رے اس کے بعد چپس۔“ عمر نے فوراً ہی جواب دے کر الماس کو گھورنے پر مجبور کر دیا لیکن کچھ ہی لمحے بعد تینوں کا تہقہہ بکن کی محد وفضائیں گونج کر رہ گیا۔ قہقہے کی گونج کے ساتھ ہی گیند کا قصہ بھی دب گیا جو عمر الماس کو سناتے لگا تھا۔



شام کے پھلتے سائے میں بلا خرد قاص کو کچھ فرصت مل ہی گئی۔ اس نے فوراً سے جھڑپ چائے منگوائی اور ساتھ ہی سونپا کو کال ملانے لگا۔

”کبھی طبیعت ہے۔“ قاص کی ہشاش بشاش آواز سن کر سونپا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”یاد آ گیا آپ کو۔“

”آپ کو بھولتا ہی کب ہوں۔“

”اسی لیے شام کو فون کر رہے ہیں۔“ ناچاچتے ہوئے بھی سونپا نے شکوہ کر ہی دیا۔

”پورا دن آپ انتظار میں گزر گیا۔“

”بس یار یہ پراجیکٹ نے جان عذاب کر دی ہے گلتا ہے مار کر چھوڑے گا۔“

”اللہ تا کرے ایسی باتیں نہ کیا کریں وقاص۔“ سونپا نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”اچھا اچھا چھوڑو اسے اور بتاؤ کچھ بہتر ٹیل ہوا گرم گرم چائے کی چسکی نے حکمن کے احساس کو کم کرنے کی اپنی سعی کی۔

”ہاں اب تو کافی بہتر ہے بس سر تھوڑا بھاری ہے۔“

”ہوں، چلو آج بچوں کو چھوڑ کر ہائی وے چلیں گے فریش ہوا لگے گی تو اتفاق ہوگا۔“

”ہم ہائی وے پر ہی ہیں وقاص۔“ سونپا نے کلک کلکاتے ہوئے اسے یاد کرنا چاہا۔

”اوہ میرا مطلب تھا یار لاٹک ڈرائیو پر۔“ الماس کے پاس بچے چھوڑ دیں گے اور ہم میاں بیوی ڈیٹ ماریں گے۔“ وقاص نے داد طلب انداز میں سونپا سے پوچھا۔

”اور وہ تو جیسے ہمیں جانے دے گی نا دیے ہی صبح سے تنگ کر رکھا ہے اس نے۔“ سونپا کو الماس کی یاد دہانی یاد آ گئی۔

”اوہ..... ارے بھئی ہاس کو فرصت ملے تو سائن کر آؤں گا، اچھا چلاؤ فون رکھو میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔“ ایک دم وقاص کو جلدی ہو گئی۔

”او کے او کے۔“ سونپا نے ہنستے ہوئے فون رکھا اور الماس کو بتانے کے لیے کمرے سے باہر جانے کے لیے اٹھنے لگی۔ چلو گئے ہاتھوں الماس کو بھی بتادوں، تا کہ اسے سکون آجائے۔



”کیا ہوا الماس۔“ سونپا نے لاؤنج میں خاموش بیٹھی

ہوئی، بہن کو دیکھا۔ ”کیا ہوگا تمہارا الماس۔“ سونیا نے مصنوعی خفگی سے

چھوٹی بہن کو گھورا۔

”اچھا ہی ہوگا فکر نہیں کریں بس۔“ الماس نے مسکراتے ہوئے سونیا کو تسلی دی۔

”شادی کے بعد کیسے گھر سنبھالوں گی، ابھی سے کچھ پریکٹس کر لو گھر سنبھالنے کی لڑکی۔“

”میں نے نہیں بننا ہاؤس وانف، ساری زندگی کام کرتے رہو اور سننے کو ملے میری بیوی کام نہیں کرتی ہاؤس وانف ہے..... ہنہ..... اس سے اچھا ہے بندہ آفس میں جاب کرے پیسہ بھی ملے اور عزت بھی اور گھر میں کوئی چائے پانی کو پوچھتے بھی۔“

”اوہو بہت خطرناک ارادے ہیں بی بی۔“ سونیا نے مسکراتے ہوئے الماس کے سر پر چپت مارتے ہوئے سر جھٹکا۔

”آپ دیکھ لیتا ہاچی میں کسی ایسے سے شادی کروں گی ہی نہیں جسے میری کوئی قدر نہ ہو۔“ الماس نے موبائل اٹھا کے بیچ چیک کیے۔

سونیا نے دل ہی دل میں بہن کی دائمی خوشیوں کی دعا مانگی۔

”یا اکم از کم وہ پٹینا ہو، سارا دن مچن میں نہیں کھڑی ہو سکتی بھی۔“



”سنو وہ راجیل نہیں آیا آج بھی۔“ ایشہ نے کوچنگ کی کلاس ختم ہوتے ہی راجیل کے دوست سے پوچھا۔

”راجیل تو دعویٰ کیا ہوا ہے۔“ دو چار لڑکوں کے گروپ میں سے ایک لڑکے نے گھبراہٹ ہوئی ایشہ کو بخور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ..... کب آئے گا، کچھ معلوم ہے۔“ ایشہ نے حیران ہو کر سوال پوچھا۔

”کل تو فون پر آیا کچھ نہیں کہا تھا اس نے کہ وہ دعویٰ جا رہا ہے۔“

”کل ہی تو گیا ہے اب دیکھو کب آتا ہے۔“ اسی لڑکے نے ایک بار گھر اپنے گروپ کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔

”کچھ نہیں یار تھک گئی ہوں۔“ الماس نے بے زار نگاہوں سے سامنے سے آتی بہن کو دیکھا جس کا ستا ہوا چہرہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

”آپ باہر کیوں آگئیں، کچھ چاہیے تھا کیا۔“

”بس ایک ہی دن میں یہ حال ہو گیا تمہارا۔“ سونیا نے شکستہ لہجے میں کہا اور اسی کے پاس بیٹھی گئی۔

”ایسے ہی تھک گئی لینے لینے۔“

”آپ کی ہمت ہے ہاچی جو گھر کے کام کرتی نہیں تھکتیں بھئی میری تو بس ہوئی آج پتا نہیں کب سے آفس جو انکرنہ ہے آخر۔“ الماس نے سر جھٹکتے ہوئے اپنا موبائل اٹھایا۔

”بھائی جان کو یاد دلاتی ہوں۔“

”یہ ہی بتانے کے لیے تو تمہارے پاس آ رہی تھی، وقاص کا فون آگیا تھا انہوں نے کہا ہے وہ آج ساؤن کرا کر ہی آئیں گے، باس کو جانے نہیں دیں گے جب تک وہ تم کو اپنے آفس نہیں بلا لیں۔“ ہلکے پھلکے انداز میں سونیا نے الماس کو خوش خبری سنائی۔

”جج.....“ الماس نے بے یقینی سے بہن کو دیکھا۔

”آپ کی کب بات ہوئی۔“

”بس ابھی ان کا فون رکھا اور تمہیں بتانے کے لیے باہر نکل ہوں۔“

”ارے آپ کا سر دو کیسا ہے بچوں نے اتنی مت ناری ماتم سے۔“ پوچھتا ہی بھول گئی۔“ الماس کے سر سے بوچھا تارا تو فوراً ہی بہن کی طبیعت کا خیال آیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بس ہلکا سا بھاری ہے اور اب تم کل سے نہیں ہوئی تو سارا کام بھی مجھے ہی دیکھنا ہوگا۔“ مصنوعی لاچاری اختیار کرتے ہوئے سونیا نے بات ختم کرتے کرتے من لٹکایا۔

”آہ۔۔۔ واہ یعنی میں کل سے واقعی آفس جا رہی ہوں۔“ سنتے ہی سکون کا احساس ہوا۔

”یار ہاچی۔“ الماس نے موبائل رکھ کر ہاتھ پھیلانے اور صوفے کی لشت سے سر نکایا۔

”اچھا، جینک کیو۔“ اٹھ نے اٹھتے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

”اچھی خاصی لڑکی ہے یہ کیوں راجیل کا پوچھ رہی تھی بھلا۔“ پاس کھڑے ہوئے اویس نے جاتی ہوئی اٹھ پر اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ترحم سے گردن جھنجکی۔

راجیل کا پورا گروپ ہی غلط شہرت رکھتا تھا اسی لیے پڑھنے والے لوگ اس کے نام سے ہی بدک جاتے تھے ایسے میں تا پر لڑکی اگر اس کا نام لے کر پریشان حال گھومے گی تو از خود ہی نظروں میں آنا کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن اٹھ کو ان باتوں کی کوئی سمجھ نہیں تھی وہ سوچوں میں گم، ہست قدم بڑھاتی ہوئی راجیل کے بدلتے روپے کے بارے میں سوچ رہی تھی وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا اب جان بوجھ کے اسے نظر انداز کرنا کو چنگ میں آکر کبھی اسے نہیں ملنا اور فون کا جواب دیر سے دینا اس بار راجیل طے تو اس سے صاف بات کرنی پڑے گی۔ اب میں یہ اکتور ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔“ اٹھ کو کچھ ہی دن پہلے ناقابل ترین نقصان یاد آ گیا تھا۔

کراچی کی مشہور زمانہ ہوا تیزی سے چل رہی تھی اور سونیا اس سے لطف اندوز ہوتی ہوئی پہلی بار اسے محسوس بھی کر رہی تھی، شہر میں بے جا ٹریفک اور گھٹے گھٹے گھر ہونے کے سبب ایسا کھلا لان، تازہ ہوا ایک نعمت ہی لگ رہی تھی اس وقت۔ طبیعت کے بھاری پن میں اچھا خاصہ افاقہ ہوا تھا۔

”واہ کیا حسین شام ہے۔“ سونیا نے جمولے سے اٹھ کے نیچے قدموں سے گھاس پر چھل قدمی شروع کی اور گہری سانسیں لیتے ہوئے روح معطر کی۔ اچھا فیصلہ تھا ادھر آنے کا، کم از کم معلوم ہوا ہوا صاف ہوا کیا ہوتی ہے، دھوئیں سے صاف بھی کوئی ماحول ہوتا ہے جہاں تابی پاں شور شرابا۔ سکون سے چلتی ہوئی سونیا کو یک لخت محسوس ہوا کوئی اس کے پیچھے ہے پلٹ کر دیکھنے کے باوجود جب کوئی نظر نہیں آیا تو کندھے اچکا کر وہ ایک بار پھر جمولے میں بیٹھ گئی لان کا جائزہ لینے لگی۔ لان کے انتہائی کونے میں اسے ملی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔

یہ ملی دنیا کے ہر کونے میں دستیاب ہیں۔ ہش ہش کر کے اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہی سونیا نے اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن اس ملی نے اپنی چپکتی ہوئی آنکھوں سے ٹکشی باندھے سونیا کو دیکھنا شروع کر دیا۔

”ارے کیسے گھور رہی ہے ملی ہے یا کوئی تازہ قسم کا جن، اے ہشش۔“ سونیا نے اسے ڈرانے کے لیے اپنی جگہ سے ہلے ہوئے ایک بار پھر کوشش کی لیکن وہ ملی مستقل اپنی جگہ بیٹھی ہوئی اسے ہی گھورتی رہی بڑی ہی ڈھیٹ ہے بھی۔ سونیا نے ملی کو دیکھتے ہوئے منہ بنایا اور گھر کے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے اگر اندر آئی تو پانی پھینک کر بھاگ دوں گی۔ کن آنکھوں سے ملی کو اپنی جگہ ہی بیٹھے دیکھ کر سونیا نے دل ہی دل میں سوچا اور لان سے منسلک کچن کا دروازہ کھول کے اندر چلی گئی۔

”کب تک آئیں گے وقاص۔“ سونیا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وقاص سے پوچھا۔

”پھر لیٹ ہی آتا ہے آج۔“

منہ بناتے ہوئے سونیا نے موبائل رکھا اور بیڈ کے سائڈ کارنر پر رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔ دلچسپ کتاب نے وقت گزارنے کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ باہر ہوتا گہرا اندھیرا سونیا کو اپنی طرف متوجہ کر گیا تو اس نے وقت دیکھا اور اس کی سوچ کا رخ وقاص کی جانب ہو گیا۔

”یہ ابھی تک نہیں آئے۔“ سونیا نے ہاتھ روم کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے ناگواری سے سوچا۔

کچھ ہی وقت بعد جب وہ فریش ہو کر ہاتھ روم سے باہر آئی تو سامنے بیڈ پر رکھ رکھی ہوئی کتاب نہیں تھی۔

”ارے کہاں گئی ادھر ہی تو رکھی تھی۔“ سونیا نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور کندھے اچکا کر بیڈ روم کے پینچو بچ کھڑی ہوئی۔ اچانک باہر سے بچوں کے ہنسنے کی آواز آئی جسے سن کے وہ مسکرائی۔

”ہوں ان کی شرارت ہے یہ۔“

آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کے سونیا باہر بھاگنا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

”جیسے رہو میں بھی نہیں ڈھونڈتی۔“ سونیا نے مسکرا کر زیر لب کہا اور کمرے کے اندر آگئی ایک تو بک غائب کردی اور پھر چھپ گئے۔

”بہت شرارتی ہو گئے ہیں یہ دونوں۔“

اگر سونیا اپنے بیڈروم کے دروازے کے پیچھے دیکھتی تو اسے نمایاں انداز میں کسی بچے کا عکس نظر آ جاتا جو نامہر مٹی اور تابی عمر تھا۔



الماس لنگاتے ہوئے بچوں کے لیے دودھ گرم کرنے میں مصروف تھی کہ اسے محسوس ہوا کوئی اس کے پیچھے ہے اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ کندھے اچکا کر وہ ایک بار پھر دودھ کی جانب متوجہ ہوئی اور گلاس نکال کے ٹرے میں رکھے۔ دودھ گلاس میں ڈالتے ہوئے الماس کو ایک بار پھر لگا کوئی اس کے پیچھے ہے اور بغور اسے دیکھنے میں مصروف ہے۔ الماس نے انجمی ہوئی کیفیت کا شکار ہو کر دودھ کی پتلی سلیپ پر رکھی اور خود اچھی طرح پورے بچن کا معائنہ کیا لیکن کسی کو ناپا کر جھینپ گئی۔ دھیرے سے اپنے سر پر ایک چت لگائی۔

”کیا ہو گیا الماس خاتم چلو کام کرو کام کوئی نہیں ہے ادھر۔“

الماس نے ٹرے اٹھائی اور مسکراتی ہوئی بچن کی لائٹس آف کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے بچن کے ایک کونے میں دو جھپکی ہوئی آنکھیں جگمگاتی۔



”آپ کی کب تک ایسی بوٹین رہے گی وقاص۔“ سونیا نے چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے تنک کر سوال پوچھا لیکن وقاص اپنے موبائل پر لگا ہوا باتوں میں مصروف تھا تو نظریں سامنے روشن لیپ ٹاپ کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ گھر آکر بھی آفس ہی شروع رہتا ہے ان کا تو۔“ سونیا نے چائے کا کپ وقاص کے سامنے لہرایا اور منہ بنا کر فون کاٹنے کا اشارہ کیا۔

”بس دومنٹ۔“ بے آواز لیوں کو حرکت میں لاتے ہوئے وقاص نے معصوم شکل بنائی اور لیپ ٹاپ کی سمت ہو گیا۔

متوجہ ہو گیا۔

”ہلا خر چائے کی آخری چسکی لیتے وقت وقاص موبائل اور لیپ ٹاپ دونوں سے فارغ ہو کر مکمل طور پر سونیا کو توجہ دینے کے لیے فری ہوئی گیا لیکن اس وقت تک سونیا کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

”سوری تیار لیکن کیا کروں، کام نہیں کروں گا تو یہ لوگ کسی اور کو یہ پراجیکٹ دے دیں گے اور میرے آگے بڑھنے کا سارا انحصار اسی پر ہے، تم کو معلوم تو ہے سب کچھ۔“

”پھر بھی۔“ سونیا نے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کی۔

”کچھ وقت ہم لوگوں کے لیے بھی تو ہونا چاہیے نا۔“ ”اچھا چلو بتاؤ کیا کرتی رہیں دن بھر اور کیا لگا گھر آس پاس کے لوگ۔ کسی کے گھر گئیں یا ابھی تک سیٹنگ میں ہی مصروف رہی ہو۔“ وقاص نے سوال پر سوال کر کے سونیا کا ذہن دوسری سائیڈ پر لگا دیا۔

”جھٹ بہت گندی ہو رہی اس کو وقت لگے گا صاف کرنے میں باقی گھر تو بہترین پوزیشن میں ہے۔

”یعنی ہماری بیگم صاحبہ کو مکان پسند آ گیا ہے۔ وقاص نے دل ہی دل میں سکون محسوس کرتے ہوئے بشارت بھرے لہجے میں کہا۔

”لان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میرا خیال ہے جنہیں اس گھر کا سب سے اچھا حصہ وہی لگا ہوگا۔

”ہاں وہ تو آؤٹ اسٹینڈنگ ہے وقاص۔ جتا ہے اتنی ترتیب سے سارے درخت لگے ہوئے ہیں جیسے کسی نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت لان سیٹ کیا ہو۔ بس کچھ گھاس بڑھی ہوئی ہے اس کو دیکھنا ہوگا اور میں سوچ رہی تھی دو چار سکے وغیرہ بھی رکھ دوں بچن کے گیٹ کے بالکل سامنے اچھا لگے گا جب بچن کی کھڑکی سے خوبصورت پھول نظر آئیں گے۔“

وقاص نے سونیا کو بغور دیکھا اور مسکرا گیا۔ وہ اب مکمل طور اپنا دھیان پلٹا چکی تھی اس نے نامحسوس طریقے سے موبائل اٹھایا اور ہوں ہوں کرتا ہوا موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ویسے میں نے سوچا تھا اب پڑوسیوں کے بھی جایا جائے مالی کا کوئی اتا پتا لینے کے بہانے بات چیت یونہی۔“
”اچھا۔“

”آپ سن رہے ہیں نا۔“
”ہاں..... ہاں..... بالکل.....“

”یہ سامنے ہی والے پڑوسی کیسے رہیں گے، میرا خیال ہے میاں بیوی رہتے ہیں اکیلے ایجنڈ سے ہیں میں نے آج پڑوس میں جانے کا سوچا تھا کہ ان سے مالی کا پتہ کیا جائے۔“

”ہوں۔“
”آپ سن بھی رہے ہیں جو میں بول رہی ہوں۔“

سونیا نے ہوں ہاں اور اچھا کے بعد ناراضگی سے بھرپور انداز میں سوال پوچھا۔

”سن رہا ہوں بابا۔“ میری مجال جو بیوی کی بات کو نظر سے چوٹک گیا۔

”کیوں؟“
”میں نے بھی یہ ہی پوچھا تھا تو بولا ایسے ہی کال کر کے خیریت پوچھ رہا ہوں نیا گھر ہے نیا ایریا ہے تو کوئی مسئلہ ہو تو اسے بتا دوں۔“

وقاص سر ہلاتے دوبارہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اچھا اچھا۔“
”پوچھ رہا تھا گھر کی سالگا، وغیرہ وغیرہ.....“

”شریف بندہ ہے ورنہ کون ایسے پوچھتا ہے بعد میں ان کی بلا سے کرائے دار جئے یا مریں۔ بس کرایہ وقت پر مل جائے ان کو۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“
”یار ایک گلاس پانی تو دے دو۔“

سونیا نے سر ہلاتے ہوئے ٹرے اٹھائی اور کچن کی سمت جاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ منع کر رہا تھا کہ آس پڑوس کے لوگوں سے زیادہ میل ملاپ نہیں رکھیں وہ لوگ ہمارے مکان کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں جن کو جان کے ہمیں مسئلہ ہو جائے گا پتہ نہیں کیسے عجیب باتیں ہوں گی نا وہ۔ سونیا نے وقاص کی رائے جاننے کے لیے پلٹ کر اسے دیکھا لیکن وقاص موبائل کا نوں سے

”اچھا اچھا سواری مذاق کر رہا تھا یار میری پیاری بیگم نے پورے پانچ منٹ پہلے فرمایا تھا کہ ان کے منے گھر کے لان کے لئے ایک عدد مالی چاہیے تاکہ وہ میری بیگم کے لان کی تراش خراش کر کے ان کے جیسے حسین بنادے۔ دوسرا میری پیاری بیگم صاحبہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان کو پڑوس میں جانے کے لئے کسی جہان کی ضرورت

”یہ نہیں کہا تھا کیا۔“
”وقاص۔“

”اچھا اچھا سواری مذاق کر رہا تھا یار میری پیاری بیگم نے پورے پانچ منٹ پہلے فرمایا تھا کہ ان کے منے گھر کے لان کے لئے ایک عدد مالی چاہیے تاکہ وہ میری بیگم کے لان کی تراش خراش کر کے ان کے جیسے حسین بنادے۔ دوسرا میری پیاری بیگم صاحبہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان کو پڑوس میں جانے کے لئے کسی جہان کی ضرورت

”اچھا اچھا سواری مذاق کر رہا تھا یار میری پیاری بیگم نے پورے پانچ منٹ پہلے فرمایا تھا کہ ان کے منے گھر کے لان کے لئے ایک عدد مالی چاہیے تاکہ وہ میری بیگم کے لان کی تراش خراش کر کے ان کے جیسے حسین بنادے۔ دوسرا میری پیاری بیگم صاحبہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان کو پڑوس میں جانے کے لئے کسی جہان کی ضرورت

”اچھا اچھا سواری مذاق کر رہا تھا یار میری پیاری بیگم نے پورے پانچ منٹ پہلے فرمایا تھا کہ ان کے منے گھر کے لان کے لئے ایک عدد مالی چاہیے تاکہ وہ میری بیگم کے لان کی تراش خراش کر کے ان کے جیسے حسین بنادے۔ دوسرا میری پیاری بیگم صاحبہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان کو پڑوس میں جانے کے لئے کسی جہان کی ضرورت

لگائے ہوئے بات کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ سونانے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے وقاص کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔



گہری رات اپنا جادو چلاتی جارہی تھی اور کچھ لوگ آنے والے وقت کے لیے پریشان ہو رہے تھے ان کے بس میں کچھ نہیں تھا لیکن روشن نمبر ضرور تھا جو کسی دوسرے معصوم انسان کی تکلیف کے لیے خود بھی اذیت محسوس کر رہے تھے انہیں میں ایک رخ تاج بھی نہیں جو جانے کب سے اپنی کھڑکی میں کھڑی ہوئی ایک تک سانسے خونی گھر کو دیکھ رہی تھیں پیچھے بیٹھے ہوئے شاہ ان کو مسلسل دیکھ رہے تھے لیکن وہ چاہ کر بھی ان کو پریشان ہونے سے منع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ خود کو قصور وار سمجھتے ہوئے ہر ممکن کوشش میں مصروف رہتے تھے اس گھر کے کرائے داروں کو کسی طرح چوکنا کر دیں لیکن بد قسمتی سے کوئی بھی ان کی بات سننے کا روادار نہیں ہوتا تھا۔

”کب تک کھڑی رہو گی رخ“ بالآخر شاہ نے انہیں آواز لگا دی

رخ تاج جو اداسی کے عالم میں سانسے گھر کی بالائی منزل پر بچوں کو کھیلتا دیکھ رہی تھیں شاہ جی کی آواز سن کے چونکی گئی اور دیر سے پردہ برابر کرتے ہوئے اپنے بیڈ پر آ بیٹھی۔

”وہ آنے والا ہے شاہ جی۔“

شاہ جی جو رخ تاج کو کھڑکی بند کرتا دیکھ کر پرسکون ہو گئے تھے اور اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ان کے ہاتھوں میں کتاب لرز کر رہ گئی۔

”وہ رات قریب ہے شاہ جی۔ تیس دن کا چکر پورا ہونے والا ہے۔“

”اوہ..... شاہ جی نے گہری سانس لیتے ہوئے کتاب بند کی اور رخ تاج کی سمت نگاہیں مرکوز کر لیں۔

”ہم کچھ نہیں کر سکتے رخ۔“

”ایک بار کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ انسانی جان کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا شاہ جی۔“ رخ نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی کہ آیا ان کی بات ناکام ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے لیکن ہم مجبور ہیں۔“

”دو بچے بھی ہیں ساتھ۔“ رخ نے آہستگی سے سر جھکاتے ہوئے گویا شاہ جی کا دھیان بچوں کی جانب مرکوز کرنا چاہا بالکل اسی عمر کے بچے ہیں۔“

شاہ جی ایک تک سانسے سر جھکائے ہوئے رخ تاج کو دیکھتے رہے۔

”آپ جاہن تو، میرا مطلب تھا اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک کوشش کر کے دیکھ لوں اس گھر میں دو عورتیں ہیں، ایک یقیناً ماں ہے دوسری خالہ یا پچھو ہوگی اگر میں ماں سے مل کر اسے بتاؤں اس کے بچے خطرے میں ہیں تو شاید ماں تو ماں ہوتی ہے تا پھر ہو سکتا ہے وہ ہماری بات سنجیدگی سے سن لے اور.....“

”اور پہلے ہر کرائے دار کی طرح تمہیں برا بھلا بول کے گھر سے نکل جانے کو نہیں کہہ دے تم کب تک خوش فہمی کا شکار رہو گی۔“

”کہنے دیں شاہ جی کہنے دیں۔ ہو سکتا ہے اس بار یہ.....“

”اس سے پہلے کس نے ہماری بات سنی ہے جو یہ لوگ سنیں گے، رخ تاج چھوڑ دو بے کار ہے ایسی حرکتیں کرنا۔ بس چپ رہو۔“

”لیکن میں اس ڈر سے کیسے چپ رہ سکتی ہوں۔“

”کر کے دیکھ لو اپنی ضد پوری، نتیجہ وہی نکلتا ہے جو پہلے نکلتا رہا ہے۔“

”ایک کوشش کر کے دیکھ لینے دیں۔ کم از کم میرا دل تو مطمئن ہو گا۔“

”تم نے پہلے بھی سنی ہے جو اس بار سنو گی۔“

شاہ جی نے مسکراتے ہوئے اپنی نصف بہتر کو دیکھا جو چمکتی ہوئی نگاہوں سے انہی کی سمت دیکھ رہی تھیں، اتنے سال ایسے ہی نہیں گزر گئے تھے اور اس عمر میں آکر تو صحیح معنوں میں ہم سفر کا مطلب معلوم ہوتا تھا جب اولاد اپنی اپنی راہوں پر نکل جاتی ہے۔ اس وقت وہی، ہم سفر ساتھ رہ جاتا ہے جس کے ہمراہ ایک انجان سفر کا آغاز ہوا کرتا ہے، منزل سے انجان لیکن دلفریب راستہ جہاں سے گزرنے والا ہر ایک دن، حسین یادیں جمع کرتا رہتا ہے۔



”واؤ خالہ آج آپ.....اودھ“

عمر نے الماس کو کمرے میں آتا دیکھا تو فوراً ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔

”خالہ اس کے بغیر ہی آ جاتی نا۔“ مہر نے بھی الماس کے ہاتھ میں دودھ کے گلاس کی ٹرے دیکھ لی تھی۔
”نہیں پیتا خالہ..... پلیز۔“ عمر نے ہونٹ لٹکا کر الماس کو دیکھا۔

”اوکے اوکے ہاف گلاس تو پینا مسٹ ہے۔“ الماس کا دل پیچ گیا تھا۔ ”ورنہ آپ کی ماما سے مجھے ڈانٹ کھانی پڑے گی۔“

”ہاف چلے گا۔“ عمر نے فوراً ہی ڈیل ڈن کی اور اپنا گلاس اٹھالیا۔ گلاس ہوا میں لہراتے ہوئے فوراً ہی مہر کو دیکھا اور اسے چراتے ہوئے ڈش کوئی کی۔

”دیکھا آج ہی میں وزینوں گا۔“ مہر اس کے رد عمل میں اسے زبان نکال کر چراتی ہوئی فوراً پاپنا گلاس منہ سے لگا لیا۔

الماس ان دونوں کو دودھ پیتے دیکھ کر ٹرے اسٹڈی ٹیبل پر رکھ کر آس پاس بکھری ہوئی جکس دیکھنے لگی۔

”ارے واہ اسٹوری۔ ہم سینڈ بلا، الادین عمرو عیار واہ واہ چلو میں ایک اسٹوری سناتی ہوں۔ کیا یاد کرو گے۔“

”اسٹوری تو روز سنتے ہیں ہم خالہ۔“ مہر نے لمحہ بھر کے لیے اپنے گلاس کا جائزہ لیا اور فوراً ہی عمر کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا اس نے کتنا دودھ پی لیا ہے۔

”اچھا..... اچھا سمجھ کر بولتی ہوئی الماس نے پلٹ کر دونوں کو دیکھا۔

”باجی اتنی اچھی کب سے ہوں گی۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔“

”ماما تھوڑی سناتی ہیں عمر نے آخری گھونٹ بھر اور فوراً ہی الماس کو جواب دے کر شور مچانے لگا۔

”آئی ایم وز میں جیت گیا میں جیت گیا۔“ مہر جو عمر کی بات سن کر اسے اشارے سے چپ رہنے کو بول رہی تھی ایک دم خاموش ہو گئی لیکن پلٹتے ہوئے الماس نے مہر کی وہ حرکت دیکھ لی تھی۔

”اوئے کیا چھپا رہے ہو دونوں۔“ ایک دم الماس کے ہاتھ میں دبے ہوئے موبائل میں ہونی واہرٹ نے اس کا دھیان بنادیا۔

”اوکے بچوں گڈ ٹائٹ۔ جلدی سے سو جاؤ اچھا ورنہ ماما ڈانٹیں گی۔“

”ہیلو..... ہیلو یس بھٹی صاحب۔“ الماس فون کانوں سے لگائے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور ساتھ مہر نے عمر کو گھورتے ہوئے دیکھا۔

”بھائی وہ ہمارا اور ہمارے فرینڈ کا سیکرٹ ہے نا۔“ ”اودھ.....“

”ابھی آپ خالہ کو بتا دیتے اور خالہ ماما اور پھر فرینڈ ہمارے ساتھ کیسے کھیلنا۔“ مہر نے صورت حال کو تجربہ کیا اور عمر کو اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہا۔

”اوپس..... سوری فرینڈ۔“ عمر نے فوراً ہی بیڈ کے کارز پر باجی ہوئی گیند کو دیکھتے ہوئے سوری کی۔ ”اب خیال رکھوں گا لیکن دیکھو میں جیت گیا نا۔“ عمر نے فوراً ہی مہر کا یاد دلایا۔

”کوئی نہیں پہلی بار ہی تو جیتے ہیں۔“ مہر نے بھی فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔



”اودھ تنک کیو بھٹی صاحب۔“ الماس نے بچوں کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی سمت جاتے ہوئے فون پر بات جاری رکھی لیکن سونیا کو میسر جیوں سے اوپر آتا دیکھ کر وہی رک گئی۔

”ارے ہاں ہاں آپ کا کچ پکا۔“ ”فکر نہیں کریں۔“ سونیا نے الماس کی آواز سن کر بے اختیار اوپر دیکھا۔

”اوکے ہائے۔“ الماس نے فون کاٹ کر ایک نظر بچوں کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی جہاں سے ان کی باتوں اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں بند دروازے کے نیچے سے گیند کے ٹپے کھانے کا گیس بھی نمایاں تھا۔

”کیا بات ہے کس سے مسکرا مسکرا کر بات ہو رہی تھی، وہ بھی اس وقت۔“ سونیا نے ٹیرس سے باہر پہلی ہوئی تار کی پر نظر ڈالتے ہوئے بہن کو تنک کیا۔ بڑے بچے کرائے جارہے ہیں بھٹی۔“

”کولیک کا فون تھا باجی۔“ الماس نے منہ بناتے ہوئے فوراً ہی سونیا کو ٹوک دیا۔

”کایا کی؟“ سونیا نے آئی بروز کو اچکاتے ہوئے معصوم انداز میں سوال پوچھا۔

”بس شروع ہوگئی ہیں آپ۔“

”اچھا اچھا، تو کیا بول رہا تھا آپ کا.....“

”میں کل سے آفس جاؤں گی وہی بتا رہے تھے لیکن وہی مسئلہ پاس کے سائن رہ گئے ابھی بھی۔“

”ادھیہ تو واقعی اچھی بیوز ہے۔ اب لگ جاؤ وقاص کے پیچھے تاکہ.....“

”ان کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔“ الماس نے منہ بناتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت چلتا شروع کیا تو

سونیا بھی اسی کے ساتھ قدم بڑھانے لگی بچوں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک دم سونیا کے قدم سے

ہوئے۔

”سنو وہ بچوں کو.....“

”ہاں دے دیا تھا اور انہوں نے پی بھی لیا تھا۔“ الماس نے ادھوری بات کا پورا مطلب سمجھ لیا تھا۔

”آئیں آپ کو سوٹ دکھاتی ہوں کل آڈر کیا ہے آن لائن۔“ الماس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے سونیا کو

آفروی۔

”ابھی پچھلے ہفتے تو سوٹ منگوایا تھا اب پھر۔“ سونیا نے معصومی غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا تو الماس نے

فوراً ہی لپک کے سونیا کو بانہوں میں بھر لیا۔

”میں نے کون سا اپنے شوہر کو حساب دینا ہوتا ہے۔“

”مکن مکن کے وہ کپڑے بنا میں جو اپنے شوہر کو جواب دہ ہیں۔“

”اچھا بتاتی ہوں تم کو جواب دہ کی بجی۔“ سونیا نے فوراً اپنے ساتھ لگی ہوئی الماس کو گدگدی کی اور دونوں ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گئے۔

اگر وہ پلٹ کے بچوں کے کمرے کا دروازہ دیکھتے تو ان کو اب مہر اور عمر کی آوازوں کے ساتھ ایک اور بچی کی آواز

اور عکس نظر آجاتا جو دروازے کی جھری ٹیرس پر روشنی پڑنے کے باعث صاف نظر آ رہا تھا۔



رات کی گہری سیاہی ختم ہوتے ہوتے بلا خرچ کی دل فریب کرنیں ہر سو پھیلنا شروع ہوگئی تھیں اور الارم کی مدہم مدہم آواز سونیا کو کسمسانے پر مجبور کر رہی تھی تھوڑی ہی دیر

بعد سونیا نے بمشکل اپنی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھولی اور وقت دیکھ کر شہنشاہی آہ بھری۔

”کاش آج کو ایک اینڈ ہوتا۔“ بے اختیار ہی ایک سوچ نے سونیا کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ چار و تاجار اٹھ کے

وقاص کو دیکھنا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ نہیں تھا۔ سونیا کے مسکراتے ہوئے ہونٹ ایک دم سچ گئے لیکن اسی وقت اسے

یاد آیا وقاص لاؤنچ میں کام کرتے ہو گیا ہوگا اسے پراجیکٹ کا کوئی کام مکمل کرنا تھا، سونیا کی وجہ سے وہ اپنا لپ ٹاپ

اور کاغذات اٹھا کر باہر ہی نکل گیا تھا اور اب صوفے پہ سو رہا ہوگا۔

سونیا نے بیڈ چھوڑ کے چار دیواری اور کھینس تہہ کر کے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تاکہ صبح کی تازہ ہوا کمرے

میں بھر جائے کھڑکی کا ایک پٹ کھولا ہی تھا کہ اس کی نظر سامنے گہری سمت اٹھ گئی جہاں رخ تاج کھڑی ہوئی سونیا

کے گہری سمجھت کو اداسی سے دیکھ رہی تھیں سونیا ایک ٹک انٹی کو دیکھنے لگی شاید اسی آنکھوں کا ارتکاز تھا جو رخ تاج

نے چونک کے نظریں نیچے کی اور سونیا کو اپنی سمت دیکھنا دیکھ کے بے ساختہ مسکرا گئیں۔ رخ تاج کو مسکراتا دیکھ کر

سونیا بھی مسکراتی ہوئی ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کر گئی رخ تاج نے مسکرا کر جیتی رہو کا اشارہ کیا اور پردہ برابر کر دیا۔ سونیا

نے ان کے جانے کے بعد بچوں کو اٹھانے کے لیے ان کے کمرے کا رخ کیا۔ لاؤنچ میں بے سدھ سوئے ہوئے

وقاص کو دیکھ کر اس کے بوہستے ہوئے قدم رک گئے ایک ٹک کھڑے ہو کر سونیا نے وقاص کو پیار بھری نگاہوں سے

دیکھا اور جس کے اطراف فائس گھمری ہوئی تھیں تو لپ ٹاپ بھی ساتھ ہی رکھا ہوا تھا وقاص پہ ہلکی سی چارو ڈال کے

اس نے میز چیموں پہ قدم رکھے اور دروازہ کھولتے ہی آواز بلند کی۔

”اف بایں بھی نا۔“ الماس نے تقریر سن کے اپنا منہ

تکیے میں چھپا لیا۔

”لو یہ کون آگیا صبح ہی صبح۔“ الماس کے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی ڈور بیل کی سریلی آواز سن کر سونیا ایک دم چونک گئی۔

”کون ہے۔“

سونیا نے گھر کے اندرونی دروازے پر کھڑے ہو کر بچوں کے بل اونچا ہوتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا، اس وقت کون ہو سکتا ہے لیکن وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً گھر کے مرکزی دروازے کے سائیڈ میں تھا اسی لیے صرف سایہ ہی نظر آرہا تھا۔

”کون ہے بھی۔“ سونیا نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔

”مالی۔“

ایک بھترائی ہوئی آواز نے سونیا کو رکسنے پہ مجبور کر دیا۔

”اس گھر نے بلایا ہے، اسی لیے آیا ہوں۔“

”اس گھر نے۔“ حیرت سے سونیا نے اپنی طرف انگلی کی اور زیر لب پوچھتے ہوئے گیٹ کی سمت دیکھا۔

”میرے گھر سے کسی نے مالی کو کیسے بلایا اور مجھے ہی علم نہی اس بات کا۔“

”بھینچا گیا ہوں خود نہیں آیا۔“ مالی نے ایک بار پھر سخت لہجے میں جواب دیا، شاید یہ اس کے بات کرنے کا انداز ہی تھا۔

سونیا نے الجھتے ہوئے دروازہ کھولا سا سننے ہی اندیشہ مری کا لیکن مضبوط کاٹھی والا آدمی کھڑا ہوا تھا، درمیانہ قد،

چھوٹی بال جہاں کبھی سفیدی جھلک رہی تھی اور گہری سیاہ غیر معمولی آنکھیں جس میں کسی قسم کے جذبات کی رت محسوس نہیں ہو رہی تھی بے تاثر چہرہ، پتلے پتلے سفاک ہونٹ جو ایک دوسرے سے ایسے پیوست تھے جیسے کبھی جدا

ہی نہ ہوئے ہوا گراس کے ہاتھوں میں گھاس کاٹنے کے آلات نہیں ہوئے تو سونیا بھی یقین نہیں کر سکتی تھی ایسے پتھر اے ہوئے سپاٹ چہرے والا مالی ہو سکتا ہے۔

”اودہ اچھا اچھا آ جاؤ۔“

”ہری اب بچوں اسکول ٹائم۔“

”اسی کے ساتھ ہی سونیا نے الماس کے کمرے کے دروازے پر بھی دستک دی اٹھ جاؤ الماس، آج آفس جانا ہے۔“

میسر کس کا دروازہ کھلا اور لچہ بھر کر کھڑی ہو کر گہری سانس لے کر خود کو جیسے تازہ دم کرنا چاہا ہو۔ نیچے جاتے ہوئے سونیا نے ایک بار پھر بچوں کے کمرے میں جھانک کے تسلی کی آیا نیچے جاگ گئے یا نہیں مہربانہ پریشانی ہوئی جھوم رہی تھی تو عمر نیند میں بہکے بہکے قدم اٹھاتا ہوا ہاتھ روم کی سمت گامزن تھا۔ یہ دیکھ کر سونیا نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کیا اور خود نیچے اتر کے ناشتہ تیار کرنے لگی۔



”یہ الماس نہیں اٹھی ابھی تک، پہلا ہی دن ہے اور لیٹ ہونے کے ارادے ہیں اس کے۔“ بچوں کو دین میں بٹھا کر سونیا کو الماس کا دھیان آیا۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ پھر بیڑھیوں کی سمت رخ کر گئی اب اس کی بھی الگ سے ڈیوٹی شروع اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن بچال ہے خود اٹھ جائے۔“

”اے الماس۔“ اٹھ جاؤ دیر ہو رہی ہے۔“

”ہوں..... ہاں۔“ الماس نے چادر کے نیچے سے ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا کہا۔

”میں جا رہی ہوں۔“ سونیا نے دھمکی دی جواب میں ایک بار پھر الماس نے ہاتھ ہلا کر جانے کا کہا۔

”اوکے دین، آئم کوٹنگ۔“

”ارے اٹھ گئی تیار۔“ الماس نے سونیا کے انداز سے خفگی کا انداز لگایا اور غنودگی سے بھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میں بار بار نہیں آسکتی اوپر الماس۔ پہلے بچوں کے لیے آؤں پھر تمہارے لیے چکر لگاتی رہوں۔“ سونیا نے جب دیکھا کہ اس کی بات کا کوئی اثر نہیں تو مزید غصا ہوئی ہوئی باہر کی جانب بڑھنے لگی۔

”میں واقعی جا رہی ہوں اور دوبارہ نہیں آؤں گی اور اب تم نے جلدی جلدی کے پکر میں ناشتہ کس کر دیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ دروازے سے نکلے نکلے ہوئے

سونیا سے تڑی لگا نا نہیں بھولی۔

الماس نیند سے لڑتی ہوئی اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھی، آج کافی دنوں بعد آفس جانے کا سن کر جہاں خوشی ہو رہی تھی وہی اٹھنے سے بیزاریت بھی عروج پہنچی۔
 ”نفقت ہو، عادت خراب ہو جاتی ہے اگر کچھ دن آفس نہ جاؤ تو۔“ الماس نے بیڈ سے اترتے انگڑائی لیتے ہوئے جسم کھولا۔ اب وہی روز کی روٹین کپڑوں کی ٹینشن، پریس کی مصیبتیں۔
 سچ ہے بندہ کسی حال خوش نہیں۔

الماس نے آج پہننے والے کپڑوں کا سوچا اور الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔

ہوں، اب پہلے دن کے حساب سے کون سا سوٹ پہنا جائے بھلا..... یہ والا، یا یہ والا۔“ الماس نے دو سوٹ نکال کے خود پر رکھے اور دیرے دیرے قدم بڑھاتی ہوئی ڈریسنگ کی جانب بڑھی، شکر پہلے سے ہی کچھ سوٹ سلوا لیے تھے، ورنہ ابھی پرانے ہی پہننے پڑتے۔

ہر لڑکی کی طرح الماس کا لمبی اذلی دکھ اور پریشانی کپڑے ہی تھا، باوجود اس کے کہ وہاں پورا شاف نیا تھا جو پہلی بار الماس سے ملتا اور انہیں خاک بھی نہیں پہنچتا تھا کون سے کپڑے نئے ہیں یا کون سے دوسری بار کے پہنے ہوئے۔

”اس میں موٹی ناگ جاؤں۔“ الماس نے آئینے میں خود کو دیکھ کے زیر لب کیا اور ایک دم خود دور ہو گئی اس کے عین پیچھے بیڈ کے اوپر کھلی ہوئی کھڑی میں ایک کالی بلی براجمان تھی اور الماس کو ہی ایک تک دیکھ رہی تھی الماس نے گھبراتے ہوئے فورا ہی پیچھے ہٹ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اس نے آنکھیں مسل کر ایک بار پھر دیکھا اور کسی کو ناپا کر کندھے اچکا لیے

تو یہ کیا کیا نظر آ رہا تھے۔ نیند کی کمی گتی ہے شاور لے لی اولوں ورنہ بلی کے بعد اب شیر نا دکھائی دے جائے الماس نے بلا خرابیاں لیگر بیڈ پر ڈالا اور دوسرا الماری میں دینگ کرنے کے بعد ہاتھ روم کی جانب قدم بڑھا لیے۔
 اس کے ہاتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہی کھڑکی میں ایک کالی بلی نمودار ہوئی اور ہلکے سے غرائی ہوئی اس نے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔

مالی نے سکون سے زمین سے اپنے باقی اور اڑا اٹھائے اور گھر کے اندر قدم بڑھا دیے۔
 ”کس نے بھیجا ہے تمہیں۔“ سونیا نے خاموشی سے گھبراتے ہوئے فوراً ہی سوال پوچھ لیا۔ آس پاس گہرا سکوت طاری تھا کچھ دیر پہلے کی خوشگوار سرسراہٹ ہوئی ہوا بالکل بندھی چھپاتے پرندے ایک دم غائب ہو چکے تھے ہر سون سے ہی خاموشی پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی طوفان غی آمد ہوا اور ہر جاندار بک کر خاموش ہو چکا ہو کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

”آپ کو علم ہے۔“ کھڑکھڑاتی ہوئی آواز نے بے تاثر انداز میں جواب دیا۔

سونیا کو ایک دم شبیر کا دھیان آیا کُل ہی تو اس کے بات ہوئی تھی کہ مجھے مالی کی ضرورت ہے اور آج بھیج بھی دیا۔
 ”کام شروع کر دو؟“ مالی نے سونیا کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بھرپور طریقے سے گھر کے بیرونی حصے کا جائزہ لیا۔

سونیا کو احساس ہوا مالی بالکل نہیں جھپک رہا۔
 ”کیا تم ادھر پہلے بھی کام کر چکے ہو۔“

”ہاں میں ہی ادھر کا کام تمام کرتا ہوں۔“ مالی نے ایک دم سونیا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا جسے سن کے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنات سی دوڑ گئی سونیا اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کام بتائیں گی یا میں اپنا کام خود شروع کر لوں۔“

سونیا جی ابھی تک مالی کی بات پر ہی غور کر رہی تھی ایک دم چونک گئی۔

”ہاں ہاں تم کام شروع کرو، جانتے ہی ہوتا کیسے اور کس طرح۔“

”ہاں میں اپنا کام بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ مالی متوازن چال چلتا ہوا سکون سے سونیا کے پاس سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سونیا کو یکدم پیش کا سا احساس ہوا جیسے کوئی شدید گرم چیز سونیا کے پاس سے گزری ہو۔



ہی تو کہوں گی۔“ ایشہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے سانسے
بٹھے شہیر کو جھوٹی تسلی دی۔

”واقعی صرف پیپر زکی پریشانی ہے۔“
”کیا ہوم ٹیوٹر لگاؤ دوں؟“

”نہی..... نہیں پاپا اب اتنی بھی کوڑھ دماغ نہیں
ہوں۔“ ایشہ کے لبوں پر کافی دنوں بعد مسکراہٹ کھلی تھی
بس اس بار میرٹ ہائی ہے نا، اگر اچھے گریڈز نہیں لیے تو
کالج میں ایڈمیشن مسئلہ کر دے گا۔“

”ارے تو کوئی بات نہیں میری بیٹی سے بڑھ کر کچھ نہیں
ہے۔ میڈیکل تاسی کوئی اور لائن سہی۔“ شہیر نے دل پر
جبر کر کے اسے کھلی جھوٹ دی۔

ایشہ نے مسکراتے ہوئے شہیر کو دیکھا، اسے اچھی
طرح علم تھا ایشہ کو ڈاکٹر بنانے کا خواب ماں کا تھا جسے پورا
کرنے کے لیے شہیر دن رات کام کرتا تھا اور ہر ممکن بچت
کرنے کے بعد بھی اپنے اوپر ایک پیسہ لگا تا حرام سمجھتا تھا۔
”نہیں آپ فکر نہ کریں پاپا میں آپ کو مایوس نہیں
کروں گی۔“ ایشہ نے اپنے ساتھ شہیر کو بھی تسلی دی دل لگا
کر پڑھوں گی تو یقیناً میرٹ کوڑ ہو جائے گا بس یہ ایسے
ہی۔“

ایشہ نے مسکراتے ہوئے شہیر کو دیکھا جس نے نا
چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے جھوٹ کا محرم رکھ لیا۔

سونیا مالی کو کا ہے بگا ہے دھمکتی ہوئی خود بھی اس کے
ساتھ لان کی سیننگ کر رہی تھی، گتے ایک جگہ سے دوسری
جگہ رکھتے ہوئے وہ مالی پر نظر ڈالنا نہیں بھولی تھی لیکن وہ
ایک رپورٹ کی طرح اپنے کام میں کچھ اس طرح مگن تھا
جیسے وہ اکیلا ہی ہو آس پاس کوئی اور انسان نا ہو اور اگر کوئی
ہے بھی تو اسے کچھ پروا نہیں کسی کی بھی۔

”کچھ الگ ہے اس میں۔“ سونیا نے مالی کو نظروں
میں رکھتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ سمجھ نہیں آرہا
کیا لیکن کچھ تو ہے عام انسانوں کی طرح کیوں نہیں لگ رہا
یہ۔

”باجی میں اٹھ چکی ہوں۔“ الماس نے آہٹ محسوس

”اسکول نہیں جانا میری بیٹی نے۔“ شہیر نے ایشہ
کے کمرے پر ہلکے سے دستک دے کے نیم وادروازہ
کھولا۔ سامنے ہی بکھرے بالوں کو سہیتی ہوئی ایشہ بیڈ پر
بیٹھی ہوئی نظر آئی۔

”تیار بھی نہیں ہوئی ہوا بھی تک۔“
”نہیں پاپا موڈ نہیں ہو رہا۔“ ایشہ نے بے زاری سے
جواب دیا۔

”کیا ہو گیا ایشہ میں ٹوٹ کر رہا ہوں تم کچھ دنوں سے
چپ چپ ہو۔“ شہیر نے اندر کی جانب قدم بڑھائے۔
”تن نہیں نہیں تو پاپا بالکل نہیں۔“ ایشہ کو اندازہ نہیں تھا
شہیر ایسے ایک دم اسے ٹوک دے گا۔

”میری آنکھیں دھوکا نہیں دے سکتی یہ ایک باپ کی
نظریں ہیں۔“ شہیر نے مصنوعی غصے سے اپنے کالر کھڑے
لیے۔

”کچھ تو ہوا ہے کسی دوست سے لڑائی تو نہیں ہو گئی مجھے
بتاؤ میں بات کرتا ہوں یا اسکول میں کوئی مسئلہ ہے۔“
”وہ پاپا..... وہ.....“ ایشہ کے لیے اس صورتحال سے
ٹٹکنے کے لیے کوئی پرانا تجربہ بھی نہیں تھا جو آج کام آ جاتا۔

سیدھی سادی لائف میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا عز پر از
جان باپ سے جھوٹ بولنا پڑا ہو۔

”بچہ زقرب ہیں نا، اسی کی ٹیشن ہے۔“ ایشہ کو بالا خر
ایک مناسب بہانہ مل ہی گیا۔

”کوچنگ سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا کیا۔“ شہیر نے
فوری طور پر سوال پوچھا تا کہ اندازہ لگایا جائے اور ٹیشن کی
ضرورت تو نہیں

کوچنگ۔“ ایشہ نے زیر لب کہا اور اس کا دھیان
رائیل کی سمت ہو گیا۔

”پتا نہیں وہ آیا یا نہیں پاکستان۔“
”بولو بیٹے میں ہوں نا، کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ مجھے۔“ شہیر
کے لیے ایشہ کو ایسے گم ممدیکنا بالکل گورائیں تھا، اسی کے
لیے تو وہ اتنے عرصے بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے
ہاتھ رنگ رہا تھا۔

”کچھ نہیں پاپا، کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر ہوا تو آپ سے

کرتے ہی بلند آواز کے ساتھ اس کی تلی کرائی۔

کیونکہ پاؤں وزن اٹھانے سے انکاری لگ رہا تھا۔



”آپ بس ناشتہ تیار رکھیں میں آرہی ہوں۔“ الماس نے تھوڑے برش کرتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے کو کھلتے ہوئے سنا تو فوراً ہی سونیا کو اپنے تئیں خوش خبری سنائی کہ وہ نا صرف اٹھ چکی ہے بلکہ ہاتھ روم میں بھی ہے۔ ”باجی.....“ کوئی جواب نا پا کر الماس نے سونیا کو پکارا۔

”سن رہی ہیں نا۔“

ابھتی ہوئی الماس نے ہاتھ روم سے جبری بنا کر باہر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور کمرے کا دروازہ بھی پوری طرح بند تھا۔

”باجی..... باجی آپ ہونا کمرے میں.....“

خالی کمرے میں الماس کی آواز گونج کر رہ گئی۔



جس وقت الماس اپنے کمرے میں سونیا کو جواب دے رہی تھی اسی وقت سونیا لان میں گئے اٹھا کر ادھر سے ادھر رکتی ہوئی بری طرح مصروف تھی۔

”یہ تو بہت بھاری ہیں بھئی سنو مانی۔“ سونیا نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا بھاری گملہ دوبارہ زمین پر رکھا اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے دباتے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”مانی اے مانی۔“ سونیا نے ایک بار پھر مانی کو آواز دی اور سر گھا کر اسے دیکھنا چاہا۔

جیسے ہی سونیا نے سر گھمایا مانی کو اپنے انتہائی نزدیک پا کر لڑکھڑاکے دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور لٹھ بھر پہلے جس بھاری گملے کو رکھا تھا اسی سے ٹکرا کے گر گئی۔

”اوج.....!“

سونیا نے غصے سے مانی کو دیکھا جو بے نیازی سے گرے ہوئے گملے کو اٹھانے میں مصروف تھا بجائے اخلاقی طور پر ہی سونیا کا حال پوچھنے کے۔

”بدتمیز انسان۔“ سونیا نے زیر لب اسے کو سننے دیے اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پاؤں پر وزن پڑتے ہی اسے احساس ہو گیا، کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے پاؤں کے ساتھ اب یقیناً کچھ بدن چلنے پھرنے سے احتیاط کرنی پڑے گی، خاص طور پر سیڑیوں سے پرہیز لازمی تھا

الماس ٹاول سے منہ صاف کرتے ہوئے سونیا کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی الماری کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اگر ابھی شاور پائل کھلا ہوتا تو یہ نامحسوس آواز کا علم بھی نہیں ہوتا لیکن پگھلا بند ہونے کے باعث ہلکی سی آواز بھی ہاتھ روم تک صاف سنائی دے رہی تھی۔

”پھر آگئیں باجی۔ کیا ہو گیا ان کو۔“ الماس نے ٹاول اسٹینڈ پر لٹکاتے ہوئے کندھے اچکائے اور سر جھکتی ہوئی ہاتھ روم سے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں ابھی بار۔“ الماس نے باہر نکلتے ہوئے بلند آواز سے سونیا کو مخاطب کیا اور ایک بار پھر خالی کمرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”کیا آنا جانا لگا رکھا ہے باجی نے آج۔“

الماس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا شاید سونیا کہیں چھپ کر اسے تنگ تو نہیں کر رہی لیکن بھائیں بھائیں کمرہ الماس کو قطعی غلط ثابت کر رہا تھا۔ سر ہلاتی ہوئی الماس نے دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے نکل کر میسر کی طرف نظر دوڑائی جیسے سونیا وہاں چھپی ہوئی ہو لیکن وہاں بھی سانے کا راج دیکھ کر چپ ہو گئی۔

کپڑے اٹھانے کے لیے بیڈ کی سمت بڑھی ہی تھی کہ سامنے رکھے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی

بیڈ پر اس کے نکالے ہوئے کپڑوں کی جگہ کوئی اور سوٹ سجھا ہوا تھا ساتھ میچنگ پننڈ بیک بھی برابر ہی رکھا ہوا تھا۔

”باجی بھی نا۔“ الماس نے کپڑے بدلنے کی خاطر ہاتھ روم کی سمت قدم بڑھائے اور مسکراتی ہوئی سوٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ہاتھ روم کا دروازہ بند کیا ہی تھا کہ الماس کو ایک بار پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اب وہ جھنجھلائی ہی لیکن اس بار اس نے ہاتھ روم سے باہر نکل کر نہیں دیکھا کہ کون ہے کمرے میں اگر الماس اس بار میسر

بردبختی تو اسے معلوم ہو جاتا اس کے کمرے سے کالی ملی
جھپٹتی ہوئی نکل کر چھت کی جانب جا رہی ہے۔



سونیا لاؤنج میں بیٹھی ہوئی سکون سے اخبار پہ نظریں
جسائے بیٹھی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی، جیسے
کوئی چپکے سے اس کے پاس آ رہا ہو۔ سونیا اپنا وہم جان
کے بے پروائی سے بیٹھی رہی لیکن لاشعوری طور پہ اس
آہٹ کی جانب ہی ذہن رہا ایک دم دائیں ہاتھ سے دو
بڑھے ہوئے ہاتھوں نے سونیا کو اچھل جانے پہ مجبور
کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ بلند آواز میں چیخی ان ہاتھوں
نے نرمی سے سونیا کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

”بوجھو تو جائیں۔“

”اف کہ کیا بد تیزی تھی یہ۔“ سونیا نے دہلتے ہوئے
الماس کے ہاتھ تھامے اور گھور کر اسے احساس دلانا چاہا۔

”ایسے بھی کوئی ڈراتا ہے کیا، وہ بھی صبح۔“

”اچھا جی اور جو آپ صبح سے میرے ساتھ کر رہی تھیں
وہ کیا تھا پھر۔۔۔۔۔!“

”میں کیا کر۔۔۔۔۔ ادھ واؤ۔۔۔۔۔ سوٹ تو بہت پیارا پہنا
ہے۔“ سونیا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بغور الماس کو
دیکھا جو کھلتے ہوئے پنک سوٹ میں خود بھی پنک پنک سی
ہور رہی تھی۔

الماس نے تعریف سن کے فوراً ہی اتراتے ہوئے گھوم
کر سونیا کو دیکھا۔

”آخر چوٹس کس کی ہے۔“

”جو بھی پہن لو، سب اچھا لگتا ہے تم پہ۔“

”بہن بھی تو دیکھیں کس کی ہوں۔“ الماس نے
مسکراتے ہوئے سونیا کو دیکھا اور سوٹ کے لیے شکریہ
بولنے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا اسی وقت اس کا موبائل بج
اٹھا سونیا اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی بالکل
اولاد کی طرح پالا تھا الماس کو اور اب وہ اتنی بڑی ہوئی تھی
کہ شادی کے لیے رشتے آنے لگ گئے تھے وقت گزر رہا
کہاں معلوم ہوتا تھا بھلا۔

الماس فون پر بات کرتے کرتے کچن تک جانے لگی
لیکن سامنے میز پہ ہی ناشتہ ڈھکا دیکھ کر وہی بیٹھ گئی اور فون

”کیا ہوا باجی، تھکی ہوئی لگ رہی ہیں خیریت ہے۔“
”صبح سے گارڈن میں لگی ہوئی تھی اوپر سے سونے پہ
سہاگ۔۔۔۔۔!“ الماس کا فون ایک بار پھر بجنے کے باعث
سونیا کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ مصنوعی انداز میں اسے
گھورنے لگی لیکن الماس فون اٹھانے کے بعد اسے ایک
آنکھ مار کے معذرت کرتی ہوئی بات کرنے لگی۔

”سوری سوری سوری۔ ہاں تو کیا بول رہی تھیں آ
ب۔“ الماس نے فون بند کرتے ہی فوراً سونیا کو مخاطب کیا
لیکن اسی وقت وقاص ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے داخل
ہوا جسے دیکھ کے الماس حیرت سے اپنی بات ادھوری چھوڑ
نے پہ مجبور ہو گئی۔

”لوجی سالی صاحبہ اینڈ بیگم صاحبہ فوراً چائے پی لو اور
بات سنو تم (الماس کی طرف مصنوعی ناراضگی سے گھورتے
ہوئے وقاص انگلی کھڑی کر کے اسے دیکھا) پہلے ہی دن
لیٹ جاؤ گی کیا اپریشن پڑے گا میرے انڈر وہوم سوبی
کیئر فل۔“

”آپ کے انڈر ہوں تو ظاہر ہے آپ کے ساتھ ہی
جاؤں گی، اینڈ بائے دے دے یہ آپ کس خوشی میں صبح
کچن میں گھسے ہوئے ہیں میں نوٹ کر رہی ہوں بھائی جان
آپ کے زن مرید ہوتے جا رہے ہیں۔“

وقاص نے خوشگوار انداز میں قہقہہ لگایا اور اپنا چائے کا
کپ لے کر سکون سے سونیا کے پاس جا بیٹھا جس کی اتنی
خوبصورت بیوی ہوتو اسے زن مرید ہی ہونا چاہیے نا۔
سونیا نے بہن اور شوہر کو چٹکے چھوڑتے دیکھ کر سر جھٹکا
اور اپنا کپ لینے کے لیے آگے ہوئی، بے ساختہ ہی اس
کے منہ سے گراہ نکل گئی جسے سن کے الماس نے چونک کے
سونیا کی سمت دیکھا۔

”کیا ہوا باجی ارے آپ کے باؤں کو کیا ہو گیا۔“
”بہن بیٹانے کی تو کوشش کر رہی تھی کہ صبح گارڈن میں
سکے سے کراہتی اور اب چلنے پھرنے میں اتنی تکلیف

وہ فوراً ہی کمرے سے نکل کر چیخ چیخ کے اسٹاف کو اپنی طرف متوجہ کر کے لگا۔

”ہیلپ..... ہیلپ..... ادھر آؤ دیکھو اسے۔“
نرس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تیز رفتاری سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور فیصل کو باہر نکال دیا۔ فیصل یاسیت سے ٹمن کے بیڈ کو دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر جاتے ہی اس کا دھیان کسی سمت گیا جس بنا پر اس نے چوٹک کے نورانی اپنا موبائل نکالا۔
”آہ پھر وہی وقت قریب آگیا۔ شاید اسی لیے ٹمن.....!“

.....
”پلیز بچوں تنگ نہیں کرو۔“ سونیا نے دیوار کے سہارے چلتے ہوئے بچوں کو لچکرایا اور اب ہوم ورک کرانے کے لیے بٹھانے کی جستجو کرنے میں مگن تھی لیکن بچے اس کی سننے کے بجائے کھیل میں مصروف تھے۔
”میں ابھی یہ پلے اسٹیشن بند کر دوں گی۔“ سونیا نے تا صرف دھمکی دی بلکہ انبارخ بھی ایل ای ڈی کی سمت بدل لیا جیسے ابھی اسٹیشن ہی تو لگی ہے۔
”اوہو ماما۔“

”رکس نا ابھی بس یہ گیم ختم ہونے دیں۔“ عمر نے بھی تنگ کے جواب دیا۔
”ہم کر لیں گے ہوم ورک، ڈونٹ یووری۔“
”کب کر لو گے دیکھو شام ہونے والی ہے پوری دوپہر گزرادی تم دونوں نے معلوم بھی ہے ماما تکلیف میں ہیں لیکن نہیں۔“ سونیا نے غصے سے دونوں کو جھڑتے ہوئے کہا تو بچے منہ بسورنے لگے۔
”کب ختم ہوگا یہ لیول۔“ نا چاہتے ہوئے بھی سونیا نے نرمی سے جواب چاہا۔
”ٹوئٹی منٹ۔“

”او کے..... او ٹی ٹوئٹی منٹ اس کے بعد ہوم ورک اور فوراً اپنے کمرے کی سمت۔“ سونیا نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے ایک بار پھر دونوں کو دیکھا جو کھینچنے میں مصروف تھے۔

ہورہی ہے۔ تمہارا یہ ناشتہ بھی انہوں نے بنایا ہے۔“
”تو پھر میرے کمرے میں اتنے چکر لگانے کی کی ضرورت تھی بھلا۔ اٹھا دیا تمہاں اس کے لیے ایویں اوپر آئیں آپ۔“ الماس نے اپنے سوٹ کی جانب اشارہ کیا۔
”میں آئی۔“ سونیا نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا
”میں تو کب سے ادھر ہی بیٹھی ہوں۔ پاؤں ہلانے کی بھی ہمت نہی ہو رہی بلکہ ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی سوچ رہی تھی وقاص کو بولوں جا کر دیکھیں تم جاگتی ہو یا نہیں ویسے ہی اتالیق لطیف ہوں۔“

”کیا۔“ الماس نے حیرت کی زیادتی سے سونیا کے پاؤں کو دیکھا جو سوچ کر اپنی جسامت سے دوگنا ہو چکا تھا اور پھر اپنے کپڑوں کو دیکھا اگر سونیا نے یہ سوٹ نہیں نکالا تو کس نے الماری سے نکال کے بیڈ پر رکھا تھا۔
باقی باتیں بعد میں کر لیتا سالی جی، ابھی نکلنے کی کرو۔“
وقاص نے چائے کی خالی پیالی رکھی اور کھڑے ہوتے ہوئے الوداعی نظر سونیا پر ڈالی۔

”میں کوشش کرونگا جلدی آنے کی تاکہ پر اپر چیک اپ ہو جائے اس کا۔“ اشارے سے پیر کی سمت انگلی کی اور دوسرے ہی پل اسی انگلی سے سونیا کو کھڑے ہونے کو کہا۔
”ویسے تو شاید ضرورت نہیں ہو، شام تک سو جن کم ہو جائے گی۔“ سونیا نے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا تو ایک ٹیس اٹھ گئی لیکن غنیمت تھا ڈی نہیں ٹوٹی تھی صرف ٹھوکر لگنے سے چوٹ اور سو جن ہی آگئی تھی۔

”پھر بھی تسلی ہو جائے گی اوہو اٹھ بھی چکوپار۔“ وقاص نے باہر کی سمت قدم رواں کئے تو الماس بھی کم سمی پیچھے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سونیا نے اسٹنے کی کوشش ہی نہیں کی اور نا ہی اسے علم ہوا ان دونوں کے نکلنے ہی صوفے کے پیچھے سے ایک کالی بلی بھی ان کے پیچھے چلتی چلی گئی۔

.....
دوپہر کی اپنی مخصوص چہل چاہل ہر سوں تھی اسی میں فیصل کمرے کے کونے میں بیٹھا ہوا کتاب پر نظریں جمائے ہوا تھا کہ اچانک ٹمن کی ہارٹ بیٹ تیز ہوئی پیپ پیپ کی کھنکھناتی ہوئی آواز سن کر فیصل کے اوسان خطا گئے اور

رخ تاج جو اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی شاہ جی کے کرتے پہ بنن ٹانگ رہی تھیں ایک دم چپک گئیں اور فوراً ہی اپنا دائیں ہاتھ منہ پہ ایسے رکھا جیسے توغ کے خلاف کچھ یاد آ گیا ہو۔ کرتا چھوڑ پھاڑ کے وہ پھرتی کے ساتھ کھڑی ہوئیں اور تیزی سے بیڈ کے برابر دھرے ہوئے ٹیبل کلینڈر کو اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت شدید حیرت اور دکھ کا شکار تھیں۔

”یا اللہ، پھر آگئی وہ رات۔“

خالی کمرے میں رخ تاج کی بڑ بڑاہٹ بھر گئی اور وہ کلینڈر ہاتھ میں لیے سر ہاتھوں میں گرا چکی تھیں۔



”اوہ راحیل فون پک کرو۔“ اچھ نے چوتھی بار راحیل کو فون کرتے دل ہی دل میں منت ہی کی۔

”پتہ نہیں کیوں نظر انداز کر رہا ہے راحیل جبکہ اب تو اس کے ڈیڑی بھی آگئے ہوں گے پاکستان پھر اب!“

اچھ نے انجمن کا سرا پکڑنا چاہا لیکن جان کر الجھائی ہوئی چیزیں دل کا سرا پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔

”راحیل کہاں ہو۔“ اچھ نے ایس ایم کیا اور سوپاٹل ایسے تمام کمرے بیٹھی جیسے ابھی جواب مل جائے گا۔

جبکہ اسے ہرگز علم نہ تھا وہ شبیر کی کرنی بھیجتے والی ہے، جہاں ایک طرف مصمم اور بے گناہ لڑکی شبیر کی لالچ کی جینٹ چڑھنے والی تھی آج وہی اس کی اپنی بیٹی بھی

ملاقات عمل کی نظر ہو رہی تھی۔



دھوپ ڈھلتے ہی جہاں ایک طرف رخ تاج پریشانی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی تو دوسری طرف اب سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا، ایسا لگتا جیسے وہ بھی جلد از جلد جانے کے لیے پرتول رہا ہوتا کہ آج رات

ہونے والے مکمل کا وہ گواہ بنے۔

آج رات، ہاں آج ہی رات چاند پورا ہونے کی تاریخ تھی جس میں اس آسیب زدہ گھر کے کسی ایک جیتے جاگتے انسان کی نصیب میں سیاحی پھیل جانی تھی۔

پورا ہوتا چاند بھی کچھ افسردہ دکھائی دے رہا تھا، برسوں

سہوے گناہ لوگوں کو ملی چڑھتے دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا اور آج بھی وہ خاموش تماشا کی بننے جا رہا تھا۔

شام ہوتے ہی ہوا میں انجانی سی تیزی لگ آئی اور کالی ملی خونی گھر کے عین سامنے آن بیٹھی۔

آج شام ہوتے ہی آس پاس کے درختوں پر بھی کوئی پرندہ پر نہیں مار سکا تھا، چاروں خاموشی تھی جیسے ہر ایک دم سا دھسے بیٹھا ہو اور آنے والا وقت بے آواز نام کر رہا ہو۔

ایک طرف جہاں ایسی خاموشی کا راج تھا تو دوسری طرف وہ کالی ملی رفتہ رفتہ چاند ابھرنے کے ساتھ غرائی ہوئی رونے میں مصروف تھی۔

پورا چاند بھی تھا، گہری ڈھلپٹ ہوئی رات بھی تھی، سناٹا اور ایرانی ٹپٹپٹیاں تھی، کالی ملی بھی تھی، سارے لوازمات پورے تھے، اس تیس دن کے خونی چکر کو پورا کرنے کے لیے، کئی تھی تو صرف اس کی جوائے ہی والا تھا اور یقیناً اس کے آنے کا دن آج ہی تھا۔



سونے رات ہوتے ہی بچوں کو سنانے لگا اور خود وقاص کا انتظار کرنے لگی، پاؤں کی سوچن کے باعث چلنے پھرنے میں دشواری ضرور تھی لیکن مارے ہاندھنے کام ہو

ی رہا تھا۔

”میں جلدی آ جاؤں گا، وقت دیکھو ذرا۔“ سونیا نے جھنجھلاتے ہوئے فون اٹھایا اور کمرے میں لیٹے لیٹے وقاص کو فون کرنے لگی۔

”ہلو کہاں ہو وقاص۔“

”سوری یار۔۔۔۔۔ لیٹ ہو گیا نا۔“

”آپ نے جلدی نہیں آنا تھا۔“ نا چاہتے ہوئے بھی ٹھوہکیوں سے پھسل ہی گیا۔

”بس عین وقت پہ باس آ کر بیٹھ گیا تو کیسے کل سکا تھا ابھی پانچ منٹ پہلے ہی اس نے جان چھوڑی ہے۔“

”تو پھر اب۔“

”کل رہا ہوں، واٹس ایپ کرنے لگا تھا کہ آپ کا فون آ گیا جناب۔“

”بس آپ کو اپنے آفس کے آگے کچھ نظر نہیں آتا آج کل۔“ سونیا نے تنک کر وقاص کو جواب دیا ”کیا آپ کو

۲۰۱۸ اکتوبر

معلوم نہیں تھا میرے پاؤں.....!“
”معلوم تھا یا رلیکن کیا تم کو لگتا ہے میں جان بوجھ کر نہیں آیا۔“

”مجھے نہیں معلوم لیکن آپ خود کیجیے اب۔“
”کام کر رہا ہوں سونیا، تفریح تھوڑی کر رہا ہوں جو ایسے بول رہی ہوں۔“ وقاص کی بلند ہوئی آواز سن کے سونیا کو مزید غصہ چڑھ گیا۔
”کام کو سر پہ سوار کریں گے تو یہی ہو گا فیملی کے وقت فیملی اور کام کے وقت کام ہو تو بہتر ہوتا ہے وقاص۔“
”اوہ کم آن یار مت تنگ کرو، پہلے ہی اس باس.....!“

”باس باس باس ایسا کریں وہی رہنا شروع ہو جائیں آپ۔“
”کیوں بچوں والی باتیں کر رہی ہو سونیا۔“ وقاص نے چڑتے ہوئے کہا۔ ”نو کری ہے کوئی ماما جی کا بزنس نہیں جو جب دل چاہا نکل کر آ گیا۔“

”بس رہنے دیں آپ۔“ سونیا نے غصے میں فون ہی کاٹ دیا اور گھر کے گہرے سانس لے کر خود یہ قابو پانے لگی، دوسری طرف وقاص نے ٹھنڈی آہ بھر کے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنی فائلز اٹھانا شروع کر دی۔

”اب کیا ہو گیا۔“ شاہ جی نے دواؤں کا شمار رخ تاج کی جانب بڑھاتے ہوئے ان کے چہرے پر پھیلے ہوئی اداسی دیکھی تو پوچھنے پر نہ رہ سکے، جواب میں رخ تاج ان کو دیکھتی رہیں۔

”کیا ہوا رخ خیریت تو ہے نا؟“ انجانے خدشے کے سبب شاہ جی کا دل دھڑکا۔

”کہیں کوئی فون تو نہیں آ گیا۔“
”نہی میں سر ہلاتی ہوئی رخ تاج نے جہاں شاہ کو سکون کی سانس لینے پر مجبور کیا وہیں انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک بار پھر اپنی بیوی کو دیکھنا شروع کر دیا۔

”آج..... آج وہی رات.....!“
”اوہ.....!“
”خدا خیر رکھے۔“

”ہوں۔“ شاہ نے لب بھینچ کر بے ساختہ ہی کھڑکی سے نظر آنے والے گھر کو نظروں میں سما یا۔
”پتہ نہیں کس کی باری آئے گی۔“ رخ تاج نے بڑبڑاتا جاری رکھا۔ ”بچے بھی تو ہیں ساتھ۔“

شاہ جی مایوسی سے سر ہلاتے رہے لیکن کچھ بھی کہنے سے پرہیز ہی کیا، ان کو معلوم تھا اس وقت کچھ بھی کہنا رخ تاج کو مزید ڈپریشن کا شکار کر دے گا۔ رخ تاج نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑی اور اٹھ کر کھڑکی کی جانب قدم بڑھانے لگیں۔

”کاش ہم کسی کو بچا سکتے کاش کوئی ہماری بات سن لیتا۔“ پردہ ہٹا کر پوری کھڑکی کو نمایاں کرتی ہوئی رخ تاج کی پیشانی پر ان گنت ٹیکریں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ کس ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔

”کاش یہ لوگ ہماری بات پر یقین کر لیں تو شاید..... شاید.....!“

سامنے ہی وہ خونی گھر پورے چاند کی روشنی میں چوڑی طرح نمایاں تھا، اس کے گرد ناظر آنے والا ہلولہ بھی گھر کا طواف کر رہا تھا، جیسے کوئی مناسب وقت اور جگہ کی تلاش میں ہو۔ گھر کے لان کے پتوں سچ کالی پٹی روٹنے میں مصروف تھی، ہندو سچ پٹی کے روٹنے کے ساتھ ساتھ کسی بچے کی سنسکیوں کی آواز بھی فضاء میں شامل ہوئے گی جبکہ وہ بچہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پٹی کے برابر ہی چمکتی ہوئی گیند کچھ اس طرح فضا میں بلند تھی جیسے کسی بچے نے اسے ہاتھ میں اٹھا رکھا ہو۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



پروڈکشن بائوس بلنگ

شوہر کے معنی دکھاوے کی دنیا ہے وہاں ہر چیز لٹلی اور چمکدار آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہوتی ہے نفرت ہو یا محبت سب دکھاوا ہوتی ہے اس کا مطلب لوگوں کو تفریح فراہم کرنا ہوتا ہے۔

شوہر سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی کا فسانہ ان میں بہت محبت تھی

عدنان کافی دیر بیٹھا روتا رہا اور سے میت کو لینے اس کے بچے روانہ ہو چکے تھے۔ عدنان اور ماہم کے دو بیٹے شعیب خان اور جنید خان اور ایک بیٹی آصفہ خان تھی۔ عدنان فلم انڈسٹری کا بہت بڑا نام تھا کی فلمیں عدنان خان کی بنائی ہوئی تھیں جو کافی عرصے تک پاکستان کی باکس آفس پر چھائی رہیں۔ ماہم ایک خوب صورت اداکارہ تھی عدنان خان کی فلموں میں اُس نے کام کیا تھا بعد میں وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور پھر انہوں نے شادی کر لی شادی کے بعد ماہم نے فلموں کو خیر باد کہہ دیا اور عدنان کے ساتھ مل کر اپنا گھر بسالیا۔ ماہم نے جب فلموں کی دنیا میں قدم رکھا تھا تو اُس کی اداکاری کے بہت چرچے ہوئے پہلے عدنان خان کی فلمیں اتنی ہٹ نہیں ہوتی تھیں مگر جب ماہم اُس کی فلموں میں آتا شروع ہوئی تو عدنان خان پر دولت عاشق ہو گئی اور وہ راتوں رات شہرت کی بلند یوں کو چھوٹنے لگا تھا بعد میں عدنان کی پروڈکشن کمپنی میں ماہم کے شیراز شامل کیے گئے اور کمپنی کا نام اے۔ ایم انٹرٹینمنٹ رکھا گیا۔ یہ حادثہ عدنان کے لئے بہت بڑا حادثہ ثابت ہوا وہ کافی دیر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اشاف کے کچھ لوگ اور ہوٹل کا مالک جو کہ عدنان کا پرانا دوست بھی تھا وہ بھی اُس کے پاس بیٹھا اُسے حوصلہ دے رہا تھا۔ کچھ ہی گھنٹوں میں عدنان کے بچے پہنچ گئے شعیب خان جو کہ اب پچیس سال کا ہو چکا تھا اور کچھ ہی مہینوں میں وہ بھی فلموں میں آنے والا تھا۔ سارے بچے آتے ہی اپنے باپ کے ساتھ لگ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے بچوں کو اپنی ماں کے پھڑ جانے کا غم اُن کے چہروں سے نظر

عدنان ہاتھ میں شاپر پکڑنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا اور ماہم ماہم پکارا اندر آیا تو ماہم بسترے پر لیٹی ہوئی تھی۔ عدنان نے اسے بہت آوازیں دیں مگر ماہم نے جواب نہ دیا عدنان نے بار بار اٹھانے کی کوشش کی اسے ہلایا مگر اُس نے کوئی حرکت نہیں کی عدنان کو کسی بات کا شک ہو تو اُس نے ہاتھ پکڑ کر نبض چیک کی تو وہ مر چکی تھی عدنان نے چیخا شروع کر دیا۔

”ماہم..... ماہم.....“ اس کی آواز سن کر اشاف اٹھا ہونا شروع ہو گیا کچھ ہی دیر میں سارا اشاف اٹھا ہو گیا اور دوسرے کمرے میں جو لوگ رہ رہے تھے وہ بھی اُس کمرے کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے پورے ہوٹل میں یہ بات پھیل گئی کہ اداکارہ ماہم دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی۔ ایسپولیس اور پولیس والے اکٹھے پہنچے اور ڈاکٹر کو بھی ہوٹل میں بلا لیا گیا یہ پولیس کیس تھا اس لئے باڈی کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا کہ ہارٹ ایفیک ہے انوسٹی گیشن ٹیم نے پورے کمرے کا جائزہ لیتا شروع کر دیا اور فکر پر نبض لیتا شروع کر دیے عدنان خان نے انکار کیا مگر انسپکٹر محمود نے کہا۔

”یہ پولیس کیس ہے عدنان صاحب ہم اس طرح جانے نہیں دے سکتے ہم پہلے پوری تسلی کریں گے اگر ضرورت پڑی تو آپ کی بیوی کا پوسٹ مارٹم بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔“ انسپکٹر محمود کی بات سن کر عدنان خاموش ہو گیا۔ کچھ گھنٹوں میں میڈیا جھنڈو پر اداکارہ ماہم کی موت کی خبر چلنا شروع ہو گئی اور پورے پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح یہ بات پھیل گئی۔



کچھ دیر بعد عدنان اپنے بچوں کے ساتھ پولیس والوں کی ہدایت پر چلے گئے۔ عدنان اپنے بچوں کو لے کر اداکارہ ثناء نعیم کے گھر چلا گیا جو کہ اُس کی اور ماہم کی بہت اچھی دوست تھی اور اِس فلم میں اُس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ انسپکٹر محمود کو ماہم کی موت پر شک تھا اِس لئے عدنان کا بیان ریکارڈ کر لیا گیا جو کہ کچھ یوں تھا۔

”ہم نے دو پہر دو بجے مری ٹونگ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں اکثر صبح ماہم سے پہلے اٹھ جاتا تھا ماہم دیر سے اُٹھتی تھی میں نے صبح اٹھ کر ماہم کو ٹنگ نہ کیا اور سگریٹ خریدنے کے لئے بازار چلا گیا اُس وقت کوئی دس بجے تھے۔ میں نے مارکیٹ سے سگریٹ جوس اور سینڈویچ خریدے اور ماہم کریم رول بہت شوق سے کھاتی تھی اُس کے لئے کریم رول بھی خریدے اور ساڑھے دس بجے کے قریب جب میں ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو ماہم سو رہی تھی میں نے اُسے اٹھانا چاہا مگر وہ نہیں اُٹھی میں اُدھا گھٹنہ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور ایسا لگا جیسے وہ بہت گہری نیند میں ہے میں نے اُسے بلایا جب اُس کا ہاتھ پکڑا تو اُس کا ہنسنے کا اظہار ہوا چکا تھا مجھے عجیب سا محسوس ہوا میں سمجھا شاید بخار ہوگا تو میں نے اُس کی نبض چیک کی تو وہ مر چکی تھی مجھے خوف آیا اور میں نے سب کو اطلاع دی باقی ماجرا آپ کے سامنے ہے“ عدنان اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کئی بار رویا۔ انسپکٹر محمود سارا ریکارڈ سن رہا تھا ریکارڈ سننے کے بعد اُس نے کیس فائل چیک کی سامنے سب انسپکٹر حزرہ بیٹھا تھا۔

آ رہا تھا اور سارے یہ دیکھ کر بہت افسردہ ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر محمود نے موقع پا کر عدنان کے پاس آیا اور بولا۔

”عدنان صاحب ہماری ٹیم نے سارے معاملے کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی بیوی کا پوسٹ مارٹم کیا جائے کیونکہ ہمیں شک ہے کہ آپ کی بیوی ہارٹ ایکٹ سے نہیں مری۔“

عدنان اور بچوں نے سنا تو اُن کے آنسو جہاں تھے وہی رک گئے اور آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں اور وہ انسپکٹر کا چہرہ دیکھتے رہے۔

”کیا مطلب انسپکٹر صاحب آپ کہہ رہے ہیں میری بیوی کو کسی نے مارا ہے۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ پھر رونے شروع ہو گیا اُس کا رونا دیکھ کر بچے بھی نہ رہ پاتے۔ ”دیکھیے ہم ابھی کچھ کہنا نہیں چاہتے میں نے جتنا کہنا تھا کہہ دیا اور ہاں آپ کا بیان بھی ریکارڈ ہوگا کیونکہ آپ ہی وہ واحد شخص ہیں جو اُن کے ساتھ تھے تو پلیز۔“ انسپکٹر محمود نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ بچوں نے احتجاج کرنا چاہا مگر محمود اُن کی ٹیم پوسٹ مارٹم کرنا چاہتی تھی۔ عدنان اپنے بچوں کی شکل سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شعیب بولا۔

”ڈیڈی فکر نہ کرئے ہمیں آپ پر پورا یقین ہے۔“ ”جی ڈیڈی ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ جنید نے کہا۔ آصفہ جو کہ ابھی سب سے چھوٹی تھی روتی ہوئی عدنان کے ساتھ لگ گئی۔ عدنان کو اپنے بچوں کا چہرہ دیکھ کر حوصلہ آیا۔

”سر رپورٹ سے پتہ چلا ہے اداکارہ ماہم کوئی بارہ گھنٹے سے زیادہ سوئی رہی ہے اُن کی آنکھوں میں علامات پائی گئی ہے جو کہ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انہوں نے زیادہ نیند لی ہے۔“ سب انسپکٹر حزمہ نے کہا۔

”مگر حزمہ اتنی بات کافی نہیں ہے کوئی اور ثبوت ملا ہے کمرے سے؟ کسی قسم کی نیند کی گولیاں یا کچھ بھی۔“ انسپکٹر محمود نے فائل کو سائیڈ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ماہم جس سائیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اُس کی سائیڈ ٹیبل پر چائے کے کپ کا نشان ہے اور ماہم کے کپڑوں پر بھی چائے کا ایک نشان ملا ہے۔“ سب انسپکٹر حزمہ نے کہا۔

”تو سائیڈ ٹیبل سے عدنان اور ماہم کے ہاتھوں کے فنگر پرنٹس ملے۔“

”جی ماہم اور عدنان کے فنگر پرنٹ پورے کمرے سے مختلف جگہوں سے ملے ہیں۔“ حزمہ نے جواب دیا۔

”رپورٹ کب تک آجائے گی؟“ انسپکٹر محمود نے کان کھجاتے ہوئے پوچھا۔

”کل شام تک۔“

”کل جیسے ہی رپورٹ آتی ہے مجھے بتانا اب تم جا سکتے ہو۔“ محمود نے کہا اور ٹیلیفون اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگ گیا۔ سب انسپکٹر نے سیلوٹ مارا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اگلی شام رپورٹ آئی محمود نے رپورٹ دیکھی اور حیران کن لگا ہوں سے دیکھتا رہا اور بڑبڑانے لگا۔

”محبت شدت کی ہو تو چاند تو ڈالا یا نفرت ہوئی تو چاند پر ہی پہنچا دیا۔“ اُس نے فائل سائیڈ پر رکھی اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شامِ نعیم کا گھر خوبصورتی میں مثال تھا۔ شام اور عدنان باہر باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی عدنان سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور شام بیٹھی عدنان کو دیکھ رہی تھی اُس کے بال اکثر ہوا سے اڑ کر اُس کے منہ پر آ جاتے تھے۔

”اسلام آباد کی فضا میں بہت سکون محسوس کرتا تھا مگر اس دفعہ اس نے میرا سکون ہی جھین لیا۔“ عدنان نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو عدنان یہ غم چھوٹا نہیں ہے میں جانتی ہوں مگر میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں تمہیں حوصلہ رکھنا ہوگا اپنے

لئے اور اپنے بچوں کے لئے ماہم کے بچوں کے لئے اور تم جانتے ہو وہ میری بھی بہت اچھی دوست تھی۔“ شام نے بالوں کو سائیڈ پر کرتے ہوئے کہا۔ رات میں شام کا چہرہ پر کشش لگ رہا تھا وہ ملک کی خوب صورت اور مشہور ترین اداکارہ تھی اور اِس وقت اُس کا تیرہ چہرہ لگ رہا تھا اُس کے گھر کے باہر پروڈیوسرز کی لائن لگی رہتی تھی مگر وہ پچھلی تین لگا تار عدنان کی فلمیں کر رہی تھی عدنان اُس کا چہرہ دیکھتا تو دیکھتا ہی رہتا۔

”مجھے اِس وقت تم جیسے دوست کی ضرورت ہے شام تم جیسا دوست ہی میرے غم اور میری تنہائی کو ختم کر سکتا ہے۔“ عدنان نے کہتے کہتے شام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شام ایک دم پریشان ہو گئی مگر اُسے برائیاں لگ رہا تھا ایک تو عدنان کے غم کو وہ سمجھ سکتی تھی اور عدنان کی پرستش سے متاثر بھی تھی عدنان ڈھلتی عمر کے ساتھ بھی کشش رکھتا تھا۔ اچانک ڈرائیور بھاگا بھاگا آیا۔

”شام میم..... شام میم.....“ ڈرائیور نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیا ہوا بشیر آرام سے بولو۔“ شام نے کہا۔ عدنان بھی سیدھا ہو گیا اور اُس نے سگریٹ بجھا دی۔

”باہر پولیس آئی ہے اور عدنان صاحب کا پوچھ رہی ہے۔“ بشیر نے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا شام تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گئی اور عدنان کا چہرہ دیکھنے لگی مگر عدنان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”نہیں تو پتہ ہے ہماری کوئی پرسنل زندگی نہیں ہوتی ہم سانس بھی لے تو وہ بھی نیوز بن جاتی ہے۔“ عدنان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عدنان کی مسکراہٹ دیکھ کر شام کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ عدنان اور شام اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیے جب باہر پہنچے تو انسپکٹر محمود اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور بالکونی میں شعیب کھڑا تھا اُس نے دیکھا تو وہ فوراً بھاگ کر نیچے پہنچا۔

”عدنان صاحب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ انسپکٹر محمود نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ عدنان پہلے تو پریشان نہ تھا مگر اب اُس کے چہرے کی رنگت تھوڑی سی بدلی گئی۔

”کیوں انسپکٹر صاحب خیریت تو ہے۔“ عدنان نے پوچھا۔

”یہ تو آپ کو تھانے چل کر پتہ چلے گا۔“ انیسٹر محمود نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ شعیب نے سنا تو وہ پریشان ہو گیا۔

”مگر آپ ڈیڑی کو کیوں لے جا رہے ہیں بھی ساتھ چلو گا آپ ایسا نہیں کر سکتے میں ڈیڑی کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔“ شعیب جذباتی ہو کر بولے جا رہا تھا شعیب کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ثناء بھی پریشان ہوئی۔

”دیکھو بچے زیادہ جو شیے ہونے کی ضرورت نہیں ہیں ایسے شواہد لے جس سے پتہ چلا ہے اداکارہ ماہم جو کہ رشتے میں آپ کی والدہ لگتی تھی اُن کی موت طبی نہیں تھی انہیں قتل کیا گیا ہے۔“ انیسٹر کی بات سن کر ثناء اور شعیب کا رنگ بدل گیا اور عدنان سکتے کی حالت میں کھڑا انیسٹر کو دیکھ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آیا وہ کیا کرے۔ عدنان نے شعیب کو دیکھا اور بولا۔

”مگر مت کرو پتا میں ابھی واپس آ جاؤں گا تم اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھو۔“ عدنان یہ کہہ کر پولیس والوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

عدنان کو ایک کمرے میں لے جایا گیا کمرہ چاروں اطراف سے عجیب سا لگ رہا تھا اس کمرے میں دو کرسیاں اور ایک میز تھی اور ایک عدد چٹکا اور ٹیبل لائٹ لگی ہوئی تھی۔ کاشیمل نے عدنان کو ایک کرسی پر بٹھایا اور ایک سائیز پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں انیسٹر محسوس کرے میں ایک فائل پڑے ہوئے داخل ہوا اور اُس نے زور سے فائل کھلی پریشانی اور کڑی پریشانی کیا۔

”عدنان صاحب سگریٹ نہیں سمجھے؟“ انیسٹر نے پکٹ آگے کرتے ہوئے پوچھا۔ عدنان کبھی بالوں سے گرتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف کر رہا تھا کبھی گردن سے۔

”نہیں۔“ عدنان نے کہا۔

”لے لیجئے عدنان صاحب کھاتے بیٹے رہیں گے تو وقت اچھا گزرے گا کیونکہ ہو سکتا ہے ٹھنڈی ہو جائے۔“ انیسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کیوں لے کر آئے ہیں ایک تو پہلے ہی میں اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان ہوں اوپر سے ادھر لے آئے ہیں آپ نے جو تفتیش کرنی ہے کچھ میں بہت تھکا ہوا ہوں

چلیز۔“ عدنان ہاتھ ملتے ہوئے بولا مگر انیسٹر پر سکون انداز میں بیٹھا عدنان کے چہرے کے بدلتے زاویے دیکھ رہا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا انیسٹر کی آنکھیں عدنان کو تنگ کر رہی تھی جو کہ اُس پر سے ہٹ نہیں رہی تھی۔

”عدنان صاحب میرے بیوی بچے بھی روز گھر میرا انتظار کرتے ہیں مگر میں روز رات کو نہیں مل پاتا اور وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتے ہیں اور میں ادھر آپ کے پاس اس ناٹم شوق سے نہیں بیٹھا روز میڈیا والے باہر جھج بٹا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور عجیب و غریب سوال کرتے ہیں ہم سے اور پھر ان پر رات رات تک تبصرے کرتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں مجھے فارغ کریں آپ کو ہم مذاق ملتے ہیں۔“ انیسٹر کا دوسرا ایک دم بدل گیا اور عدنان کی پٹلیں تیزی سے جھٹکنے لگیں لاو وہ خاموشی سے فیک لگا کر بیٹھ گیا پاس کھڑا کاشیمل مسکراتے لگا۔

”آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟“ عدنان نے شائستگی سے پوچھا۔

”آپ سے باتیں کرنی ہے کافی ناٹج لی جیتی ہے آپ سے۔“ انیسٹر نے سگریٹ جلائی اور تیزی سے کش لگا کر دھواں ہواش اڑایا۔

”کبھی ناٹج۔“ عدنان نے پوچھا۔

”کبھی کہ قلم کیسے بنتی ہے کتا پیر لکنا ہے کیونکہ آپ لوگ تو فلمیں بنا بھی سکتے ہے اور فلم بن بھی سکتے ہے۔“ انیسٹر نے سوچوں پر اٹھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ عدنان نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا انیسٹر کا حراج بدل رہا ہے۔ انیسٹر نے فائل کھولی کچھ پڑھا اور پھر پوچھا۔

”آپ صبح اٹھ کر اپنی بیوی کو اکیلا چھوڑ کر باہر کیوں سمجھے تھے۔“ انیسٹر نے سگریٹ کا کش لگایا اور پھر کاشیمل کے ساتھ دبا کر سگریٹ بجھا دیا اب سوال جواب کا وقت شروع ہو گیا تھا۔

”میں نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ کچھ کھانے بننے کے لئے گیا تھا ماہم کو سینڈویچ پسند تھے اُس کے لئے لیئے گیا تھا۔“ عدنان نے دونوں ہاتھ کاشیمل پر رکھتے ہوئے تھے۔

”تو سب چیزیں آپ نے ایک ایک کیوں لی دو کیوں نہیں لیں آپ کے شاپر سے ہمیں ایک ایک جوس کی بوتل ایک

سینڈ ویج اور ایک کریم رول ملا جو ٹیبل پر بڑا ہوا تھا جبکہ آپ دو تھے۔“ انپکٹر نے سوال کیا اور خاموش ہو گیا۔ عدنان نے اپنے چہرے کے ایک پیریشن بدلے بغیر کہا۔

”تو؟ ایک کریم رول میں نے کھالیا تھا اور اس سے کیا ثابت ہوتا ہے اور میں باہر سے کھا آیا تھا۔“ عدنان نے کہا اُس کے بعد اُس کا چہرہ مطمئن ہو گیا جیسے اُس نے پتے پر پتہ پھینکا ہو۔

”رات کو کیا ہوا تھا کہیں آپ کی لڑائی تو نہیں ہوئی تھی اپنی بیوی کے ساتھ آخر میاں بیوی کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہوتا اس رشتے میں جھگڑا اور خرچہ بلا وجہ ہی آ جاتا ہے۔“ انپکٹر نے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

”نہیں رات کو ہم دونوں باہر کھونے گئے تھے اور شام کو بھی ہم نے بلالیا تھا ہم تینوں کی دوستی بہت جتنی تھی رات کو اکٹھے ہوئے سے کھانا کھایا اگلے دن کی پلاننگ کی اور واپس ہوئے میں آ گئے۔“ عدنان ساری بات کہہ ڈالی۔

”آپ اتنی بڑی پروڈکشن کمپنی کے مالک ہیں آپ کسی کے گھر بھی رک سکتے تھے آپ جیسے لوگوں کے تو تعلقات ہی بہت ہوتے ہیں۔“ انپکٹر سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔

”میں نے ماہم سے کہا تھا مگر وہ نہیں مانی تھی وہ کسی کا احسان لینے والی عورت نہیں تھی۔“ عدنان نے آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتے تھے۔“ انپکٹر نے سگریٹ کا ٹکڑا لگاتے ہوئے کہا۔

”بہت زندگی کے چھپیس سال اکٹھے گزارے تھے کبھی ایک دوسرے پر شک نہیں کیا ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے آپ خود ہی اندازہ کر لے رشتہ کپا نہیں تھا۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”دیکھ عدنان صاحب پاتال کی گہرائی وہی جانتا ہے جس نے اُس میں چھلانگ لگائی ہو اور محبت کی سچائی بھی وہی جانتا ہے جس نے محبت کی ہویہم نے تو محبت کو بس اتنا ہی سمجھا ہے کہ جس سے محبت کرو اُس کے بارے میں برا نہیں سوچو۔“ انپکٹر کا مزاج بے ذائقہ ہو رہا تھا۔ اُس نے سگریٹ بجھایا یا ٹشیل کو کہا۔

”پروڈیوسر صاحب کو چائے پلاؤ میں آتا ہوں۔“

انپکٹر کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ عدنان اُدھر ہی ٹپک لگائے بیٹھ گیا اور کئی سانس اندر کی طرف کھینچی اور لائٹ کی طرف دیکھنے لگ گیا اور لائٹ کو دیکھ کر اُس کو ایک واقعہ تک کرنے لگا۔

سامنے آتی ہوئی گاڑی کی لائٹ عدنان کی آنکھوں کو تک کر رہی تھی عدنان نے کہا۔

”اُف یہ لوگ اتنی تیز روشنی کیوں جلاتے ہیں۔“ عدنان ڈرائیوگر ہاتھ اور ساتھ ماہم بیٹھی اُس گلاب کے پھول کے ساتھ کھیل رہی تھی جو ابھی عدنان نے پچھلے اشارے پر لے کر دیا تھا۔

”میں تمہیں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی عدنان۔“ ماہم نے کہا۔

”اچھا وہ کیوں؟“ عدنان نے ہونٹوں کو دانتوں میں دبایا۔

”میں نے تمہیں مردوں کی دنیا سے بہت مشکل سے چننا ہے اور تمہاری خاطر میں نے اپنی پہلی محبت کو خیر باد کہا ہے۔“ ماہم ایک ہاتھ سے پھول کو تھما رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھی وہ اس وقت بہت پیاری لگ رہی تھی رستے میں کسی بھی لائٹ کی روشنی پڑتی تھی تو اُس کا چہرہ عدنان کی نظروں کو سکون دیتا تھا۔

”پہلی محبت؟“ عدنان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اداکاری جس کے لئے میں پیدا ہوئی تھی میں نے تمہارے لئے چھوڑ دی۔“ ماہم نے بچوں والا چہرہ بناتے ہوئے کہا عدنان کی اچانک ہنسی نکل گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ماہم نے کہا۔

”تم میرے لئے اپنی کوئی قیمتی چیز چھوڑ سکتے ہو۔“ ماہم سے سوال کیا۔

”نہیں۔“ عدنان نے اچانک اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ ماہم کو اپنی بے عزتی سی محسوس ہوئی پھر عدنان قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔

”کام اُن ماہم پریشان کیوں ہو گئی ہو ہم ادھر کوئی فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں کیا۔“ ماہم بس اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ایک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور انپکٹر کمرے میں داخل ہوا اور ساتھ ہی عدنان اُس لمبے سے باہر آ گیا جو کہ

کچھ سال پہلے کا تھا۔

”آپ نے چائے نہیں پی۔“ انسپٹر نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”جی نہیں میرا موڈ نہیں۔“ عدنان نے کہا۔ انسپٹر کے لئے بھی چائے آگئی اس نے اپنے کپ میں دو چمچ چینی کے ڈالے اور چمچ کھمانے لگ گیا۔

”آپ کو اپنی بیوی کی موت کا گیارہ بجے کے قریب پتہ چلا تھا تو آپ نے پولیس والوں کو دو کھنٹے بعد اطلاع کیوں دی اور وہ بھی ہول کے اسٹاف سے جبکہ پتہ چلا ہے کہ آپ انفارم کرنے کے حق میں نہیں تھے کیوں؟“ انسپٹر نے سوال کے بعد چائے کی چمکی لی اور عدنان کی شکل دیکھنے لگ گیا۔

”کیونکہ میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ عدنان نے کہا اور سر نیچے کر لیا۔

”ضروری نہیں سمجھا یا آپ پولیس کو بیچ میں لانا ہی نہیں چاہتے تھے۔“ اس دفعہ انسپٹر کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں انسپٹر صاحب میں آپ سے کیوں بھاگوں گا آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کا قاتل ہوں۔“ عدنان ایک دم غصے میں آ گیا اس کے ماتھے پر ہل آگئے۔ انسپٹر نے عدنان کے بدلتے رویے کو دیکھا تو اس نے بھی آواز کو ادھار کر لیا۔

”آپ کی حرکتیں شک کے دائرے میں تھیں رسی ہیں پورے کمرے میں صرف دو لوگوں کے فنگر پرنٹس ملے ہیں آپ کے اور آپ کی بیوی کے یا اگر کوئی فنگر پرنٹ ملا تو ہول کے اس شخص کا جو کمرے کی صفائی کے لئے آتا تھا اس سے ہم نے تفتیش کر لی ہے اور پوری سلی کے ساتھ بیجا ہے۔“ انسپٹر اٹھا اور اپنی کرسی پر رکھ کر دھوکھونے لگ گیا پھر اس نے دونوں ہاتھ اپنی کرسی پر رکھے اور غور سے عدنان کا چہرہ دیکھنے لگ گیا۔ عدنان اب بھی خاموش بیٹھا تھا کیونکہ اب اس کو پتہ چل گیا تھا کہ انسپٹر اس کے جواب کا رد عمل غصے سے دے گا۔

”عدنان صاحب پانی جتنا بھی گندا ہوا آگ بجھا دیتا ہے مگر خون گندا ہو جائے تو آگ لگا دیتا ہے۔ چور جتنا مرضی بچ لے اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے اور ہم اس چھوٹے سے نشان کو ڈھونڈنے کے لئے دن رات ایک کرتے ہیں

اور جب وہ نشان مل جائے تو اس نشان کی کالک کو بھرم کے منہ پر مل دیتے ہیں۔“ انسپٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں عدنان کو دکھائیں۔

”مگر آپ اس ملک کے معزز لوگوں میں شامل ہیں اس لئے ادب سے پوچھ رہا ہوں ورنہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں اور بارہ بجے سکھوں کا ٹائم شروع ہو جائے گا اور ہم پولیس والے اگر رات کو وقت پر نہ سویں تو تھکاوٹ اور طریقے سے اترتی ہے۔“

انسپٹر نے ساری بات کر دی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ عدنان کو سمجھ نہ آئے وہ کیا کرے وہ اپنی بے گناہی کو کس طرح ثابت کرے۔

”آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں انسپٹر صاحب میں بے گناہ ہوں۔“ عدنان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو دس منٹ دیتا ہوں اور دس منٹ بعد آپ خود بتائیں گے ورنہ میں آپ سے تو برا جاؤں گا۔“ انسپٹر کہہ کر باہر چلا گیا اور پیچھے پیچھے کا نشیلا بھی باہر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ عدنان نے اپنا سر نیچل کر رکھ دیا اور پریشانی کی حالت میں سوچنے لگ گیا اس کو سمجھ نہ آئے وہ کیا کرے وہ ایسے مسئلے میں الجھن میں گیا تھا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ تو ایک نرم دل انسان تھا۔

”ماہم مجھے معاف کر دو پلیز۔“ عدنان کے منہ سے بے اختیار الفاظ نکلے اور ایک دم ہنسنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی اس نے منہ اٹھا کر دیکھا تو ماہم خوب صورت کپڑوں میں ملبوس کھڑی تھی جیسے کبھی وہ شوٹنگ کے لئے جایا کرتی تھی۔ عدنان اس کو بے یقینی کی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

”ماہم تم۔“ عدنان نے کہا مگر ماہم ہنسے جا رہی تھی۔

”تم کیا سمجھتے میرے بعد تم عیاشی کرو گے باہر تمہارے لیے عورتیں لائن لگا کر کھڑی ہوں گی اپنا چہرہ دیکھو عدنان تم بوڑھے ہو چکے ہو جس دن میں مری تھی اس دن تم بھی مر گئے تھے یہ پروڈکشن کمپنی جس پر تمہیں بہت غور ہے وہ تمہارے اکیلے کی نہیں تھی اس میں میرا بھی حصہ تھا میرا بھی نصیب تھا میں مر گئی تو کیا ہوا تم بھی کون سا زندہ رہو گے سب ختم ہو جائے گا یو آر فینش عدنان یو آر فینش۔“ ماہم اس کے سامنے زور زور سے تھپتھپا رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دو ماہم مجھے معاف کر دو پلیز پلیز.....“ عدنان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک دم مایم غائب ہو گئی عدنان کو افسوس ہو رہا تھا عدنان کا خیال زندہ شکل میں اس کے سامنے تھا۔ انپکٹر محمود سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور ساتھ ہی انپکٹر نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور سگریٹ ایک طرف پھینک دی کاٹشیل بھی ساتھ اندر آ گیا پچھلے دو گفتگوں میں انپکٹر نے تقریباً ایک پکٹ پی لیا تھا۔
انپکٹر نے پیٹھے ہوئے کہا۔

”جی عدنان صاحب آپ نے بتایا تھا کہ آپ رات کو باہر گھومنے گئے تھے اور آپ نے باہر سے کھانا کھایا تھا تو ہوٹل آکر آپ دونوں نے کچھ پیا مطلب کوئی ڈرنک شریک لی ہوگی آپ کے شعبے کے لوگوں میں تو یہ عام ہوتا ہے۔“
انپکٹر نے کہا۔

”نہیں ہم دونوں شراب نہیں پیتے تھے۔“ عدنان نے سنجیدگی سے کہا مگر اس دفعہ عدنان کی زبان تھوڑی سی اٹکی تھی۔

”آپ کی پٹی کے پٹروں سے چائے کاواں ملا ہے اور ان کی سائڈ ٹیبل سے چائے کے کپ کا نشان جو عموماً لگ جاتا ہے ہم نے ہوٹل والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ رات کو آپ نے چائے کی جگہ چائے کے خالی کپ منگوائے تھے۔“ انپکٹر نے اپنی سیدھی کتنی ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی اور دو انگلیاں سیدھے گال پر رکھے ہوئے تھا۔ عدنان اب تھوڑا سا پریشان ہو رہا تھا۔

”جی وہ ہم باہر سے..... چائے..... نہیں پیتے.....“ عدنان خاموش ہو گیا اس کو سمجھ نہ آئی وہ کیا کرے۔ عدنان کے بدلے رنگ کو انپکٹر بخوبی دیکھ رہا تھا۔

”بازار کی چائے نہیں پیتے کیا کہنا چاہتے ہو تم۔“ انپکٹر محمود کی آواز ایک دم بدل گئی اور لہجہ سخت ہو گیا اور وہ آپ سے تم پر آ گیا جس سے عدنان کو پسینہ چھوٹنے لگ گیا کاٹشیل جو کہ پاس کھڑا تھا وہ بھی بہت غور سے دیکھ رہا تھا عدنان کو۔ عدنان سمجھ رہا تھا کہ پولیس والوں نے ساری تقشیر کر لی ہے اور اب ان سے بچنا بہت مشکل ہوگا۔

”یہ کاٹشیل جس کے ہاتھ کا وزن تمہارے جسم سے بھی زیادہ ہے یہ میرے ایک اشارے پر تمہارے منہ کا

حلیہ بگاڑ سکتا ہے تو بہتر ہی ہو گا جتنی خود ہی بتا دو ورنہ میں نے سچ بتایا تو اچھا نہ ہوگا۔“ انپکٹر نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بناتے ہوئے کہا۔ عدنان اب سمجھ گیا کہ وہ نہیں بچ سکتا اس نے ایک نگاہ کاٹشیل پر ڈالی اور کہا۔
”اے آپ باہر بیچ دیں پہلے۔“ انپکٹر نے اشارہ کیا اور وہ باہر چلا گیا۔ انپکٹر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا اور عدنان کا چہرہ ٹک کی باندھ دیکھنے لگ گیا۔

”میرا اور ماہم کی زندگی کا ساتھ چھبیس سال کا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے میں نے کبھی اس سے بے فضول جھگڑا کیا اور نہ ہی اس نے وہ بہت خوبصورت تھی اس سے شادی میں نے ہی کرنی چاہی تھی۔ اے ایم پر وکشن کپنی ہم دونوں نے مل کر ہی شروع کی تھی اس لیے عرصے ہم نے اس کپنی پر بہت محنت کی تھی اور بہت پیسہ کمایا اس عرصے میں ہمیں تین پیارے بچے بھی ملے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ میں نے اس پر کبھی شک نہیں کیا کیونکہ وہ مجھ سے جتنی محبت کرتی تھی اس کا مجھے بھی اعزاز تھا مگر اے جی مجھ پر شک نہیں تھا مگر اس کو مجھ پر بھی نہیں تھا وہ اکثر کبھی بھی مرو کے پاس پیسہ ہوتا تو اس کے پاس مبر نہیں رہتا اور وہ اپنی واریت ختم کرنے کے لئے کھلا پیسہ لگا سکتا ہے۔“ عدنان نے سگراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”وہ مجھ پر حیلے بہانے سے شک کرتی رہی میری پرستش کچھ ایسی ہی ہے جس کا مجھے بھی پتہ ہے اور اس کو بھی پتہ تھا پھر میری زندگی میں ثناء آئی ثناء نے کافی کم عرصے میں قلمی دنیا میں نام کمایا ہے پہلے ہی بہت سی مگر میری قلم میں کام کرنے کے بعد ہماری کپنی کو بھی کافی فائدہ ہوا پھر اس نے دو قلمیں سائن کروالی دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری بہت قریبی دوست بن گئی میری اور اس کی بہت دوستی تھی اور ثناء بھی مجھ کو بہت پسند کرتی تھی مگر ماہم کو یہ بات پسند نہ تھی اور اس کو خدشہ تھا کہ کہیں میں اس کے ساتھ انہیں نہ چلا رہا ہوں پچھلے کچھ عرصے سے وہ چڑچڑی اور لڑاکی ہو گئی تھی اور مجھے ثناء سے پیار ہو گیا تھا جب بھی ثناء کو دیکھتا تھا میرے بوڑھے جسم میں جوانی کی لہر دوڑ پڑتی تھی میں نہ چاہتے ہوئے بھی ثناء کو دیکھنے اور ملنے کے لئے بے قرار رہتا تھا ایک دن ثناء..... مجھ سے کہنے لگی۔“ عدنان منہ نیچے

بھانپیاں آنے لگ گئی اُس نے ہل میں سر ہلایا اور لیٹ گئی۔

”مجھے بہت نیند آ رہی ہے کل بات کریں گے۔“ ماہم نے سائیڈ بڈل لی۔

”میں ساری رات جاگتا رہا صبح چھ بجے کے قریب میں نے ماہم کو اٹھایا مگر وہ بے سہجہ سو رہی تھی صبح نو بجے وہ اس دنیا میں نہیں تھی۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہو رہی تھی انسپکٹر محمود سارا واقعہ خاموشی سے اور وحیان سے سن رہا تھا۔

”تم نے جائے میں نشہ کیا ملایا تھا اور کس طرح ملایا تھا؟“ انسپکٹر نے موٹھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا اور اس سوال کو کرنے کے لئے انسپکٹر بہت بے چین بھی تھا۔

”لاہور میں ٹی بیگ کے اندر میں بہت سی نیند کی گولیوں کا پاؤڈر چس کر اُس میں ڈال دیا تھا اور اُس کو ڈبے میں الگ سے رکھ دیا تھا اور موقع پا کر اُس ٹی بیگ کو استعمال کیا۔“ عدنان بات کرتے کرتے رونے لگ گیا۔

”ماہم بہت اچھی عورت تھی ماہم جیسی بیوی نصیبی والوں کو ملتی ہے اُس نے اپنی زندگی میرے لئے وقف کر دی تھی۔“ عدنان زور زور سے رونا شروع ہو گیا۔

”بھروسے باہمی کہتے تھے جن کا آپ کا خیال دیکھتے ہو وہ آپ کا خیال نہیں رکھتے ماہم نے جو تمہارے لئے کیا وہ تم نے اپنا حق سمجھا محض ادا کرنے سے قاصر تھے خیر۔“ انسپکٹر نے اپنا عیدہ ہلاتا ہوا اٹھاتے ہوئے اپنا موبائل دکھایا جس میں عدنان کی بھاری گفتگو ریکارڈ تھی۔ موبائل پر بچ کرتے ہوئے انسپکٹر محمود نے کہا۔

”بروڈیوسر صاحب وکیل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ کل آپ گھر نہیں عدالت جا رہے ہیں۔“ انسپکٹر اٹھا اور باہر جاتے ہوئے بولا۔

”محبت کرنے والوں کی قدر کی جائے تو اُن کے جانے کا غم ہوتا ہے اگر اُن کی قدر نہ کی جائے تو اپنی زندگی پر افسوس ہوتا ہے اب تم ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے زندہ رہنے کا افسوس کرنا۔“ انسپکٹر کہتا ہوا باہر چلا گیا اور کمرے کا دروازہ دھڑام سے بند ہو گیا۔

کیے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

ہم ایک پارٹی میں ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے تھے اور میرے ہاتھ میں چوس تھا اور ثناء اپنے ہاتھوں کی انگلی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ”کاش اُس دور میں اداکارہ ہوتی تو میں آپ کو ماہم کے ہاتھ نہ لگنے دیتی۔“ ثناء نے اپنے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

”تو ابھی بھی کون سی دیر ہوئی ہے۔“ میں نے کہا کہ ایک چھوٹی سی مسکراہٹ دی۔ ثناء نے فہم لگایا۔

”اس دن سے اُس کو پانے کی خواہش میرے اندر زور پکڑ گئی۔ ماہم کو ہم دونوں کے ملنے سے غصہ آتا تھا وہ اکثر ثناء کو الٹا سیدھا کہہ دیتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ثناء یہ فلم نہ کرے مگر پیسہ بہت لگ چکا تھا اور فلم آدمی بن بھی چکی تھی میرے اندر اسے پانے کے لئے شیطان دھاڑیں مار رہا تھا نفس کی آگ نے صبر کے درخت کو جلا کر رکھ دیا تھا میں نے اُس کے ساتھ اسلام آباد ایک سیٹینار میں آنا تھا اور رات کو ثناء کے ساتھ گھومنے کا پروگرام بنایا جب فارغ ہو کر واپس آئے میں نے چائے پینے کی طلب ظاہر کی کیونکہ ہم روز رات کو چائے پیتے تھے اور وہ بھی خود بنا کر ماہم باہر سے چائے نہیں پیتی تھی اس لئے ہم نے بیگ میں ٹی بیگز رکھے ہوئے تھے اُس رات میں نے ماہم سے کہا۔

”ماہم ڈارلنگ آج میں چائے بنا کر دیتا ہوں۔“ عدنان نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

”واہ آج خیر ہے رہنے دو میں بنا دیتی ہوں۔“ ماہم اپنی ہل والی جوتی اتار رہی تھی۔ عدنان نے فون کر کے خالی کپ منگوائے۔

”نہیں آج میں بناؤں گا۔“ عدنان نے اصرار کیا تو ماہم مسکرانے لگی۔ کچھ دیر بعد وینر خالی کپ دے گیا عدنان نے ٹی بیگز نکالے اور دو کپ چائے کے تیار کر دیے ماہم فریش ہو چکی تھی دونوں نے چائے پی اور خوب کپ شپ لگائی۔

”کل جلدی اٹھ کر مجھے بہت پیکنگ کرنی ہے۔“ ماہم نے چائے کا آخری سب لیا اور کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”جی جی کل تو مری کے لئے روانہ ہوتا ہے تم نے سب کو فون کر دیا تھا نا۔“ عدنان نے کہا۔ اتنے میں ماہم کو

مستقبل کے لکھاری

زین نر

عشق و محبت کی ایک ایسی داستان جو آپ نے پہلے کبھی نہیں سنی ہوگی دنیا میں گزاری جانے والی زندگی کے بارے میں ہم سب کے تصورات الگ الگ ہیں اور اس کا زیادہ دار و مدار ہمارے ان تجربات پر ہوتا ہے جو ہمیں ہماری زندگی میں حاصل ہوتے ہیں میرے کچھ دوستوں کے لیے زندگی ایک ایسی شمع کی مانند ہے جو ان کے لیے رستے میں روشنی اور حرارت فراہم کرتی ہے لیکن جب یہ شمع بجھ جاتی ہے تو آپ کے چاہنے والے آپ سے پھڑ جاتے ہیں اور آپ کو دکھ کے اتار سمندر میں اندھیروں کے درمیان چھوڑ جاتے ہیں ان کا دکھ آپ کی زندگی میں زہر گھولتا رہتا ہے لیکن آپ پھر کبھی ان سے مل نہیں سکتے ان کے جانے کے بعد بھی زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے یہی زندگی ایک ریت گھڑی کی مانند ہوتی ہے وہ وقت کی ریت کو اپنے تلوؤں تلے پھسلتا محسوس کرتے ہیں جیسے ساحل سمندر پر رقص کر رہے ہوں لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہ ریت بھی دوسری چیزوں کی طرح ان کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور پھر وہی ریت جس کے کس کو وہ اچھا محسوس کر رہے تھے انہیں منوں وزن کے نیچے دبا دیتی ہے اور ان کے چاہنے والے تنہا رہ جاتے ہیں پر زندگی کا سفر رہتا ہے۔

میتھو کے لیے یہ زندگی ایک کتاب کی مانند ہے ایک ایسی کتاب جسے روزانہ لکھا جا رہا ہے اور صرف رائٹر ہی جانتا ہے کہ وہ کیسے مکمل ہوگی اس کا انجام کیا ہوگا میتھو کے نزدیک اگر اس کتاب میں کوئی سادہ صفحہ آ جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص کسی حادثے سے دوچار ہو جاتا ہے یا شاید بیمار ہو جاتا ہے زندگی میں ایسے واقعات بھی آتے رہتے ہیں جب ہمارے سامنے سارے صفحے ہوتے ہیں اگر آپ کے ساتھ ایسا ہو تو آپ اپنے جیون ساتھی کے اس سادہ صفحے کو کیسے لکھنا چاہو گے میتھو نے تو اس صفحے کو دھڑکتے دل اور کانپتی انگلیوں کے ساتھ لکھا۔

اپنے قارئین کے لیے حیرتوں میں ڈوبی ایک کہانی جو ان کے سامنے زندگی کے نئے رازوں کو آشکار کرے گی ایسے راز جو ہماری زندگیوں میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن ہم پروا بخش نہیں دیتے اور جب ہوتے ہیں تو ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے سوائے ان کی تکلیف دہ سچائی کو قبول کرنے کے ایک ایسی ہی نہ ختم ہونے والی کہانی جس سے رائٹر پچھتا نہیں چھڑا سکتا جو اپنے آپ کو خود لکھوائی ہے۔

گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھکا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی قبرستان میں موت جیسی خاموشی کا راج تھا جس میں وقفے وقفے سے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سنائی دے رہی تھی کچھ لوگ سیاہ لباس اور سیاہ چھتریوں سے ایک نئی کھدی ہوئی قبر کے اطراف میں کھڑے تھے اور قریب ہی تابوت رکھا تھا ان سب کے درمیان میتھو میٹر بھی کھڑا تھا جس کا دیرینہ دوست جیس اس سے پھڑ گیا تھا میتھو میٹر کی عمر تقریباً 28 سال تھی وہ تیرہ اپریل 1983 کو پیدا ہوا تھا اور پیسے کے اعتبار سے ایک طبی رضا کار تھا اس کے لیے دنیا میں صرف تین لوگ ہی اہمیت رکھتے تھے اس کے والد والدہ اور اس کا دوست جیس جس کا انتقال ایک ہفتہ قبل ہوا تھا آج اس کی تدفین تھی اور میتھو سو گواران کے درمیان اداس کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا پیارا دوست کچھ ہی دیر بعد زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جائے گا اور اس کی تدفین کا یہ واقعہ میتھو کو کسی ڈراؤنے خواب کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا اور وہ اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکے گا وہ سوچ رہا تھا کہ ہم دنیا میں اکیلے آتے ہیں اور یہاں سے اکیلے واپس چلے جاتے ہیں لیکن اس دنیا میں جن کے ساتھ وقت گزارتے ہیں

گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھکا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی قبرستان میں موت جیسی خاموشی کا راج تھا جس میں وقفے وقفے سے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سنائی دے رہی تھی کچھ لوگ سیاہ لباس اور سیاہ چھتریوں سے ایک نئی کھدی ہوئی قبر کے اطراف میں کھڑے تھے اور قریب ہی تابوت رکھا تھا ان سب کے درمیان میتھو میٹر بھی کھڑا تھا جس کا دیرینہ دوست جیس اس سے پھڑ گیا تھا میتھو میٹر کی عمر تقریباً 28 سال تھی وہ تیرہ اپریل 1983 کو پیدا ہوا تھا اور پیسے کے اعتبار سے ایک طبی رضا کار تھا اس کے

انہیں تمہارا داس چھوڑ جاتے ہیں۔

ہوئے کہا۔

”گڈ اینک میٹھو“ اس کے والد نے جواب دیا جنہیں راتوں کو غائب ہو جانے کی عادت تھی اسے یاد تھا کہ جب وہ چار سال کا تھا تب سے اس کے والد ہر رات غائب ہو جایا کرتے تھے وہ خود کواٹھڑی روم میں لاک کر لیا کرتے تھے اور جب بھی وہ ان سے اس بارے میں پوچھتا تو وہ یہی کہتے کہ وہ ایک بہت اچھل کتاب لکھ رہے ہیں اور اسے وہ کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں جبکہ وہ اپنے دوسرے ناول اور کہانیاں اسے پڑھنے کے لیے ضرور دیتے تھے اور ان پر بات بھی کرتے تھے یہ کہانیاں اور ناولز کچھ ہی عرصے میں مکمل ہو جاتے تھے لیکن وہ اچھل کتاب جو اس کے والد روزانہ اسٹڈی میں بند ہو کر لکھتے تھے بیس سال سے لکھی جا رہی تھی اور آج تک مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اس کے بارے میں بات کرتا بھی پسند نہیں کرتے تھے بس وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے ”وہ صرف لکھاریوں کے مطلب کی چیز ہے“

”مجھے تمہارے دوست کی موت کا افسوس ہے وہ تمہارا اچھا دوست اور ساتھی تھا۔“ اس کے والد نے کہا۔

”ہاں اب میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں“ ممی بچپن میں چھوڑ گئی تھیں اور اب انکو تو دوست نے بھی ساتھ چھوڑ دیا لوگ ہمیں اتنا پیار دے کر چھوڑ کیوں جاتے ہیں کہ ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہوتا ہے۔“ میٹھو نے ادا سی سے کہا۔

”بیٹے یہ دنیا ہے یہاں ہمیں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے زندگی میں خوشیاں اور غم آتے رہتے ہیں جب ہم غم غم حاوی ہوتے ہیں تو ہم زندگی سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور جب خوشیاں حاوی ہوتی ہیں تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی کچھ عرصے کے لیے ہماری زندگی میں آئی ہیں کسی چیز کو بات نہیں یہ وقت بھی گزر جائے گا“ تم ابھی نوجوان ہو زندگی پڑی ہے تمہاری زندگی میں کوئی اچھا دوست ساتھی یا لائف پارٹنر ضرور آئے گا تمہاری خوشیاں لوٹ آئیں گی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈیڈ۔“ میٹھو نے جواب دیا ”لیکن آپ کو کیا پتہ کہ آئندہ میری زندگی میں کیا ہوئے والا ہے؟“

”بس میں جانتا ہوں۔“

”لیکن کیسے؟ کیا آپ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکتے ہیں؟“

قبرستان سے گھر واپس جاتے ہوئے میٹھو سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگیوں میں ہی کیوں اپنے دوستوں کی قدر نہیں کرتے ان کے مرنے کے بعد ہی کیوں سوئل میٹ ورک وال پر ان کی یاد میں پیغام لکھتے ہیں یہ پیغام ہم ان کی زندگی میں کیوں نہیں لکھتے؟ اس کی کار تیزی سے گریم اسٹریٹ پر دوڑتی جا رہی تھی وہ دن میں کئی بار اس سڑک سے گزرتا تھا کئی بار یہاں ہونے والے حادثات کے سلسلے میں اسے کالز ریسیو ہوتی تھیں اور وہ موقع سے زخموں یا مرنے والوں کو ہسپتال لے جاتا تھا وہ اس زندگی کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے دوست کی موت اس پر اتنا گہرا اثر چھوڑے گی بارہ مارچ 1911ء کا دن اس کے ذہن میں اپنے دوست کی موت کے حوالے سے چپک کر رہ گیا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں لیٹا کافی دیر تک دیواروں پر لگی تصاویر دیکھتا رہتا تھا جن میں اس کے بچپن کی تصاویر نے لے کر اس کے والدین کی شادی کی تصاویر تک شامل تھیں اس کی والدہ بھی کافی عرصہ پہلے ایک کار ایکڈنٹ میں ہلاک ہو گئی تھیں اس وقت میٹھو صرف چار سال کا تھا تب اسے احساس نہیں تھا کہ اپنے کسی پیارے کو کھو دینے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے لیکن آج اسے اپنی والدہ بہت یاد آ رہی تھیں۔ والدہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے والد اس کے زیادہ قریب آ گئے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اس کے والد نے اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا اپنی والدہ کی حادثاتی موت کے دکھ سے متاثر ہو کر اس نے اپنی زندگی حادثاتی موت کا شکار ہونے والوں کے لیے وقف کر دی تھی اور پیسے کے طور پر طبی رضا کار بننا پسند کیا تھا۔

شام کی چائے پر اس کی ملاقات اپنے والد سے ہوئی تھی وہ لوگ روم میں بیٹھے اس کا ہی انتظار کر رہے تھے انہوں نے بلوٹا ڈز کے ساتھ مہرون ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی ان کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے جیسے کئی روز سے انہیں سنوارا نہ گیا ہو۔ ایسا اکثر ہوتا تھا وہ ایک اعلیٰ پائے کے رائٹر تھے اور بہت اعلیٰ معیار کی کتابیں لکھتے تھے۔

”گڈ اینک ڈیڈ۔“ میٹھو نے کمرے میں داخل ہوتے

”نہیں میں پیش گوئی تو نہیں کر سکتا لیکن میں اسے لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔“ اس کے ڈیڑی نے جواب دیا اور وہ انہیں حرمت اور بے یقینی سے دیکھنے لگا، اسے لگا جیسے اس کے ڈیڑی اس سے مذاق کر رہے ہوں۔

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڑی؟“

”تمہیں کچھ وقت گزرنے کے بعد پتہ لگ جائے گا ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ ہمت مت ہارو اور یاد رکھو مشکل وقت ہمیشہ نہیں رہتا اور مضبوط لوگ اسے فہم کر لیتے ہیں۔“

”میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔“ میٹھو نے کہا اور کچن میں چلا گیا۔

”میں بھی لکھنے جا رہا ہوں۔“ اس کے ڈیڑی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”ڈیڑی! آپ کب تک وہ کتاب لکھتے رہیں گے؟“

میٹھو نے پلٹ کر پوچھا اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”بس اب وہ مکمل ہونے والی ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”اور پھر.....؟“ کیا آپ اسے پبلش کروائیں گے؟“

”نہیں۔“

”نہیں؟ ڈیڑی! آپ میں سال سے ایک گھنٹہ روزانہ رات کو یہ کتاب لکھ رہے ہیں پھر آپ اسے پبلش کروانا کیوں نہیں چاہتے؟“ میٹھو نے حرمت سے پوچھا۔

”بعض اوقات کسی رائٹر کا کام ایسا بھی ہوتا ہے جو پبلش کرنے کے لیے نہیں ہوتا ہے۔“ اس کے والد نے ایک اور نیا انکشاف کیا۔ ”اس کے رائٹر کی نظر میں کوئی اور مقصد اور استعمال ہوتا ہے۔“

”اور یہ لائف ٹائم بک جس کے ساتھ آپ اتنا مصروف ہیں اس کا آپ کے لیے کیا مقصد ہے؟“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“

”اد کے میرے لیے یہ حرمت انگیز خبر ہے۔“

”تم پریشان مت ہو۔ یہ صرف رائٹر ہی.....“

”صرف رائٹر کے لیے ہی ہے۔“ میٹھو نے اس کی بات مکمل کی۔

”میں جانتا ہوں یہ رائٹر Evan Myers کا قول ہے۔“

”ہاں تم نے ٹھیک کہا۔“

”میں چاہے پی کر سو جاؤں گا۔“ میٹھو نے کہا۔

”کیوں؟ تم رات کا کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

”نہیں۔“ مجھے بھوک نہیں لگی ہے..... میں جیس کو دنتاے جانے کا منظر نہیں بھول سکتا۔“

”ٹھیک ہے میں اسڈی میں جا رہا ہوں تم سو جانا۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا اور اسڈی روم میں جا کر دروازہ بند کر لیا میٹھو بھی چائے پینے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

چند روز بعد پھر جب وہ اپنے ڈیڑی کے ساتھ بیٹھا تھا تو انہوں نے اپنا پیٹنڈہ موضوع پھینچ دیا تھا۔

”کیا تمہاری زندگی میں کوئی چاہنے والی آئی؟“

”آپ جانتے ہیں میں اتنا خوش شکل نہیں کہ کسی کو پسند آ جاؤں۔“ میٹھو نے اداسی سے کہا۔

”کوئی لڑکی میری طرف دوبارہ نہیں دیکھتی۔“

”اس دنیا میں خوبصورتی ہی سب کچھ نہیں ہے میٹھو۔“

”نہیں ڈیڑی! آج کل کی دنیا میں اس کی بہت اہمیت ہے“

آپ کے اندر کی خوبصورتی کوئی نہیں دیکھتا سب ظاہری خوبصورتی اور شان و شوکت دیکھتے ہیں۔“

”لیکن جب میں جوان تھا تب تو شخصیت کی اندرونی خوبصورتی اس کے جذبات اور احساسات ہی کی اہمیت ہوتی تھی۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا۔

”ہاں اگر میں بھی اس وقت میں ہوتا تو شاید میں بھی کامیاب زندگی گزارتا۔“

”مجھے امید ہے تم اب بھی اچھی اور کامیاب زندگی گزارو گے ایک دن تمہاری زندگی میں بھی کوئی چاہنے والی آئے گی جو تمہاری اندرونی خوبصورتی سے متاثر ہوگی تمہیں سچا یاد کرے گی۔“

”شاید ایسا ہوئیں دعا کرتا ہوں کہ وہ وقت آنے تک میں زندہ رہوں۔“ میٹھو نے اداسی سے کہا۔

”تم زندہ رہو گے..... میں نہیں ہوں گا لیکن میں تم پر فخر کروں گا اور تمہیں خوش دیکھ کر میری روح کو سکون ملے گا۔“

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ڈیڑی؟ کیا آپ پھر مستقبل کی پیش گوئی کر رہے ہیں؟“

”نہیں..... میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں یہ لکھ رہا ہوں۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ میرے ساتھ نہیں ہوں گے جب میری زندگی میں خوشی آئے گی تو آپ بھی رہا ہوں۔“

میرے ساتھ ضرور ہوں گے۔“

”ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے حالات بڑے حیران کن انداز میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا اور پھر اس رات بھی اپنی کتاب لکھنے کے لیے اسٹڈی روم میں چلے گئے۔

”کچھ نہیں..... اب تمہارا وقت ہے..... تمہارا وقت ہے کہ تم جیتو..... اور کامیابی حاصل کرو اور اپنی زندگی کی بازی کھیلو۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا اس کے ڈیڑی بہت جذباتی نظر آ رہے تھے وہ اداس تھے وہ جب بھی اسے اداس اور دکھی نہیں ہوئے تھے جب میتھو کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔

”شب بخیر ڈیڑی۔“ میتھو نے آہستہ سے کہا اور اسٹڈی روم سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز جب وہ سو کر اٹھا تو اس کے ڈیڑی اس سے پہلے اٹھ چکے تھے۔

”گڈ مرننگ ڈیڑی۔“ اس نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”گڈ مرننگ بیٹی۔“

”ڈیڑی وقت بہت ہو گیا ہے مجھے فوراً ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔“ میتھو نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ڈرا ٹھہرو میتھو۔“

”جی ڈیڑی۔“ میتھو نے مڑتے ہوئے کہا۔

”میرے سینے سے لگ جاؤ۔“

”ڈیڑی؟“ میتھو نے حیرت سے کہا۔

”بس میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں سینے سے لگانے کے لیے۔“

”اوکے.....“ میتھو نے کہا اور ان کے سینے سے لگ گیا ایسا روز نہیں ہوتا تھا اس لیے میتھو کو حیرت تھی کہ اس کے ڈیڑی نے اس سے یہ فرمائش کیوں کی تھی۔

”آج چاہے جو بھی کچھ ہو..... جیسے بھی حالات ہوں میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم پر فخر کرتا ہوں۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”میں بھی آپ سے پیار کرتا ہوں۔“ میتھو نے کہا اس نے دیکھا اس کے ڈیڑی کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن چہرے پر مسکراہٹ برقرار تھی۔

”ادہ میں جیت گیا۔“ میتھو نے خوشی سے کہا۔

”اب تمہیں لگ رہا ہے کہ تم خوش قسمت ہو؟“ اس کے ڈیڑی نے پوچھا۔

”ہاں میں خوش قسمت ہوں..... آج پہلی بار مجھے فتح ملی ہے۔“

”میں نے آپ کو ہرا دیا ہے۔“

”ہاں ممکن ہے ایسا ہماری قسمت میں ہی لکھا ہو۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا۔

”ہماری زندگی میں بہت کچھ پہلی بار ہوتا ہے جیسے مجھے آج فتح ملی تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔“

”ہاں تمہیں فتح مبارک ہو..... تم نے آج اچھا کھیلا.....“

میں ابھی آتا ہوں۔“ اس کے ڈیڑی نے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلے گئے جب وہ چلے گئے تو میتھو نے ان کے کارڈ اٹھا کر دیکھے ان کے کارڈ بہترین تھے اور انہیں جیتنے کے لیے جن کارڈز کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس موجود تھے لیکن انہوں نے انہیں استعمال نہیں کیا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ میتھو سے جان بوجھ کر ہارے تھے جب وہ کچن کے واپس آئے تو میتھو نے ان سے وجہ پوچھی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ دیکھیں۔“ میتھو نے ان کے کارڈ ان کے سامنے کر دیے۔“ آپ کے پاس جیتنے کے لیے سارے کارڈز تھے

”مجھے دیر ہو رہی ہے میں چلتا ہوں..... رات کو طیس گئے“ میتھو نے کہا اور روانہ ہو گیا۔ ڈیوٹی پر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی نے آج اسے خاص طور سے گلے کیوں لگایا اور وہ اتنے جذباتی کیوں ہو رہے تھے اس روز کوئی خاص ایمر جنسی بھی نہیں آئی تھی دوپہر کے بعد اس کا ساتھی جو دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی تھی کہ کوئی ایمر جنسی ہوئی ہے اور گریم اسٹریٹ پر کوئی حادثہ پیش آیا ہے میتھو فوراً ہی جائے حادثہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا جو اس کے ساتھ تھان کی ایسولنس سڑک پر سائرن بجائی اور دوسرے ٹریفک میں راستہ بناتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی ایسی ایمر جنسیاں انہیں روز بروز پیش آتی رہتی تھیں اور وہ جائے حادثہ پر پہنچنے والی پہلی ٹیم ہوتے تھے پولیس بھی ان کے بعد ہی پہنچتی تھی۔

حادثے کی جگہ ایک کار کھڑی تھی جو حادثے کا شکار ہوئی تھی اور ایک شخص سے ٹکرائی تھی اس کا ونڈ اسکرین چٹکا چور ہو گیا تھا وہ شخص شدید زخمی تھا اور اس کا چہرہ شناخت نہیں رہا تھا کیونکہ وہ خون سے تھمڑا ہوا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میتھو نے اس کے قریب جا کر پوچھا اس کی آواز پر سکون تھی کیونکہ اس چیز کی انہیں تربیت دی جاتی تھی کہ ایسی صورت حال میں بھی پرسکون رہو۔

”یہ میں ہوں.....“ ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اسے لگا جیسے کسی آدمی یا تھہ نے اس کا دل دبوچ لیا ہو اس نے اس زخمی کے چہرے کا خون صاف کیا اسی وقت اس کے ساتھی جو نے بھی اس سے کچھ کہا لیکن وہ اس کی بات سن نہیں سکا کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے والد کا زخمی چہرہ تھا۔

”ڈیڈ..... کیا ہوا ہے؟“ اس نے کرب سے پوچھا لیکن جواب میں اس کے ڈیڈی کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ نظر آئی۔

”قسمت کا لکھا ہوا ہے بیٹا وہی جو میری زندگی میں ہونا تھا..... جو میری زندگی کی کتاب کے آخری صفحے پر لکھا ہوا تھا..... میری کہانی پڑھی جا چکی..... یہ ختم ہو گئی اور پبلش بھی“ انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

میتھو خوف سے ساکت ہو گیا وہ حیرت سے اپنے والد کو تنک رہا تھا اور جو اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نہیں ڈیڈ..... یہ نہیں ہو سکتا..... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا..... میرا آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“

”ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے بیٹا..... تمہیں یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا..... جب ہمیں دکھ ملتا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں ایسی صورت میں ہمیں ہمت سے کام لینا ہوتا ہے کیونکہ آنے والے وقت میں پھر سب بدل جائے گا اور تمہیں زندہ رہنے کے لیے کوئی نئی وجہ مل جائے گی بس اس دن کو گزر جائے دو اور آنے والے کل کا انتظار کرو“ انہوں نے میتھو کو سمجھایا پھر ان کے منہ سے بھی خون بہنے لگا تھا اور میتھو سمجھ گیا تھا کہ وہ اب ان سے جدا ہونے والا ہے۔

”جو! جلدی کرو انہیں ایسولنس میں ڈالو“ اس نے چیخ کر کہا۔

”میں تمہارے لیے اسٹڈی روم میں ایک نوٹ چھوڑ آیا ہوں وہ ضرور پڑھ لیتا“ اس کے والد نے آہستہ سے کہا۔

”اس سے تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا کہ تمہیں میرے لیے کیا کرنا ہے مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو۔“

”جی ڈیڈی۔“

”جو کتاب میں اب تک لکھتا رہا ہوں وہ بھی اسٹڈی روم میں ہے وعدہ کرو اب تم اس کتاب کو روزانہ لکھو گے کسی بھی ناشے کے بغیر..... وعدہ کرو۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں ڈیڈی۔“ میتھو نے کہا اور اس کے ڈیڈی کے ہونٹوں پر ایسی پرسکون مسکراہٹ بکھر گئی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور میتھو کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر کانوں سے ڈھلک گئے۔

”میں خوش ہوں کہ مجھے تم جیسا فرمانبردار بیٹا ملا ہے۔“

اس کے ڈیڈی نے کہا اور وہ ڈیڈی بائی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہ گیا پھر اس نے ان کی آخری سانس کی آواز سنی جو ان کے پیچھے چڑوں سے نکلی اور ان کی زندگی کی شمع بجھ گئی وہ شمع جو میتھو کے لیے زندگی کا راستہ دکھانے کی آخری شمع تھی اور میتھو کو لگا جیسے گردش رک گئی ہو۔

”نہیں ڈیڈ..... آپ نہیں جاسکتے.....“ وہ چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا جو نے اسے سنبھالا پھر ایسولنس میں اس کے والد کی لاش کو اسپتال لے جایا گیا وہ ان کے ساتھ تھا جو اس کا غم کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میتھو بالکل خاموش تھا کچھ دیر کے بعد جب اس کے والد کے جسم کو سرد خانے میں

رکھ دیا گیا تو جو اس کے گھر چھوڑ گیا۔

وہ اپنے والد کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور غمزہ ایسے میں اس کو غموں نے گھیر لیا وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور صلا سے اس صورت میں ملا کہ اس کی زندگی کی عزیز ترین ہتیاں جن سے وہ شدید محبت کرتا تھا اس سے پھٹ کر گئیں اس کے کانوں میں اس کے والد کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

”مجھ سے ایک وعدہ کرو..... وہ اسٹڈی میں موجود ہے..... ہر وقت مصروف رہتا ہوں..... وہ اسٹڈی میں موجود ہے..... وعدہ کرو تم ہر روز اس کی کہانی لکھو گے تاغذمت کرنا..... بولو وعدہ کرتے ہو؟“

”میتھو سوچ رہا تھا کہ بھلا اس کتاب میں ایسا کیا ہے کہ وہ بیس سال سے لکھی جا رہی ہے اور اسے کبھی بھی پبلش نہیں ہونا پھر بھی یہ کیوں ضروری ہے کہ اسے اب بھی بلا تاغذ لکھا جائے اس نے کتاب اور اس کے ساتھ رکھے نوٹ کو پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

”میرے بیٹے اگر تم یہ نوٹ پڑھ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ میں اس دنیا میں نہیں رہا“ تمہارا میری اولاد ہونا میرے لیے باعث فخر ہے تم حقیقت میں ایک ایسے بیٹے ہو جس سے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کرنا چاہتا ہوں یہ کتاب وہ ہے جس کو لکھنے میں میں بیس سال سے مصروف رہا یہ ایک لڑکی ”الازین“ کے بارے میں ہے جس نے تیرہ مئی 1989 کی رات کو اپنے والدین کو ایک حادثے میں کھو دیا تھا میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی کہانی کو جاری رکھو۔“

پیار

تمہارا دیڑی!

میتھو نے کتاب کے پہلے صفحے پر دیکھا ”The Book keeper“ اس کے ورق پر لکھا تھا اور کتاب ہاتھ کی لکھائی میں تھی۔ میتھو نے کتاب کھولی اور ورق گردانی شروع کر دی۔

”14 مئی 1987ء اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں مکمل خاموشی تھی کہ اچانک ایک طبی رضا کار کی آواز فضا میں گونجی۔ ”ہمارے پاس ایک اشیا کس سالہ لڑکی عورت آئی ہے جو حاملہ بھی ہے۔“ اور پھر اسٹریچر پر اس عورت کو آپریشن ٹیم میں لے جایا گیا اس عورت کو کار کا حادثہ پیش آیا تھا۔“

”اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا لیکن اس کے جسم میں ہمیں بچے کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے۔“ طبی رضا کار نے جگت سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد بچی کے رونے کی آواز سنائی دی تھی ایک نئی زندگی نے دنیا میں انگڑائی لی تھی۔

”یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ لڑکی زندہ ہے۔“ ایک سسٹر نے کہا۔

”لیکن میں اس کا معائنہ کرتا ہوں تاکہ یہ اطمینان کر سکوں کہ یہ ہر لحاظ سے صحت مند ہے اور حادثے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر یہ مسز فٹن ہیں کل یہ یہاں معائنے کے لیے بھی آئی تھیں۔“ ایک اور سسٹر نے بتایا۔

”ہاں میں جانتی ہوں مجھے بیس منٹ پہلے ان کی کال آئی تھی وہ اسپتال ہی آ رہی تھیں انہیں بچی کی ولادت کی توقع تھی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن اس بچی کو شیدول کے مطابق اگلے ماہ پیدا ہونا تھا۔“

”اللہ اس کی حفاظت کرے۔“ نرس نے بچی کو انتہائی نگہداشت کی مشین اٹکھ بیئر میں رکھتے ہوئے کہا۔

کمرے کے باہر کھڑے ایک اڈجسٹمر جوڑے کی نظریں ششے کی دیوار کے پیچھے سے اس بچی کو دیکھ رہی تھیں جو اس کے ششے کے آئی اور اٹکل ہوتے تھے۔

”بہت خوبصورت بچی ہے۔“ آنٹی میری نے کہا۔ ”ہم اس کی پرورش کریں گے۔“ اٹکل بروں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ہم اس کا نام کیا رکھیں گے؟“ آنٹی میری نے پوچھا۔ ”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے میری تم کوئی اچھا سا نام سوچو۔“

”الازین“ میرے خیال میں یہ نام اچھا ہے۔“

”لیکن الازین ہی کیوں؟“

”یہ ہسپانوی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے ”معجزہ“ آنٹی میری نے بتایا۔

”ہاں..... یہ اس صورت حال میں مناسب ترین ہے۔“ اٹکل بروں نے کہا۔

کتاب میں اس دن کے بارے میں مزید تفصیلات بھی درج تھیں اس کتاب کو ڈائری کی صورت میں لکھا گیا تھا

ہر ایک دن کے واقعات کی ڈائری کا ایک باب تھا۔ میتھو نے اس کتاب کا آخری صفحہ کھولا یا آخری صفحہ تھا جو میتھو کے ڈیڈی نے لکھا تھا۔

19 جون 2013ء یہ گزرے ہوئے دن کی تاریخ تھی۔ میتھو نے پڑھنا شروع کیا۔

”الازین نے دوسرے دن خوبصورت صبح میں آنکھیں کھولیں، الازین نے اپنا کس شخصے میں دیکھا اور سکرادی یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کی آمد کا انتظار ہو اس کے سیاہ لمبے بال اس کی پشت پر کمرے ہوئے تھے۔ نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اس کا جسم خوبصورت اور سڈول تھا اس نے کپڑوں کی الماری کھولی اور اس میں سے بلو جینز اور ایک سفید ٹی شرٹ نکالی جس پر Grim street book shop لکھا ہوا تھا، پھر کپڑے پھین کر وہ اپنی بلیک کلر کی کار میں شاپ جانے کے لیے بیٹھ گئی جو اس کے انگل بروس نے اسے اس کی ایکسویس سالگرہ پر تحفے میں دی تھی وہ گریم اسٹریٹ پر سفر کر رہی تھی کہ اچانک ایک موٹر سائیکل سے ٹکرائی اس نے تیزی سے کار کو بریک لگائے اور کار سے اتر گئی۔

”اوہ..... میں معافی چاہتی ہوں“ وہ تیزی سے موٹر سائیکل سوار کی طرف بڑھی۔

”کیا تم ٹھیک ہو؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ سوار نے جواب دیا اور الازین نے آگے بڑھ کر اسے جھانکنا۔

”کیا واقعی تم ٹھیک ہو؟ اگر کہو تو میں تمہیں چیک اپ کے لیے اسپتال لے جا سکتی ہوں۔“ اس نے پیش کش کی۔

”میں ایک طبی رضا کار ہوں..... میں اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہوں لیکن میری بانیٹ بالکل جواب دے گئی ہے۔“

نو جوان نے کہا۔

”اوہ میں معافی چاہتی ہوں..... میں تمہیں اس کے لیے رقم دے سکتی ہوں۔“ الازین نے کہا۔

کتاب پڑھتے پڑھتے میتھو کو نیندا آگئی جب اس کی آنکھ کھلی تو اسٹریڈی روم سے شور کی آوازیں آرہی تھیں وہ کمرے میں گیا تو اس کے والد دروازے کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔

”ڈیڈی؟ آپ یہاں؟“

”ہاں یہ میں ہوں۔“ اس کے ڈیڈی نے کہا۔ ان کے قریب ہی زمین میں ایک قبر کھدی نظر آرہی تھی۔

”میں بہت قاصطے سے تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔“ اس کے ڈیڈی نے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ انہیں کوئی جواب دیتا وہ اس قبر میں گرنا چلا گیا پھر وہ روشنیوں کے حصار میں آگیا اور اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو پھر کچھ دیر بعد ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی وہ کتاب جو کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھ میں تھی اب میز پر رکھی تھی اور وہ اپنے لمبر پر دراز تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اسے کیا ہوا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ کتاب کا آخری صفحہ جو وہ پڑھ رہا تھا اگر وہ آج کے بارے میں لکھا گیا تھا تو آنے والا کل اس کے لیے کیا ہوگا؟

دوسری صبح میتھو سو کر اٹھا تو اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اس نے باہر ناستہ کرنے کا پروگرام بنایا اور اپنی بانیٹ لے کر گھر سے نکل گیا وہ گریم اسٹریٹ پر موجود ریسنورینٹ کے سامنے پہنچا تو اسے وہی مظفر نظر آیا جو کتاب میں پڑھ چکا تھا وہ ریڈیٹر ٹیک لائٹ دیکھ کر رک گیا اور کتاب والے مظفر کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا اس نے سوچا کہ وہ ایک پرانی دقیا لوسی کتاب ہے اس کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اچانک ریڈیٹر لائٹ، گرین لائٹ میں تبدیل ہوئی اس نے اپنی بانیٹ آگے بڑھا دی اور اس نے لہجہ وہ ایک کلا سے ٹکرائی اور وہ روڑ پر گر گیا، کار کے بریک لگے تھے اور وہ اس کے قریب رک گئی تھی کہانی اپنے آپ کو دہرائی تھی اور وہ میرا تھا اس نے دیکھا کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لڑکی اتر کر اس کی طرف بڑھی۔

”اوہ..... میں معافی چاہتی ہوں..... کیا تم ٹھیک ہو؟ تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میتھو نے اٹھتے ہوئے کہا اور لڑکی نے اسے سہارا دے کر اٹھنے میں مدد کی۔

”کیا واقعی تم ٹھیک ہو؟ اگر تم کہو تو میں تمہیں چیک اپ کے لیے اسپتال لے جا سکتی ہوں۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔“ میتھو نے کہا پھر اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو اسے لگا جیسے اس کے پیٹ میں تتلیاں سی اڑ رہی ہوں لڑکی کی نیلی کھری

”تم الازین ہو؟“

”ہاں..... میں الازین ہوں۔“ لڑکی نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں میتھو میٹر ہوں۔“ میتھو نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم سے مل کر خوش ہوئی۔“ الازین نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

میتھو اس کے ساتھ اس کی شاپ میں داخل ہوا تھا اور الازین نے بیٹھنے کے لیے اسے کرسی آفر کی تھی۔ اس دکان میں بہت کتابیں تھیں الازین اس کے لیے کافی بنانے چلی گئی تھی اور میتھو نے کتابیں دیکھنا شروع کر دی تھیں وہاں ہر موضوع پر کتابیں تھیں لیکن اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ زیادہ تر کتابیں اس کے والد ”چارلی ایکوز“ کی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک پوری فیلف ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

”تمہاری پاس چارلی ایکوز کی بہت کتابیں ہیں؟“ میتھو نے ذرا بلند آواز سے کہا تاکہ ملحقہ کچن میں موجود الازین اس کی بات سن سکے۔

”ہاں..... وہ میرا ہمیشہ سے پسندیدہ رائٹر رہا ہے۔“

الازین نے جواب دیا: ”کافی لیے ہوئے“ وہاں کاؤنٹر پر آگئی تھی اور کافی کے دو کپ وہاں رکھ دیئے تھے۔

”کیا واقعی وہ تمہارا پسندیدہ رائٹر ہے؟“ میتھو نے پوچھا۔

”ہاں“ نیام نے بھی اس کی کوئی تحریر پڑھی ہے؟“

”ہاں“ میں نے پڑھی ہے کیا تم بھی اس سے ملیں؟“

”ہاں“ اس سے ملنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا

وہ ایک روز میری شاپ پر آیا تھا اس نے کچھ خریدا نہیں تھا۔“

”وہ کب آئے تھے؟ کیا تمہیں یاد ہے؟“

”ہاں بالکل مجھے یاد ہے وہ تیرہ مارچ انیس سو گیارہ کا دن تھا۔“

”اچھا..... تو الازین“ کے پیچھے کیا کہانی ہے؟“ میتھو نے پوچھا۔

”تم کس کہانی کی بات کر رہے ہو؟“

”دراصل الازین“ میرا بیٹا کا نام ہے۔“

”بیٹا کا نام؟“

چند رات گئیں اسے گھور رہی تھیں اس کے سیاہ لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بلو جینز اور سفیدی شرٹ پہنی ہوئی تھی وہ حیرت سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن میری بائیک.....“ میتھو نے اپنی ٹوٹی ہوئی بائیک کی طرف دیکھا۔

”میں اس کے لیے تمہیں رقم دے سکتی ہوں۔“

”تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے یہ دے دے بھی ایک کباڑ سے زیادہ کچھ نہیں کی بہت پرانی اور بوسیدہ ہے۔“

”کیا میں تمہیں لفٹ دے سکتی ہوں؟“ لڑکی نے کہا اور میتھو نے اس کی کار کی طرف دیکھا جو خاصی پرانی تھی۔

”فکرمات کرو..... یہ اشارت ہو جائے گی تمہیں دھکا نہیں دینا پڑے گا۔“ لڑکی نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”تم مجھے ریسٹورنٹ تک چھوڑ دو۔“

”اتنی صبح صبح؟“ لڑکی نے حیرت سے کہا۔ ”میں ایک بک شاپ میں کام کرتی ہوں اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو ہم ساتھ چائے پی سکتے ہیں۔“ لڑکی نے اسے چائے کی آفر دی جسے اس نے قبول کر لیا۔

”تم کیا کرتے ہو؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”میں ایک طبی رضا کار ہوں۔“

”اوہ..... تو تم بہت بہتر ہو.....“ لڑکی نے زندگیاں بچاتے ہوئے..... گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے حادثہ پیش آجائے تو مجھے ایک اچھا دیکھ بھال کرنے والا مل سکتا ہے۔“

لڑکی نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”ہاں اگر تم بھی مجھ کے ساتھ حادثے کا شکار نہ ہو گیا تو۔“

”میرا نام الازین ہے۔“

”کیا کہا؟“ میتھو نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا نام الازین ہے لوگ اکثر مجھ سے میرے نام کے معنی پوچھتے ہیں الازین دیکھتی جس کا مطلب ہے مجوزہ“ لڑکی نے کہا اور میتھو ایک بار پھر حیران رہ گیا وہ سوچ رہا تھا کہ جو کتاب اسے لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ”The book

keeper“ وہ اس لڑکی کی ہی زندگی کے بارے میں ہے اس نے جو کچھ پڑھا تھا وہ اسی طرح ہو رہا تھا اس کا نام اس کے خیالات کی تصدیق کر رہا تھا اور وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ کتاب میں جو شخص اس لڑکی کی کا سے گزر رہا تھا وہ میتھو ہی تھا۔

”میں پانچ بجے تک کام کروں گی اور تم سے وہیں ملوں گی۔“ الازین نے اسے سی فوڈ ریستورنٹ کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک سات بجے۔“ اس نے مزید ہدایت کی۔
 ”ٹھیک ہے۔“ میتھو نے کہا اور دکان سے نکل گیا پھر اس نے ایک ٹیکسی روکی تھی اور سالٹ اسٹریٹ پر واقع اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے والد کی پر اسرار کتاب ”The book keeper“ سے الازین کے بارے میں کیا لکھا تھا جیسے ہی وہ گھر پہنچا تھاسیدھا اسٹڈی روم میں گیا تھا اور اپنے والد کی کرسی پر بیٹھ کر کتاب اٹھالی تھی پھر اس نے آج کی تاریخ کا صفحہ کھولا تھا۔

19 جون 2011ء

کتاب میں وہی ساری تفصیلات درج تھیں جو آج اس کیساتھ پیش آئی تھیں اس میں درج تھا کہ وہ ایک شاپ میں کافی پیسے کا اور لڑکی کے ساتھ اس کی جو گفتگو بتائی گئی تھی اس میں بھی خاصی حد تک مماثلت تھی یہ کتاب کسی شخص کی روزمرہ زندگی کا کھلا آئینہ تھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ حصہ کب لکھا گیا تھا لیکن یہ آج ہونے والے واقعات کے ہو بہو تھا وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ الازین اس کتاب کے رائٹر کے لیے کسی کچھ پتلی کا کردار ادا کر رہی تھی۔



الازین شام پانچ بجے تک شاپ میں بہت مصروف رہی تھی اور اپنے خیالوں میں گن گئی وہ برابر میتھو کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

”الازین۔“ اس کے منجبر برین نے اسے آواز دی جب بھی وہ خیالوں میں غرق تھا۔

”ہیلو الازین..... کیا سوچ رہی ہو؟“ برین نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

”اوہ..... ہاں..... کیا بات ہے؟“ الازین نے چونکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی محبت میں گرفتار ہو جائے تو تم اس محبت کو اس کی مسکراہٹ میں محسوس کر سکتے ہو..... وہ کون ہے؟ اور اس سے کہاں مل رہی ہو؟“ برین نے پوچھا۔

”ہاں میں اپنے فارغ اوقات میں کچھ رقم کمانے کے لیے اسٹینج پر بھی کام کرتی ہوں۔“
 ”کیا کام کرتی ہو؟“

”میں چھوٹے چھوٹے اسٹینج کے ڈراموں میں اداکاری کرتی ہوں۔“

”اوہ..... بہت اچھا ہے۔“ میتھو نے کہا۔

”میری آئی اور انکل نے میرا نام الازین رکھا ہے اور انہوں نے ہی میری پرورش کی۔“ الازین نے کہا اور اسی وقت ایک گاہک دکان میں داخل ہوا۔

”اچھا میں ابھی آتی ہوں۔“ الازین نے میتھو سے کہا اور گاہک کی طرف بڑھی۔

”میں بھی چلتا ہوں۔“ میتھو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ الازین نے جواب دیا اور میتھو دروازے کی طرف بڑھا پھر اچانک اسے ایک خیال آیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ ”The book keeper“ کی وجہ سے الازین اس کے لیے اہمیت رکھتی ہے اسے آئندہ بھی الازین سے ملنا ہوگا چنانچہ تعلقات استوار رکھنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے وہ تیزی سے الازین کی طرف پلٹا اس وقت تک الازین کاؤنٹر کے دوسری طرف بیٹھی کمپیوٹر پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

”الازین“

”ہاں کیا بات ہے؟“ الازین نے سر اٹھاتے ہوئے

پوچھا۔

”ڈسٹر ب کرنے کی معافی چاہتا ہوں کیا آج رات تم کچھ مصروف تو نہیں؟“

”نہیں؟“

”کیا تم میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گی؟“

”ہاں ضرور۔“

”مگر۔“

”لیکن۔“

”نائرین ایک شرط ہوگی۔“
 ”وہ کیا؟“
 ”کیونکہ ہم کسی سی فوڈ ریستورنٹ میں چلیں۔“ الازین نے شرط بیان کی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”ضرور..... میں تمہیں کہاں سے پک کروں گا۔“ میتھو نے پوچھا۔

”اوہ..... تمہیں پتہ ہے آج صبح ایک شخص سے میری کار کھرا گئی۔“ الازین نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور اس شخص کو تم بہت پسند آگئیں۔“

”وہ میرے ساتھ یہاں آیا تھا اور میں نے اسے کافی بنا کر دی تھی۔“ الازین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گو یا میرا خیال درست ہے۔“

”تم بھی بس عجیب باتیں کرتے ہو۔“

”میرا خیال ہے اب کارات کا کھانا تو تمہیں اس کے ساتھ بھی کھانا چاہیے تھا ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔“

”وہ تو میں جا رہی ہوں۔“

”بہت خوب!“ برین نے تعریفی انداز میں کہا وہ الازین کا بہترین دوست تھا اور اس سے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

میتھو نے کتاب رکھی اور اپنے لیے کافی بنانے کچن میں چلا گیا وہ سوچ رہا تھا بھلا ایک کتاب کس طرح الازین کی زندگی کو کنٹرول کر سکتی ہے یہ ناممکن ہے اور پھر اس سے بھی حیرت کی بات یہ کہ اسے کچھ چلیوں کی طرح نچانے والا وہ خود ہے اسے اس خیال سے ہی خوف آنے لگا اس نے سوچا کہ اگر اس قوت پر اس کا کنٹرول نہ رہا تو کیا ہو سکتا ہے اور اس

کتاب میں آج رات وقوع پذیر ہونے والے جو واقعات درج ہیں وہ ضرور ہو کر رہیں گے کیوں نہ وہ ان واقعات کو تبدیل کر کے چیک کرے کہ واقعی اس کو بھی اس کتاب پر کنٹرول حاصل ہے یا نہیں؟

”وہ ہیں۔“ لڑکھاپس اسٹڈی میں آ گیا اور قلم اٹھا کر ان واقعات میں تبدیلی کرنے لگا جو اس رات ر۔سینٹ میں پیش آنے والے تھے وہ بڑے دھیان سے کتابی کہانی پڑھ رہا تھا تاکہ اپنی مرضی سے مناسب جگہوں میں تبدیلی کرتا جائے۔

”چھنچ کر دس منٹ ہوئے دکان میں اب بھی گاؤں کا رش تھا حالانکہ پانچ بجے وقت ختم ہو چکا تھا لیکن جو لوگ دکان کے اندر موجود تھے الازین ابھی تک ان کے معاملات نمٹا رہی تھی۔

”الازین..... ادھر آؤ۔“ اسے برین نے آواز دی۔

”جی۔“ الازین نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔

”تمہیں ڈر نہ پکب جانا ہے؟“

”سات بجے۔“

”تو پھر تم جاؤ تمہیں دیر ہو جائے گی میں یہاں کے معاملات دیکھ لوں گا۔“

”شکریہ برین..... تم بہت اچھے ہو۔“ الازین نے خوش ہو کر کہا۔

”وہ اپنے کمر گئی تیار ہوئی اور ٹیکسی لے کر ر۔سینٹ پہنچ گئی جہاں میتھو اس کا انتظار کر رہا تھا وہ سرخ لباس میں لمبوس تھی بال پشت پر نکھرے ہوئے تھے ہونٹوں پر سرخ لب اسٹیک لگائے وہ مسکرا رہی تھی اس نے اونچی ایڑی کا جوتا پہنا ہوا تھا۔

”ہائے“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہائے“ میتھو نے بھی جواب دیا۔

”تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں میتھو نے اس کے جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔“ الازین نے کہا اور اسی وقت ویشن کی سیٹل پر پہنچ گیا۔

”میرا نام ایشلے ہے..... آج رات میں آپ کو سروس کروں گا، کیا میں آپ کے لیے کوئی چیز چنے کولاؤں؟“ اس نے

پوچھا اور الازین مینو دیکھنے لگی۔

”میں سویٹ روزلوں گی۔“

”میں بھی۔“ میتھو نے اس کی تائید کی۔

”اور کھانے میں آپ کیا لیں گے؟“

”کیا تم ہمیں چند منٹ دو گے؟“ الازین نے کہا تو ویشر چلا گیا۔

”یہاں سے۔“ بڑھنے کے بعد میتھو نے سوچا کہ کتاب کے اسکرپٹ میں تبدیلی کرے کیونکہ یہاں اسکرپٹ ختم ہونے کے بعد تو ویشی جگہ چھوٹی ہوئی تھی جس میں وہ آسانی سے لکھ سکتا تھا اس نے لکھنا شروع کیا۔

”الازین کے فون کی بیل بجی اور وہ خشکی سے فون کو دیکھنے لگی۔

”تم اس کا جواب دے سکتی ہو۔“ میتھو نے کہا۔

”ہیلو..... میں الازین بول رہی ہوں۔“

”اوسے میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ الازین نے میتھو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں معافی چاہتی ہوں..... مجھے جانا ہے برین کی چابیاں دکان کے تالے میں نہیں لگ رہی ہیں وہ میری چابیاں منگوا رہا ہے میں بیس منٹ میں واپس آ جاؤں گی۔“ الازین چلی جاتی ہے اور ٹھیک بیس منٹ بعد واپس آ جاتی ہے۔

میتھو نے کم جگہ میں لکھا تھا چنانچہ بہت چھوٹا چھوٹا اور نہ سمجھ میں آنے والا لگ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کر دی اور تیار ہونے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دیکھے گا کہ اس نے کتاب میں جو تبدیلی کی ہے اس سے کیا ہوتا ہے؟ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے والد جانتے تھے کہ الازین اس کی زندگی میں آئے گی کیونکہ انہوں نے اس سے کہا بھی تھا کہ تمہاری زندگی میں ایک چاہنے والی آئے گی لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک کتابی کردار سے وہ پیار کرے اور اگر کرے تو وہ کردار بھی جواب میں اسے پیار دے۔



میتھو ریٹورنٹ پہنچا تو ویٹر نے دو افراد کے لیے جی میز تک اس کی رہنمائی کی اور اسے بیٹھ دے دیا۔

”آپ اسے چیک کریں اور آڈر دینے کے لیے مجھے بلا لیجیے گا۔“ ویٹر نے کہا اور دوسرا میز ٹیبل کی دوسری طرف رکھ دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میتھو نے کہا۔

چند منٹ بعد ہی میتھو کو کھسیں ہوا جیسے الازین ریٹورنٹ میں داخل ہوئی ہو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو واقعی وہ اپنی نیلی چمکدار آنکھوں سیاہ بالوں اور سرخ مخمروں کے ساتھ سرخ لباس میں ریٹورنٹ میں داخل ہو رہی تھی اس نے اونچی آواز کا جوتا پہنا ہوا تھا وہ بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی۔ میتھو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”گڈ ایوننگ۔“ میتھو نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اسے بیٹھنے میں مدد دی۔

”شکریہ۔“ الازین مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔“ میتھو نے اس کی تعریف کی اور اسی وقت ویٹر ان کی میز کے قریب آ گیا۔ ”میرا نام ایشلے ہے..... کیا میں آپ کے پیچھے کے لیے

کچھ لاؤں؟“

”میں سوئیٹ روزلوں گی۔“

”اور کھانے میں آپ کیا لیں گے؟“ ویٹر نے پوچھا۔

”میں چند منٹ دو۔“ الازین نے کہا اور میتھو کا دل

تیزی سے دھڑکنے لگا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے کتاب میں

جو تبدیلی کی ہے وہ وقوع پذیر ہوتی ہے یا نہیں! اچانک الازین

کے کون کی تیل بجی اور اس نے فون رسیو کیا۔

”ہیلو!“

”اچھا میں پانچ منٹ میں وہاں پہنچتی ہوں۔“ الازین

نے میتھو کو دیکھتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

”دراصل برین کی چابیاں دکان کے لاک میں نہیں لگ

رہی ہیں وہ میری چابیاں منگوا رہا ہے میں تھوڑی دیر میں

واپس آتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میتھو نے

جواب دیا۔

”شہر دو..... میں شاپ کے مالک کی بیٹی کوفون کرتی

ہوں اس کے پاس بھی دکان کی چابیاں ہیں وہ برین کی مدد

کر دے گی۔“ الازین نے اپنے جانے کا ارادہ ترک کرتے

ہوئے کہا اور میتھو حیران رہ گیا یہ تو اس نے کتاب میں نہیں

لکھا تھا چابیاں لے کر تو الازین کو جانا تھا۔

”ہیلو نکس! برین کی چابیاں کچھ مسئلہ کر رہی ہیں تم اپنی

چابیاں لے جاؤ اور دکان لاک کر دو پلیز۔“ الازین نے کہا۔

”ہاں وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے..... شکریہ۔“ الازین نے

فون بند کر دیا۔

”تم نے رکنے کا فیصلہ کیوں کیا؟“ میتھو نے حیرت سے

پوچھا۔

”کوئی اور اس کی مدد کرے گا میں تمہارے ساتھ رکنا

چاہتی ہوں۔“ الازین نے جواب دیا۔

”اوہ..... مجھے تمہارے اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔“ میتھو

نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ الازین کی زندگی مکمل طور پر اس کے

کنٹرول میں نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی فیصلے لے سکتی ہے اور اس

کے جذبات اور احساسات بھی اس کتاب کے واقعات

کو تبدیل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

کھانے کے دوران میتھو نے الازین کے پوچھنے پر بتایا

کہ جب وہ چار سال کا تھا تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا

تھا اور دور و قبل اس کے والد بھی اس دنیا سے چلے گئے تھے جس پر الازین نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

”میرے والدین بھی جس رات فوت ہوئے اسی رات میں پیدا ہوئی تھی۔“ الازین نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”میں نے کبھی انہیں نہیں دیکھا میری آنٹی اور اٹکل ہی میرے لیے میرے ماں باپ ہیں۔“

”کیا تمہیں اپنے والدین یاد آتے ہیں؟“

”ہاں..... بعض اوقات شدت سے میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے ان کے بارے میں بتائے کہ وہ کون تھے اور کیسے تھے؟ ان کے بارے میں میں نے صرف کہانیاں سنی ہیں لیکن ان سے میری تسلی نہیں ہوتی۔“

”ہاں..... ہماری زندگی میں بعض ایسی محرومیاں ہوتی ہیں جو کبھی ہمارا چہرہ نہیں چھوڑتیں۔“ میٹھو نے کہا۔

”میٹھو..... تم نے طبی رضا کار بننا کیوں پسند کیا؟“ الازین نے پوچھا۔

”میں ہمیشہ سے ہیر و بنا چاہتا تھا ایک ایسا شخص جس کے کام سے لوگ خوش ہوں وہ دوسروں کے لیے کچھا کچھا کر کے ان کی نظروں میں ہیر و بن جائے چنانچہ میں نے یہ شعبہ پسند کیا۔“

”کیا تمہیں اس کام میں کبھی مشکلات پیش آئیں؟“

”نہیں میں پانچ سال سے یہ کام کر رہا ہوں بعض اوقات مجھے ڈراؤنے خواب آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ یہ کام چھوڑ دوں ایسا بے ہوتا ہے جب کوئی بڑا اور خطرناک حادثہ پیش آتا ہے اور میں بہت زیادہ خون یا بہت زخمیوں کو دیکھتا ہوں..... لیکن تم..... تم ہتاؤ تم بک شاپ کی نوکری تک کیسے پہنچیں؟“

”دراصل مجھے کتابوں سے بہت لگاؤ ہے..... اور میں ایک پبلشر بنا چاہتی ہوں چنانچہ میں نے یہ راستہ اختیار کیا..... مستقبل میں میرا ارادہ اپنی پبلشنگ کمپنی کھولنے کا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”اور تم..... مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”عنقریب پتہ چل جائے گا۔“

”لیکن مجھے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔“ الازین نے کہا۔

”ہاں! لیکن اچھی چیزیں ہونے میں کچھ وقت لگتی

ہیں۔“

”مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔“ الازین نے کہا۔

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد میٹھو نے الازین کو اس

کے اپارٹمنٹ پر چھوڑا تھا اور خود اپنے گھر گیا تھا جب وہ گھر

میں داخل ہوا تو اس کی نظر لوگ روم میں رکھی The

book keeper پر پڑی جبکہ وہ اسے اسٹوری روم میں

رکھ کر گیا تھا اسے حیرت تھی کہ وہ وہاں کیسے آگئی تھی وہ اپنے

خیالات میں مگن اسے بیڈ پر لیٹ گیا تھا وہ اپنی سوچوں کو کسی

طرح بھی اس کتاب کے خیال سے آزاد نہیں کروا سکتا تھا وہ

زندگی کو ایک شع کی طرح دیکھتا تھا جو تب تک جلتی رہتی ہے

جب تک ہوا اسے بجھانہ دے یا وہ خود جل کر ختم نہ ہو جائے

لیکن کون سوچ سکتا ہے کہ زندگی ایک کتاب کی طرح بھی

ہو سکتی ہے جیسی اس کے سامنے میز پر رکھی کتاب ہے جیسے وہ

کوئی مافوق الفطرت چیز ہو یا اس دنیا میں کہیں اور سے وارد

ہوئی ہو اس میں لکھا ہوا ہے کیسے ہو جاتا ہے انہی خیالوں میں

مگن وہ نیند کی وادی میں پہنچ گیا تھا۔

دو دن بعد الازین میٹھو سے ملنے اس کے گھر آئی تھی

دو دنوں نے رات کا کھانا ساتھ کھایا تھا اور میٹھو نے وہ رات

الازین سے وہیں گزارنے کی گزارش کی تھی کیونکہ واپسی کے

لیے رات بہت ہوگئی تھی الازین بھی رکنے کے لیے تیار ہوگئی

تھی پھر جب وہ لوگ روم میں گئے تھے تو الازین کی نظر

کتاب پر پڑی تھی۔

”اوه..... The book keeper یہ کیسی کتاب

ہے؟“ اس نے تجسس سے پوچھا تھا اور میٹھو نے کتاب کو اٹھا

کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

”یہ..... یہ کتاب سیکرٹ ہے..... میں ابھی اس پر کام

کر رہا ہوں میں اس کو اپنے فارغ وقت میں لکھتا ہوں۔“

میٹھو نے کہا۔

”کیا میں یہ پڑھ سکتی ہوں؟“ الازین نے پوچھا۔

”نہیں.....“

”پلیز۔“

”تم جانتی ہو تمہیں کسی چیز کے لیے نا کہنا میرے لیے

کتنا مشکل ہے؟“ میٹھو نے کہا۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“ الازین نے شوقی سے

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن میں تمہیں یہ کتاب پڑھنے کے لیے نہیں دے سکتا یہ بہت اہم راز ہے۔“

”ایسا ہی راز جیسے گورنمنٹ کے ٹاپ سیکرٹس ہوتے ہیں؟“ الازین نے پوچھا۔

”اس سے بھی اہم راز۔“

”یعنی اگر تم مجھے یہ بتاؤ گے تو بہت بڑا راز فاش ہو جائے گا؟“

”ہاں یونی سمجھ لو۔“

”اچھا تو تم کب اسے مجھے پڑھنے کے لیے دو گے؟ کیا جب یہ مکمل ہو جائے گی تب؟“

”شاید..... یہ فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”میں اسے رکھ کر آتا ہوں۔“ میتھو نے کہا اور کتاب

لے کر اسٹڈی روم میں چلا گیا اس نے وہ کتاب اسٹڈی روم

کے لکڑی کے فرش کے نیچے بنے ایک خفیہ خانے میں چھپا دی

تھی اور اوپر سے قالین پھیلا دیا تھا اس کے والد بھی اس

کتاب کو وہیں چھپا کر رکھتے تھے جب وہ کتاب رکھ کر واپس

لوگ روم میں آیا تو الازین اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم نے اپنی خفیہ کتاب چھپا دی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں اب وہ محفوظ ہے۔“

”مجھے حیرت ہے تم نے اب تک یہ کتاب چھپوائی کیوں

نہیں ہے..... یہ بہت سوئی ہوئی ہے کیا تم بھی اسے

چھپاؤ گے؟“

”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میتھو نے کہا اسی وقت

الازین کی نظر دیوار پر لگی ایک تصویر پر پڑی۔

”یہ کون ہے.....؟“ وہ تو تمہارے گھر میں چارلی ایکوز کی

تصویر کیا کر رہی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”دراصل ان کا اصل نام ایوان میٹرز ہے اور چارلی ایکوز

ان کا قلمی نام ہے۔“

”کیا یہ تمہارے والد ہیں؟“ الازین نے حیرت سے

پوچھا۔

”ہاں۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ الازین نے

کہا تو میتھو اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرایا۔

”یہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں..... تو تم ان کے نقش قدم

پر چل رہے ہو؟“

”ہاں میں کوشش کر رہا ہوں“ میتھو نے جواب دیا۔ ”تم

ان سے کب ملی تھیں؟“ اس نے الازین سے پوچھا۔

”8 مارچ 2011ء میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”اچھا ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”کچھ خاص نہیں سوائے اس کے کہ میں اپنے پسندیدہ

رائٹر سے ملی۔“ الازین نے مزید تصدیق دیکتے ہوئے کہا۔ جو

کمرے کی دیوار پر آویزاں تھیں۔

”کیا یہ تمہاری والدہ ہیں؟“ اس نے ایک تصویر کی

طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ میتھو نے اداسی سے جواب دیا الازین سونے

کے لیے بیڈ پر لیٹ گئی تھی اور وہ اداس کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا

کہ 1 3 مئی 12 مارچ 2011ء اور 18 جون 2011ء اس کی زندگی

میں آکر گزر چکے تھے لیکن اس کے لیے اب بھی اہمیت رکھتے

تھے کیونکہ جب جب اس کی زندگی میں یہ تاریخیں کسی

حادثے کا موجب بنی تھیں تب ہی الازین کی زندگی میں بھی

کوئی اہم واقعہ ہوا تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ میتھو کی والدہ اور ان کے والدین

13 مئی 1987ء کو فوت ہوئے ایک ایکسڈنٹ میں اور

الازین 14 مئی 1987ء کو پیدا ہوئی۔

یہ اتفاق تھا کہ میتھو کا بہترین دوست

جیمس 18 مارچ 2011ء کو ایکسڈنٹ میں مارا گیا اور میتھو

کے والد سے الازین کی ملاقات 19 مارچ 2011ء کو ہوئی۔

وہ سوئی ہوئی الازین کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اس کا دل

چاہ رہا تھا کہ وہ وقت کو لگا میں ڈال کر روک دے یا اسے

آہستہ رو کر دے اسے محسوس ہوا کہ ہر بار جب اس کا کوئی

چاہنے والا اس سے جھگڑا تو الازین اس کے قریب آتی مگنی

کیا ان سب کو کھوتا اس لیے تھا کہ وہ ایسی ہستی سے ملنے والا تھا

جو شاید آئندہ زندگی میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہے؟

پھر ایسا ہی ہوا تھا میتھو اور الازین نے ایک دوسرے کو

اپنے جیون ساتھی کے طور پر قبول کر لیا تھا پھر دن مہینوں اور

مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے تھے اور اس کے ساتھ

ہی ساتھ میتھو کی کتاب کے الفاظ جملوں اور جملے بابوں میں

بدلے تھے کتاب بہت ضخیم ہو گئی تھی اس نے اس کتاب

کو

155

نہ افق

پروقت بہت لگایا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ بہت سے لوگ اسے وقت کا زیاں سمجھیں گے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اگر اسے زندگی میں دوسرا موقع ملا تب بھی وہ اس کام کو کرنا پسند کرے گا کیونکہ وقت کو الفاظ میں تبدیل کرنا 'الازین' کے مستقبل کی کہانی لکھنا اس میں خوشیاں ڈالنا اور پھر الازین کو خوش دیکھنا اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا 'الازین' سے اس کی شادی کو چار سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس تمام عرصے میں اس نے 'الازین' کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ The book keeper کس کے بارے میں لکھی جا رہی ہے اب 2015ء شروع ہو چکا تھا اس عرصے میں الازین ایک پبلشنگ کمپنی میں ایڈیٹر لگ چکی تھی اور میٹھو نے اپنے والد کی چھوڑی ہوئی رقم سے ایک لائٹ ہاؤس خرید کر وہاں سی نوڈ ریٹائرمنٹ بنا لیا تھا۔

ان کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد الازین کے انکل کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی موت سے اسے بہت دکھ پہنچا تھا لیکن میٹھو نے کتاب میں ایسا نہیں لکھا تھا وہ الازین کو دکھ دینا نہیں چاہتا تھا لیکن اتنی اہم بات اس کی نظروں سے کیسے نکل گئی تھی۔ وہ چیک کرنا چاہتا تھا چنانچہ الازین کو بیڈ روم میں چھوڑ کر وہ اسٹڈی روم میں گیا تھا اور اس کتاب کو کھول کر دیکھا تھا جب وہ اس روز کی تاریخ پر پہنچا تو کتاب اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی وہ حیران تھا کہ اس کی آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں وہ ناممکن تھا کتاب میں اس دن کی تفصیلات کسی اور کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھی گئی تھیں پھر اس نے گھر کا چپو چپو جھان مارا تھا لیکن گھر میں اس کے لور الازین کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟ کیا تلاش کر رہے ہو؟“ الازین نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں تم سو جاؤ۔“ میٹھو نے جواب دیا اور بیڈ روم سے نکل گیا پھر وہ گھر کے باہر گیا تھا اور آس پاس نظریں دوڑائی تھیں لیکن دور دور تک کسی کا پتہ نہیں تھا سب کچھ چیک کرنے کے بعد وہ پھر اسٹڈی روم میں گیا تھا اور کتاب کھولی اس نے ایک بار پوری کتاب کا جائزہ لیا اور اس پر یہ حقیقت متکشف ہوئی کہ اس کتاب میں جتنا کچھ اس نے لکھا تھا اسے کسی نے دوبارہ ری رائٹ کیا تھا وہ حیران تھا کہ چار سال کے لکھے ہوئے مواد کو کسی کی طرح ری رائٹ کر سکتا ہے کسی انسان کے لیے تو یہ ناممکن تھا پھر اس کا خیال اچانک دوسری

طرف چلا گیا اس نے سوچا کہ اگر یہ کسی انسان کا کام نہیں تو کیا کوئی روح یہ سب کر رہی ہے کیا وہ ایک رائٹر ہے اور ایڈیٹر کا کردار کوئی روح ادا کر رہی ہے جو اس کی تحریر میں تبدیلیاں کرتی ہے اس کی مرضی کے خلاف؟ میٹھو کا دل چاہا کہ وہ اسے ”ایڈیٹر روح“ کا خطاب دے دے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اس کتاب کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھے گا ایسا وہ الازین کے لیے کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کے بارے میں گھر رہا تھا اور وہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی لکھائی میں تبدیلی کر کے الازین کی زندگی میں ممکن حالات شامل کرے وہ کتاب کو اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے کر آیا گیا اور اسے اپنے بچے کے پیچھے رکھ کر الازین کے برابر لیٹ گیا۔

”میں اپنی آئی کی گھر جانا چاہتی ہوں۔“ الازین نے اس کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟“

”بس میرا دل چاہ رہا ہے۔“ الازین نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں وہاں تمہارے انکل کی تدفین کی رسومات ہونا ہیں..... تم نے میرے والد کی تدفین کے موقع پر مجھے تنہا نہیں چھوڑا تھا تو میں تمہارے انکل کی تدفین پر تمہیں کیسے تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ الازین نے جواب دیا۔

اس رات کافی دیر تک میٹھو جاگتا رہا تھا اسے فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کون اس کی کتاب میں تبدیلی کر رہا ہے وہ اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔

الازین سے شادی کے بعد میٹھو اس کی آئی سے پہلی بار ملا تھا اور وہیں اپنی توقع کے مطابق ہٹسار پایا تھا۔ میٹھو اپنی کتاب آئی کے گھر بھی لے گیا تھا اور اس نے روزانہ اسے لکھنا جاری رکھا تھا لیکن اس کی حیرت کی انتہائی تھی کہ اس کا لکھا ہوا تبدیل ہو جاتا تھا اور وہ کسی مشکوک شخص کو پکڑ نہیں پایا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو کسی تنہائی کی جگہ میں بیٹھ کر کتاب ترتیب دیتا تھا اور نیند آنے تک لکھتا رہتا تھا اور جب وہ سو کر اٹھتا تھا تو اس کا لکھا ہوا تبدیل ہو چکا ہوتا تھا۔ میٹھو کو لگتا تھا جیسے وہ روح جو اس کی تحریر کو تبدیل کرتی ہے وہ اس

سے نفرت کرتی ہے۔ میتھو کو یہ دکھ تو تھا کہ اس کا لکھا ہوا تبدیلی کیا جاتا تھا لیکن یہ بھی اطمینان تھا کہ اسے ایک ذاتی ایڈیٹر ملا ہوا ہے جو بلا معاوضہ خدمات انجام دیتا ہے جب وہ لازین کی آئی کے گھر سے واپس آئے تو میتھو نے محسوس کیا کہ لازین اس سے کچھ کھینچ رہی تھی۔

”لازین!“ اس نے ایک دن لازین کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....“

”کیوں نہ کچھ دن کے لیے ہم کسی پرغضا مقام پر گھومنے چلیں؟“

”تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“ لازین نے پوچھا۔

”ہوائی کے علاقے موئی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن ہم وہاں کیا کریں گے؟“

”وہ جگہ بہت خوبصورت ہے ہم آکس لینڈ پر پہلی کا پٹر سے چکر لگائیں گے اور حنا جانے والے روڈ پر درمیان راستہ کریں گے جس کے ایک طرف سرسبز پہاڑ ہیں اور دوسری طرف نیلا سمندر وہاں کے منے منے کھانے کھائیں گے اور روہاں کی پہاڑیوں کی بلندیوں سے دنیا کا خوبصورت ترین طلوع آفتاب دیکھیں گے۔“

”اوہ..... یہ سب تو کسی خواب جیسا ہوگا۔“ لازین نے کہا۔

”اس سے بھی اچھا۔“

”ہاں..... تو پھر کب چلنا ہے؟“ لازین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارا سیکنڈ ہنی مون ہوگا۔“ میتھو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں..... بالکل.....“

میتھو نے جلد ہی تمام انتظامات کر لیے اور موئی دو ہفتے رکنے کا انتظام کر دیا لائٹ ہاؤس ریسٹورنٹ کو منیجر کے حوالے کیا، گھر لاک کیا اور سامان پیک کر کے لازین کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچ گیا جہاں پتہ چلا کہ ان کی فلائٹ دو گھنٹے لیٹ ہے میتھو نے کتاب میں ایسا دن وقت ایئر پورٹ کے کیفے ٹیریا میں گزارا تھا۔

رات دس بجے وہ موئی پہنچے تھے نیند سے چھوٹی آنکھیں

بوجھل ہو رہی تھیں وہ جلد ہی اپنے ہوٹل میں سونے لیٹ گئے تھے۔ The book keeper میتھو کے پہلو میں موجود تھی جس میں وہ کل ہونے والے واقعات لکھ چکا تھا۔

”کل ہم یہاں کا مشہور طلوع آفتاب دیکھنے جا رہے ہیں نا؟“ اس نے لازین سے پوچھا۔

”ہاں ضرور۔“

”اس کے لیے ہمیں صبح تین بجے یہاں سے روانہ ہونا ہوگا۔“

”پھر تو ہمیں فوراً سو جانا چاہیے ابھی رات کے دس بجے ہیں۔“ لازین نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ لازین نے جواب دیا وہ جلد ہی سو گئے تھے۔

دوسری صبح کھڑی کا الارم بجاتا میتھو نے الارم بند کر دیا اور پھر سو گیا لازین نے بھی الارم کی آواز پر کروٹ بدلی تھی لیکن وہ بھی دوبارہ سو گئی تھی۔ پھر دن پڑھے جب سورج کی روشنی کھڑکی سے گزر کر ان کے چہروں پر پڑی تھی تو میتھو ہلکا سا اٹھا تھا اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے The book keeper نکالی تھی اور آج کے واقعات پر نظر ڈالی تھی۔ ایک بار پھر اس میں واقعات کو تبدیل کیا گیا تھا میتھو نے لاچارگی سے ہاتھوں کو جنبش دی جیسے وہ کچھ نہیں کر سکتا ہو اس نے یہ معاملہ قسمت پر چھوڑ دیا تھا اس نے سوچا ممکن ہے قسمت میں ایسے ہی ہونا لکھا ہوا ہو۔

کتاب میں ”روح“ نے لکھا تھا کہ میتھو اور لازین ایک مقامی جگہ ”ہائی“ میں ناشتہ کریں گے اور پھر آگے حنا کے روڈ پر سفر کریں گے۔ میتھو نے اس کے آگے ہتھ پڑا ڈال دیئے تو اس نے سوچا یہ مصروفیت بھی یقیناً خوشگوار رہے گی۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ اچانک میتھو کو لازین کی آواز سنائی دی تو اس نے جلدی سے کتاب بند کر دی۔

”کیا تم پھر اپنی کتاب پر کام کر رہے ہو؟“

”ہاں..... بس تھوڑا سا کام تھا۔“

”اچھا“ تو بتاؤ آج تمہاری مصروفیت کیا ہوگی کیونکہ طلوع آفتاب کا وقت تو ہم نے سو کر گزار دیا۔“

”میرا خیال ہے میں آج حنا کے روڈ پر سفر کر رہا ہوں۔“

”کسا کہتی ہو؟“ میتھو نے کہا۔

”مجھ پر تو اسی کا۔“

”دلوں نے لباس تبدیل کیا تھا اور ناشتہ کرنے کے لیے ”ہائی“ گئے تھے کھانے میں کئی چیزیں تو ان کی جانی پہچانی تھیں لیکن کچھ ان کے لیے بالکل نئی تھیں پھر حاکم روڈ پر سفر کرنے سے پہلے وہ الازین کی فرمائش پر ایک سپر مارکیٹ بھی گئے تھے کیونکہ وہ راستے میں کھانے کے لیے کچھ چیزیں لینا چاہتی تھی۔ پھر وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے جہاں وادی کے قدرتی آبشار ان کے منظر تھے الازین یہ قدرتی دیکش مناظر دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماری ہی تھی اور میتھو اس کی خوشی میں خوش تھا۔

لووا ٹیوب (Hanna lava tube) تک پہنچ گئے اور
لاوے سے بنے ہوئے غاروں میں چلتے ہوئے دور تک نکل
گئے یہ غار 1000 میل تک پھیلے ہوئے تھے اور سمندر تک
چلے گئے تھے الا زین نے وہاں سے کالے رنگ کے کچھ پتھر
اٹھا کر اپنی جینز کی جیبوں میں رکھ لیے تھے اسے اپنا بچپن یاد
آ گیا قنادہ اکثر بچپن میں ایسی حرکتیں کرتی تھی۔
”اب بہت دیر ہو گئی ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“
الازین نے میتھو سے کہا۔

”ہاں بولو۔“

”مجھے کچھ پھلوں کے جوڑ لادو۔“

”اوکے۔۔۔۔۔“ میتھو نے کہا اور الازین نے بتایا کہ اسے کن کن پھلوں کے جوس چاہیے۔

میتھو جب پھلوں کے جوس لے کر واپس آیا تو الازین کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں وہ کتاب تھی جو میتھو لکھ رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ الازین نے پوچھا۔

”کیا؟“

”یہ کتاب The book keeper یہ اس میں کیا لکھا ہے؟“ الازین کے لیے میں ناراضگی تھی۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ میتھو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ضرور بتاؤ۔۔۔۔۔ میں چاہتا تھا جانتی ہوں کہ اس کتاب میں وہی باتیں کیوں لکھی ہیں جو میری زندگی میں پیش

آ رہی ہیں؟“

”ایک لمبی کہانی ہے اور ناقابل یقین بھی ہے، تمہیں زندہ اور خوش رکھنے کے لیے مجھے یہ کتاب روز لکھنا ہوتی

ہے۔“ میتھو نے کہا۔

”کیا؟ یہ کیا حقائق ہے؟ میں نے اور لوگوں کی محنتیں بھی کئی ہیں۔ لیکن ایسی امتحانہ بات میں نے پہلے کبھی نہیں

سنی۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔۔۔۔۔ اگر میں کبھی اسے لکھتا بھول جاؤں تو تمہاری زندگی میں کوئی خوفناک واقعہ ہو سکتا ہے۔ تم

شدید بیمار پڑ سکتی ہو۔۔۔۔۔ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا تم کسی دوسرے کی زندگی پر کنٹرول چلا سکتے ہو؟ تمہارا خیال ہے میری زندگی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب تمہارا امر ہون منت ہے؟“

”میری بات سنو۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں سننا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان جو محبت ہے وہ بھی تمہاری پلانٹ کی ہوئی ہے اور میرے پاؤں میں جو موج آئی ہے وہ بھی تمہاری اختراع ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ میری وجہ سے نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں نے کبھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔“

”تم اب تک مجھے بے وقوف بناتے رہے ہو۔“

”یہ بات نہیں اس کتاب کے ساتھ کچھ طاقتیں ہیں جو میرے کنٹرول میں نہیں ہیں۔“ میتھو نے سمجھایا۔

”چپ ہو جاؤ۔۔۔۔۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔“

”میں سعادتی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں تمہیں بتا دوں۔“

”میں واپس جا رہی ہوں۔“

”تم کہاں جاؤ گی؟“

”میں واپس گھر جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں نیا کفٹ خرید لوں گی۔“

”الازین رکو۔۔۔۔۔ میری بات سنو۔“ میتھو نے اسے آواز دی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں لو یہ واپس لو۔“

الازین نے شادی کی انگوٹھی اتار کر اس کی طرف اچھال دی اور کمرے سے نکل گئی۔

الازین کے جانے کے بعد میتھو کی دنیا اندھیر ہو گئی اس کے سارے خوف اس کے سامنے سچائی بن کر کھڑے تھے اس کے ناچاہنے کے باوجود الازین اسے چھوڑ گئی تھی وہ کتاب کے قریب گیا لیکن اسے کھولا تاکہ دیکھ سکے کہ یہ ہونے والا

نیا واقعہ اس میں درج ہے اور وہ واقعہ درج تھا جو میتھو نے نہیں لکھا تھا۔

”اوہ خدایا۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے کتاب ایک کونے میں بچ دی۔

☆

الازین کے جانے کے بعد میتھو کی زندگی بھی پرانی ڈگر پر چل نکلی تھی وہی اداسی، سستی بے پرواہی اس کی زندگی میں پلٹ آئے تھے وہ کافی عرصے اسی کیفیت میں جتلا رہا پھر اس نے اپنی زندگی میں الازین کو واپس لانے کے بارے میں

سوچا اور ایک بار پھر The book keeper کو کھولا۔

”اوہ مسٹر گھوسٹ۔۔۔۔۔ اگر تم مجھے میری زندگی سنوارنے کا موقع دو تو میں تمہارا مشکور ہوں گا میں اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے زیر لب کہا اور پھر چند

ہفتوں کے بعد وہ واقعی خود کتاب میں لکھ رہا تھا اس نے آنے والے کل کے لیے واقعات لکھنا شروع کیے تھے کیونکہ آج کے واقعات پہلے ہی لکھے چا چکے تھے۔

ریسور اٹھا کر ایک نمبر ڈال کیا۔

”الازین..... کوئی تم سے ملنا چاہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اسے تمہاری طرف سے کسی کتاب کے سلسلے میں کوئی ای میل ملی ہے۔“

”ٹھیک ہے بھیج دو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کیا تمہیں ان کا آفس معلوم ہے۔“ ریسپنڈ نے پوچھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ میٹھو نے کہا اور آفس کی طرف بڑھ گیا۔

”ہیلو الازین۔“

”ہائے میٹھو۔“

”تم کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟“

”گڈ سنو میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“

”میٹھو..... میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے میرا ایک رائٹر مجھ سے ملنے آ رہا ہے..... تمہیں یہ کیسے پتا چلا جو تم نے اس بات کو استعمال کیا؟“ الازین نے پوچھا۔

”میں نے اندازے میں دیکھ کر چلا یا تھا اتفاق سے وہ نشانے پر لگ گیا۔“ میٹھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”دراصل جہاں تک میں جانتا ہوں یہ کتاب میرے والد نے اس دن سے لکھا شروع کی جب تم پیدا ہوئی تھیں اور اس کے بعد وہ ہر روز اسے لکھتے رہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا میں اس کتاب کی وجہ سے زندہ ہوں؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہا..... میرا مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں پہنچنے والے کسی نقصان سے بچا سکا ہوں۔“

”چلو..... اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو میرے انکل کیوں فوت ہوئے؟“ الازین نے پوچھا۔ ”میرے پاؤں میں موج کیوں آئی؟“

”یہ سب میری وجہ سے نہیں ہوا دراصل کچھ طاقتیں ہیں جو میرے کنٹرول میں نہیں ہیں وہ یہ کتاب لکھ رہی ہیں۔“

”مجھے تمہارا یقین نہیں ہے۔“

”میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ روح بھی وہ کتاب لکھ رہی ہے۔“

الازین صبح اٹھی تھی تو اس کے ذہن میں میٹھو کی یادیں جاگ رہی تھیں وہ اپنے آفس گئی اور اپنی دفتری ذمہ داریاں پوری کرنے لگی لیکن میٹھو کو داغ سے نہ نکال سکی جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کے دل کی بے قراری بڑھتی گئی۔

اچانک اس کے فون کی بیل بجی۔

”الازین ہیلو۔“

”الازین کوئی تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ ریسپنڈ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”کون ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ اسے کسی کتاب کے سلسلے میں تمہاری

میل ملی ہے۔“

”ٹھیک ہے اسے میرے آفس میں بھیج دو۔“

کچھ ہی دیر بعد میٹھو اس کے آفس میں موجود تھا۔

”ہیلو الازین۔“

”ہائے میٹھو۔“

”تم کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”گڈ سنو میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں اور جو کچھ میں نے کیا اس کی وضاحت بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

الازین نے بے اعتباری سے میٹھو کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر غصہ تھا لیکن وہ اندر سے خوش تھی کہ میٹھو اسے منانے آیا ہے۔

میٹھو نے کل کے لیے واقعہ لکھنا ختم کیا اسے امید تھی سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے اس نے لکھا ہے اور الازین اس سے راضی ہو جائے گی دوسرے دن الازین سے ملنے سے پہلے جب وہ گھر سے نکلا تو اس نے کتاب میں لکھا ہوا واقعہ پھر چیک کیا وہ ویسے ہی لکھا تھا جیسے اس نے درج کیا تھا۔

”کیا الازین اپنے آفس میں ہے؟“ اس نے ریسپنڈ سے پوچھا۔

”میں چیک کرتی ہوں..... کیا آپ کا اپائنٹمنٹ ہے؟“

”نہیں.....؟“

”آپ کو ان سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا ہوگا۔“

”مجھے کتاب کے سلسلے میں ایک ای میل وصول ہوئی تھی۔“

”ٹھیک ہے میں انہیں بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور

”روح؟ میرا خیال ہے تم واپس چلے جاؤ۔“
 ”نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم میری دنیا ہو۔۔۔۔۔۔“
 میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔“ میتھو نے کہا وہ دیکھ رہا تھا کہ
 الازین کی آنکھوں میں آنسو جھلما رہے تھے۔

”میں کہتا ہوں کہ ہمیں ملانے والی وہی کتاب ہے لیکن
 مجھے اس پر بھی یقین ہے کہ قسمت بھی اپنی چال چل رہی
 ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے ایک موقع اور دو پلیز۔“ میتھو نے التجائی۔

”تو پھر کیا ہوگا؟ میری زندگی تمہارے اختیار میں
 گزرے گی میں ایک کٹھ پتلی ہوں گی اور تم کٹھ پتلی بنجانے
 والے۔“

”میں جانتا ہوں یہ سب سمجھنا بہت مشکل ہے لیکن کوئی نہ
 کوئی بہتری کی صورت نکل آئے گی۔“

”تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن میں نہیں جو
 کچھ گزر گیا۔ وہ گزر گیا۔۔۔۔۔۔ وقت کو واپس نہیں لایا
 جاسکتا۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے تم بھی واپس چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔“ الازین
 نے ادا سی کہا۔

”پلیز۔“ میتھو نے پھر التجائی۔
 ”تم واپس چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔ تم یہاں ایک رائٹر کی حیثیت

سے آئے ہو لیکن اس حیثیت سے تمہیں کون جانتا ہے کیا یہ
 سب تمہارے لیے محض ایک کھیل ہے؟ تم کیوں میرے
 زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو؟ تم نے جو کچھ کیا تم کو اس پر فخر
 ہے؟“

”نہیں۔“
 ”جاؤ۔۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔۔“ الازین نے کہا اور میتھو

لڑکھاتے قدموں سے اس کے آفس سے نکل گیا۔
 گھر پہنچنے کے بعد بھی الازین کی ہاتھیں اس کے دماغ
 میں گھوم رہی تھیں اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ الازین نے اس
 سے تعلق ختم کر لیا ہے وہ اس غم کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس
 نے ایک بار پھر زندہ رہنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا ایک
 بار پھر قسمت آنے کا ارادہ کیا اور کتاب کا اگلا صفحہ لکھنے بیٹھ
 گیا۔

اگلی صبح جیسا کہ اس نے لکھا تھا وہ الازین سے ملنے پہنچ
 گیا۔

”گڈ مارننگ الازین۔“
 ”میتھو؟“ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اسی وقت ایک

فحش ہاتھ میں دو کپ پکڑے کمرے میں داخل ہوا اور اس
 نے ایک کپ الازین کی ٹیبل پر رکھ دیا۔
 ”یہ تمہاری کافی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ اب یہاں ایک ویٹر بھی آ گیا ہے؟“ میتھو
 نے مسکراتے ہوئے الازین سے پوچھا۔

”نہیں میں ویٹر نہیں ہوں۔“ آنے والے نے جواب
 دیا۔

”تم دونوں ساتھ ہی ہوتے ہو؟“ میتھو نے فکی انداز
 میں پوچھا جس پر الازین نے انہیں ثابت میں سر ہلایا۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔ اچھا۔“ میتھو نے کہا اور آفس سے نکل گیا۔
 ”میتھو۔۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔۔“ پیچھے سے الازین نے اسے آواز

دی۔
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔ بولو۔“ اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

”میں معافی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ امید کرتی ہوں کہ تمہارے
 سارے خواب سچ ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ تم نے میرے لیے جو کچھ بھی
 کیا اس کے لیے تمہارا شکریہ۔“

”فخر رہو۔“ میتھو نے جواب دیا اور آفس سے نکل
 گیا۔

گھر جا کر وہ اسٹڈی روم میں گیا تھا اور کرسی پر اداس بیٹھا
 سوچ رہا تھا کہ زندگی میں بھی کوئی خواب سچ ہو جاتا ہے لیکن
 زیادہ تر خواب تو ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں
 اس کی زندگی میں بھی بہت سے ڈراؤنے خواب آئے تھے
 اچانک اسے لگا جیسے الازین کی خوبصورت ٹیلی آنکھیں بدلتی
 بھڑکی آنکھوں میں تبدیل ہو گئی ہوں اس کے لیے سیاہ بال
 بوئے بوئے کانٹوں میں بدل گئے ہوں اور اس کے سرخ
 ہونٹ سیاہ لکیریں بن گئے ہوں اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ
 بھول جائے۔

اگلے روز وہ بے دلی سے تیار ہو کر لائن ہاؤس
 ریسٹورنٹ چلا گیا تھا جہاں اس کا دل بہت اداس گزرا تھا کسی
 کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا اسے زندگی نے دھوکا دیا تھا
 جو کہانی وہ خود لکھ رہا تھا اس کا انجام بھی اس کی توقع کے خلاف
 ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اس کا دماغ
 کہہ رہا تھا کہ اسے الازین کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے
 لیکن اس کا دل ضد کر رہا تھا کہ الازین اس کا پیار ہے اسے
 اس کی غلط فہمی دور کر کے اسے اپنا لینا چاہیے لیکن وہ اس کی کوئی

ہوا کہ وہ اس کی الازین ہے اس کے جسم کی خوشبو اس کے بال کی آواز.....

”الازین“ کیا یہ تم ہو؟“ میتھو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

”میں تمہیں ابھی اسپتال لے جا رہا ہوں۔“ میتھو نے کہا اور اسے کار سے باہر نکال دے جاتا تھا کہ ایسا کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے لیکن وہ اسے بے بسی سے سڑک پر مڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا اس نے الازین کو اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا تھا اور کار تیز رفتاری سے چلاتا اسپتال کی ایمرجنسی سیکشن پر پہنچ گیا تھا۔

”میلپ..... پلیز میلپ.....“ اس نے کار سے اترتے ہوئے چیخ کر کہا تھا اور اسپتال کا عملہ اسٹریچر کے ساتھ اس کی طرف لپکا تھا چند ہی لمحوں میں الازین کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا تھا اور میتھو وینک روم میں بیٹھا بے چینی سے کسی اچھی خبر کا انتظار کر رہا تھا مگر گزرنے والا لمحہ اسے الازین سے دوری کا احساس دلایا تھا اس وقت کچھ بھی ممکن تھا ڈاکٹر آ کر اسے الازین کی موت کی خبر بھی دے سکتا تھا لیکن وہ اپنی زندگی الازین کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا وہ اسے تکلیف میں دیکھنے کے بجائے اس کے ساتھ مرجانا پسند کرتا تھا وہ بچھتا رہا تھا کہ اس نے کئی دن سے The book keeper کو کھول کر نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کیا لکھا تھا اگر وہ پڑھ لیتا تو شاید اس ہونے والے حادثے کو روک لیتا اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے لیکن شاید اب وقت گزر چکا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ جائے اور کتاب میں لکھی ہوئی عبارت کو تبدیل کر کے قسمت کا رخ موڑ لے لیکن کیا اب وہ ایسا کر سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا پھر بھی وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اس نے گھر جانے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر اس کے جانے کے بعد الازین کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گا؟ اسی وقت ایک ڈاکٹر اس کی طرف آیا۔

”مسٹر میتھو میسر؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”ہیں ڈاکٹر۔“

”بچی خیریت سے ہے لیکن ماں کی حالت ٹھیک نہیں لگتی

اس کے جسم کے زیادہ اعضا ختم ہو چکے ہیں اور خون بہت

ضائع ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور میتھو مایوسی سے واپس

بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی ایک نہ ختم ہونے والی جنگ اس کے اندر شروع ہو گئی تھی جس کا حل صرف اور صرف الازین کے پاس تھا وہی اسے اس کیفیت سے نکال سکتی تھی۔

پھر کئی روز اسی کیفیت میں گزر گئے تھے وہ خود میں ہمت پیدا نہیں کر سکا تھا کہ پھر الازین کے پاس جائے اور اپنے عمل کی وضاحت کرے ایک رات کو لائٹ ہاؤس ریٹورنٹ بند کر کے واپس گھر آ رہا تھا جب وہ گزیم اسٹریٹ پر مڑا تو اس کی نظر دو کاروں پر پڑی جو ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں طبی جماعت ابھی تک موقع پر نہیں پہنچی تھی لگتا تھا کہ ایک سیڈنٹ ابھی ہوا ہے میتھو نے اپنی کار ایک سمت کھڑی کی اور کار سے اتر گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے قریب سے گزرتے ایک شخص سے پوچھا۔

”پتہ نہیں..... سب کچھ اچانک ہی ہوا۔“ اس نے جواب دیا اور میتھو دوڑتا ہوا حادثے کی جگہ کی طرف بڑھا دونوں کاروں میں سے ایک بلیک تھی بالکل الازین کی کار لگ رہی تھی کار کے اندر جو عورت بیٹھی تھی اس کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور نیچے جھکا ہوا تھا خاتون حاملہ لگ رہی تھی۔ میتھو میں اس کی طبی رضا کار والی روح بیدار ہو گئی حالانکہ وہ عرصہ پہلے یہ کام چھوڑ چکا تھا۔

”ہیلو مس..... آپ کیسی ہیں..... کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ اس نے خاتون سے پوچھا۔

”میں اسپتال جانا چاہتی ہوں..... میرا بچہ.....“ عورت نے کراہتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں..... بس طبی عملہ آتا ہی ہوگا..... ایبولینس کے لیے کال کر دی ہے..... بس تھوڑی دیر لگے گی۔“ میتھو نے کہا۔ اور عورت کو کھانسی آئی اس کے منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

”بس..... تسلی کرو..... میتھو نے آگے بڑھ کر عورت کا ہاتھ تھام لیا عورت دوبارہ کھانسی۔

”مجھ سے بات کرو..... تم کیا کرتی ہو؟“ میتھو نے اسے مصروف رکھنے کے لیے پوچھا وہ چاہتا تھا کہ عورت ہوش میں

رہے۔

”میں ایک پبلشنگ کمپنی میں کتابیں پڑھتی ہوں۔“ عورت نے جانی پہچانی آواز میں کہا اچانک میتھو کو احساس

کری پر گر گیا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔
 ”اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ ڈاکٹر سے پوچھا۔
 ”ہاں“ تم مل لو۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا پھر ڈاکٹر اس کے
 ساتھ ہال سے گزرتا الا زین کے کمرے تک آیا تھا اور میتھو
 کمرے میں داخل ہو گیا تھا الا زین کے چہرے پر بہت سے
 زخم تھے وہ بہت تکلیف میں تھی لیکن میتھو کے لیے وہ اب بھی
 وہی خوبصورت الا زین تھی جسے دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا
 جاتا تھا۔

”ہیلو الا زین۔“

”ہائے میتھو۔“ الا زین نے کپکپاتی آواز سے کہا اور
 میتھو سوچنے لگا کہ کبیں الا زین اسے ہی اس صورت حال
 کا ذمہ دار تو نہیں سمجھ رہی ہو۔
 ”تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک..... تم کیسے ہو؟“

”تم جیسا۔“ میتھو نے کہا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ
 رہے تھے الا زین کے چہرے پر اداس مسکراہٹ کھڑکی میتھو
 کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے کیونکہ اس کے پاس کہنے
 کو بہت کچھ تھا لیکن وہ سب کہنے کے لیے وقت نہیں تھا میتھو
 نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور الا زین نے بھی کوئی
 مزاحمت نہیں کی بلکہ میتھو کو یوں لگا جیسے وہ اس سے جدا نہیں
 ہونا چاہتی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں لیکن جو کچھ ہوا میں
 اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“ میتھو نے کہا۔
 ”نہیں“ ٹھیک ہے یہ تمہاری غلطی نہیں ہے۔“ الا زین
 نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے سے گزرتے ہوئے کہا اور پھر وہ
 سیدھا کھڑا ہو گیا الا زین اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی
 آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

”مجھے انسو ہے جب تمہیں میری ضرورت تھی تو میں
 وہاں نہیں تھا..... میں یہ سب ٹھیک کر دوں گا..... بس تم مجھے
 کچھ وقت دو۔“ میتھو نے کہا۔

”نہیں..... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ الا زین نے کہا اور
 اسے پھر کھاسی آئی۔

”ہوگا..... ضرور ہوگا..... میں تمہیں دکھاؤں گا..... بس
 میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔“ میتھو نے کہا اور
 دروازے کی طرف بڑھا۔

”اگر میں تم سے کہوں کہ The book keeper ایک بہت بڑا دھوکا ہے تو تم کیا کرو گے؟“
 الا زین نے کہا اور میتھو کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے
 قدم رک گئے۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”یہ بہت لمبی کہانی ہے..... اور میرے پاس زیادہ وقت
 نہیں..... میں ایک ایسی کہانی کے لیے کام کرتی ہوں جو لوگوں
 کی خواہشات پوری کرتی ہے چاہے وہ محبت حاصل کرنا
 چاہے ہوں یا اولاد..... وہ یہ کام میں لے کر کرتے ہیں لیکن
 بد قسمتی سے لوگوں کو ان کی مطلوبہ چیز تو مل جاتی ہے لیکن
 بدلے میں انہیں سب کچھ کھونا پڑتا ہے یہ اس کہانی کا اصول
 ہے تمہارے لیے انہوں نے منتخب کیا تھا“ کتاب کو اور تمہیں
 آزادی تھی کہ جو چاہو اس میں لکھو اور وہ تقدیر کا لکھا معلوم
 ہوا اور اس میں کوئی ایک کردار ہو جس پر تمہیں اختیار ہو جب
 تک تم چاہو ہر روز کہانی کی طرف سے ایک شخص مقرر ہوتا تھا
 کہ تمہارا لکھا ہوا پڑھے اور اسے سچ دکھانے کے لیے مواقع
 فراہم کرے یا عبارت میں تبدیلی کر دے وہ مجھے بھی
 بتاتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے اور میں وہ یاد کر لیتی تھی
 چنانچہ سب کچھ سچ نظر آتا تھا۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ میتھو نے کہا۔

”یہ سچ ہے۔“ الا زین نے کہا۔

”کیا یہی وجہ ہے کہ The book keeper

کبھی مجھے اس جگہ نہیں ملی جہاں میں اسے رکھتا تھا۔“

”ہاں یہ سچ ہے..... لیکن تمہیں اس حقیقت کا پتہ نہیں

چلتا تھا..... براہ تم جان گئے ہو۔“

”تم اس کہانی کا حصہ کیوں بنیں؟“

”میری آنٹی کے اولاد نہیں ہوتی تھی انہوں نے اس کہانی
 کے ساتھ ایک معاہدہ کیا انہوں نے بتایا کہ آنٹی کو ہر کسی
 کو چھوڑنا پڑے گا اپنی تمام فیملی کو اور انکل کو بھی آنٹی نے بہت
 التجا میں کہیں کہ انکل کو کچھ نہ ہو تو کہانی نے یہ معاہدہ کیا کہ
 جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں کہانی کے لیے کام کروں گی
 اور جہاں تک میں بھی ہوں تمہارے والد نے بھی ان کے
 ساتھ ایسا ہی معاہدہ کیا ہو گا کہانی کے مطابق ان کا خیال تھا کہ
 شاید تم اپنی زندگی میں کوئی محبت کرنے والا نہ پاسکو گے چنانچہ
 مجھے فراہم کر دیا گیا..... دیکھو کتنا اچھا پڑنس ہے انہیں ایک ہی

موقع سے کلائٹ اور اہمائی مل جاتے ہیں مجھے اس بات کا علم تب تک نہیں ہوا جب تک میں کالج میں نہیں پہنچ گئی میں نے کہنی کو کوئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اس کام میں ان کی شریک نہیں بننا چاہتی لیکن وہ لوگ میری آغوش اور انگلی کو مارنے کی دھمکیاں مجھے دیتے رہے اور کام کرواتے رہے۔

”تو یہ اسٹوری سچی ہے؟“ میٹھو نے پوچھا۔

”ہاں اور اب بھی میرا ایکسٹنٹ اتفاق نہیں ہے میں اس راستے کو چھوڑ دینا چاہتی ہوں یہ اس کی ہی سزا ہے۔“ الازین نے کہا اور میٹھو کے سینے میں غصے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا تم واقعی میرے والد سے اتفاق دیتی تھیں یا یہ بھی کوئی چال تھی؟“ میٹھو نے پوچھا۔

”وہ اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے کہی بارٹنے آئے تھے۔ ہم نے مل کر سب باتیں طے کی تھیں کہ میں تمہاری زندگی میں کب..... کیسے..... اور کہاں داخل ہوں گی اور پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”تو اگر میں اس صبح اپنے گھر سے نہ نکلتا جب تم سے پہلی بار ملا تو وہ واقعہ نہ ہوتا؟“

”وہ لوگ کتاب میں لکھے کو تبدیل بھی کر دیتے ہیں یہ ان کے لیے آسان ہے تمہارے گھر کے باہر کہنی کی ایک ٹیم موجود رہتی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ تم کب کہیں جانے والے ہو۔“ الازین نے کہا اور میٹھو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب سچ ہو سکتا ہے۔

”تو کو کیا یہ سب کچھ دھوکا تھا..... ایک چال تھی؟“ میٹھو نے پوچھا۔

”نہیں..... شروع میں تو یہ محض ایک کام تھا جسے پورا کر کے میں آزاد زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن پھر مجھے تم سے واقعی محبت ہو گئی کہنی کو یہ چلاؤ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں اور کوئی دوسرا کام لے لوں میں نے انکار کر دیا اور ان سے کہا کہ میں کہنی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی اور تمہارے ساتھ آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہوں پھر میرے اور ان کے درمیان بحث چلتی رہی اور آخر کار میں نے تم سے شادی کر لی تو انہوں نے میرے انگلی کو مار دیا اور مجھے دھمکیاں دیں کہ اگر میں بازنہ آئی تو وہ میری آغوش

کو بھی مار دیں گے تب میں نے کتاب کا ڈرامہ کیا اور تم پر ظاہر کیا کہ مجھے ابھی علم ہوا ہے کہ تم کیا لکھتے ہو اور تم سے ناراض ہو کر تمہیں چھوڑ آئی تاکہ تمہیں کچھ نہ ہو..... میری آغوش کو کچھ نہ ہو..... میرا خیال ہے تمہیں مجھ سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے..... میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں اپنے کیے پر شرمندہ نہ ہوئی ہوں تم میرے لیے میری دنیا ہو..... مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔“ الازین نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میٹھو اس کے سامنے بیٹھا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اسے لگا جتنا وہ مجرم تھا اتنی ہی الازین بھی تھی لیکن وہ دونوں تو کٹھ پتلیاں تھے وہ چاہتا تھا کہ الازین اس کے لیے ایک مکمل مجبور ثابت ہو اور اس کی ہو کر رہے اور دوسری طرف الازین چاہتی تھی کہ وہ اس کا ہو جائے لیکن میٹھو کتاب میں اپنی خواہشات لکھتا تھا اور الازین کہنی کے اشارے پر ان خواہشات کی تکمیل کرتی تھی۔

”میں نے تمہیں معاف کر دیا اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔“ میٹھو نے کہا۔

”میں چاہتی تھی کہ میں تم سے عام حالات میں ملوں..... میں واقعی تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“ الازین نے کہا اور میٹھو نے جبکہ کراس کا ہاتھ چوم لیا الازین نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”مجھ سے ایک وعدہ کرو؟“

”بولو۔“

”میری بیٹی کا خیال رکھو گے..... یہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ میٹھو نے کہا اور الازین کو پھر کھانسی آنے لگی۔

”الازین..... تم ٹھیک تو ہوتا؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔

”ہماری کہانی کا انجام کتنا قریب ہے الازین؟“ کیا دنیا میں ہماری کہانی امر ہو جائے گی؟“ میٹھو نے پوچھا۔ ”ہاں ممکن ہے..... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہیں اچھی آمدنی ہو جائے۔“ تو تم کیا کرو گے اگر اس کی فرخست سے تمہیں ملین ڈالر مل جائیں؟“

”ون ملین والڈرنیس..... ون ملین الفاظ“ میتھو نے کہا۔ ”اگر مجھے ون ملین الفاظ مل جائیں تو میں خواہش کروں گا کہ ایک بار پھر تمہاری کار سے میرا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور میں پھر تمہاری خوبصورت ٹانگیں روڈ پر پڑتے ہوئے دیکھوں جب تم اپنی کار سے اتر کر مجھے دیکھنے آؤ..... میں تمہیں پھری فوڈ ریسٹورینٹ لے جاؤں..... تمہارے ساتھ رات گزاروں..... تمہیں پھر لائٹ ہاؤس میں بلاؤں..... تم سے پیار کروں..... اور تمہارے دل کا شہزادہ بن جاؤں..... میں تمہاری دلکش مسکراہٹ دیکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں..... تم سے شادی کر کے پھر تمہیں اپنے ساتھ ہوائی لے جاؤں تمہارے ساتھ موٹی گھوموں.....“

”میتھو.....“ الازین نے اسے پکارا اور وہ اسے دیکھنے لگا۔

”تمی جس کا آخری صفحہ کھلتا تھا جس پر اس کی بیوی کی زندگی ختم ہونے کے کل کے واقعات لکھے تھے۔ الازین کے مرنے کے کئی دن بعد تک وہ گھر کے اطراف میں پاگلوں کی طرح پھرتا رہا تھا کہ وہاں کسی قسم کے کسے تو نہیں لگے جن میں اس کی اور الازین کی تصاویر محفوظ کی گئی ہوں..... کوئی افراد تو نہیں جو الازین کے بیان کے مطابق کسی کمپنی کی طرف سے وہاں سامور کے گئے ہوں..... کہیں کمپنی کی کہانی جو الازین نے اسے سنائی تھی وہ سچ تو نہیں؟ پھر الازین کے مرنے کے باوجود وہ کتاب اب بھی کیوں لکھی جارہی ہے اس میں الازین کی موت کے واقعات بھی درج ہیں وہ واقعات اسی طرح لکھے گئے تھے جیسے وہ میتھو کے سامنے پیش آئے تھے میتھو کو یوں لگا جیسے The book keeper ایک سچائی ہے جسے الازین کے لیے ہر حال میں لکھا جاتا ہے کہیں اس وجہ سے ہی الازین نے مرنا پسند نہ کیا ہو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سمجھے اسے یقین تھا کہ کہانی ختم ہوگئی ہے بس اب اس کہانی کو پبلش ہوتا تھا۔

دوسری صبح جب وہ سوکر اٹھا تو بیبی کے جمولے کے قریب گیا۔ اسے دیکھا وہ سورہی تھی اور بالکل اپنی ماں کی طرح خوبصورت تھی اس نے واپس اسے جمولے میں لٹا دیا اور چلتا ہوا اسٹڈی روم میں آیا میز پر..... The book keeper رکھی ہوئی تھی لیکن اس کے برابر میں اتنی ہی موٹی ایک اور سادہ کتاب موجود تھی اس نے نئی کتاب کھولی اور اپنی بیبی ”الازین“ کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی کو پتہ چلے کہ اس کا چاہنے والا اس کی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ بھی اس سے پیار کرے یا پھر وہ جو کہانی لکھ رہا ہے وہ اس سے کوئی کمپنی لکھوا رہی ہو اور وہ زبردستی اس سے محبت کرنے کا پابند ہو؟

میتھو نے بھی اپنے والد کی طرح The book keeper لکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ مجبور تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیبی کو کوئی نقصان پہنچے جو اس کے پاس الازین کی نشانی تھی اس کے پیار کی نشانی تھی اس کے خاندان کی چشم و چراغ تھی وہ اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔



”میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“

”میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں اور.....“ میتھو یکدم چپ ہو گیا کیونکہ اس نے برٹ مونیر کی کمرور پڑتی ہوئی آواز سنی تھی جس کے تار الازین کے جسم سے بچ کیے گئے تھے۔

”الازین.....! الازین.....“ وہ زور زور سے پکارنے لگا لیکن مانیٹر ایک سیدھی لکیر دکھا رہا تھا۔ الازین کا دل رک چکا تھا اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی کمرے میں ڈاکٹر آگئے تھے اور میتھو ایک بار پھر وینٹک روم میں آ بیٹھا تھا۔

”مجھے افسوس ہے..... وہ ختم ہوگئی۔“ ڈاکٹر نے آ کر اسے الازین کی موت کی اطلاع دی اور وہ کرسی پر گر گیا۔ اس کے جسم کی ساری طاقت جیسے کسی نے سلب کر لی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اسے سانس بھی بہت تکلیف سے اور آہستہ آہستہ تھی اس نے اپنی زندگی میں بھی ایسا درد محسوس نہیں کیا تھا وہ کافی دیر اس کرسی پر بیٹھا رہا اور جب وہ کھڑا ہوا تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب بھی بھی اپنی جھلی طاقت نہیں پاسکے گا کیونکہ الازین کے ساتھ ساتھ میتھو بھی مر گیا تھا جو اس کے لیے زندہ تھا اب اسے صرف اپنی بیبی کے لیے زندہ رہنا تھا بالکل ایسے ہی جیسے اس کے باپ نے اس کی پرورش کی تھی۔

اب اس کے گھر میں اس کے ساتھ ایک بیبی تھی اس کی بیبی جس کا نام اس نے الازین رکھا تھا جو واقعی قدرت کا معجزہ تھی اس کے سامنے The book keeper رکھی ہوئی

چاہ عمل

ماہ رخ ارباب

انسان اپنے طور پر خود کو بڑا منصوبہ ساز سمجھتا ہے اور سوچتا ہے کہ کوئی اس کے بچھائے ہوئے جال سے بچ نہیں سکتا لیکن وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ سب سے بڑا منصوبہ ساز اوپر بیٹھا ہے۔

اپنے ہی اعمال کی قاتل ڈور میں الجھنے والی ایک عاقبت نا اندیش کی کھٹا

بہار کی تیز چھتی ہوئی دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ خطر نگاہوں نے گھر میں کسی ذی نفس کو تلاش کرنا چاہا مگر سنا پورے گھر میں چکراتا پھر رہا تھا۔ ایک گہری سانس اس کے چنچے ہوئے لبوں سے زاد ہوئی۔

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد کئی سال تجربہ کی زندگی گزارنے کے باوجود کبھی اسے دوسری شادی کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ اپنے کام اور کتابوں کے ساتھ خوش تھا۔ تھوڑا بہت کھانا خود بنالیا کرتا بھی بکھار منہ کا ذائقہ بدلنے کو ڈھابے کا رخ کرتا اور زندگی یوں ہی گزار جاتی اگر اسے اپنی بیماری کا علم نہ ہوتا ایک انتہائی معتدل زندگی گزارنے کے باوجود ایک بس میٹھا کھانے کا شوق بھاری پڑ گیا۔ اسے کس وقت ڈیپریس نے جکڑا وہ خود لاعلم تھا چند ہی ماہ میں اس کا وزن بہت تیزی سے کم ہوا تھا اور تب ہی تنہائی کے بھوت اسے ڈرانے لگے تھے۔ ان دنوں وہ دوسری شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا اور تب ہی ایک دوست کے توسط سے وہ شاید سے متعارف ہوا جو ایک جوان سال بیوہ اور نو عمر بیٹے کی ماں تھی مگر جہاں نظریہ ضرورت کا فرما ہو وہاں اس قسم کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ دوست کی پیغم جنہیں وہ بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تھا نے شاید کی تحریف کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”دیکھیے مقبول بھائی آپ تمہارے ہیں اللہ کی کوئی مصلحت رہی جو اس نے اولاد جیسی نعمت سے بھی محروم رکھا۔ اب بھائی سے آپ کی محبت ہی کمی جی آپ اتنا عرصہ یونہی گزار چکے مگر انسان کو کسی ناگہانی ضرورت پڑ سکتی ہے کم سے کم گھر میں کوئی دوسرا جی تو ہو۔

اس نے تھکے ہوئے نڈھال وجود کے ساتھ کاؤنٹر کے برابر رکھی کرسی پر کمرنگائی ہڈیوں نے کڑکڑا کر احتجاج کیا۔ کہنے کو تو دکھانداری ایک بظاہر آسان کام نظر آتا ہے مگر دکان اگر کسی مصروف اسپتال کے سامنے واقع میڈیکل اسٹور ہو تو وہی آسان کام ایک مشقت بھری پریڈ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شوگر جیسے مرض کے ساتھ یہ سب سنبھالنا اب دن بدن مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جس قسم کی بیماری میں مبتلا تھا، اسے بے تحاشہ پیاس لگتی تھی اور نتیجتاً فریج حاجت کی خاطر بار بار اسٹور چھوڑ کر جانا پڑتا۔ اسی دوران وہاں موجود لڑکے ہاتھ دکھا جاتے۔ بار بار کے ناکام تجربات کے بعد اس نے خود ہی کاؤنٹر پر کھڑے ہونا شروع کر دیا تھا۔ رش کے دوران حتی الامکان پانی کی ضرورت کو نظر انداز کرتا یہ اور بات اس کا بچہ بعد میں اس کے بیمار جسم کو بھگتا پڑتا تھا۔ کہنے کو تو ایک بیٹا گھر میں موجود تھا جو اگر گاہ ہوتا تو کان سے پکڑ کر یہاں کھڑا کر دیتا۔ مگر پرانی اولاد پر کیا زور؟

اس نے دل گرتی سے سوچا۔

”حق ہا دنیا سے ایمانداری دن بدن ناپید ہوتی جا رہی ہے۔“ زوردار آواز میں خود کلامی کرتے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی کھانے کا وقفہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہی لکڑی کا روغنی دروازہ مانوس سی چرچاہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ روزانہ کی طرح گھر میں چھائے سنائے نے کسی گھر کے فرد کی طرح اس کا استقبال کیا۔ کھلا کھلا بڑا سا محن ادا کر



خوشی میں کی نئی بد پرہیزی راس نہائی اور اسی رات اس کی طبیعت بگڑ گئی اچانک بڑھ جانے والی شوگر کے زیر اثر غنودہ سی کیفیت میں وہ بالکل نہیں جان پایا اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے دن طبیعت مستحکم تو اسے احساس ہوا بھابی کی بات کتنی جلدی صحیح ثابت ہوگی وہ شاہدہ اور منیر کا حد درجہ شکر گزار ہوا۔ مگر جب اسٹور پر مال ڈلوانے کے لیے رقم نکالی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

”شاہدہ“ غیر ارادی طور پر اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”ارے کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ گھبرائی ہوئی سی اندر آئی۔

”یہ دیکھو! اس نے بقایا رقم اس کے سامنے لہرائی یہاں میں نے چالیس ہزار رکھے تھے اب یہاں صرف پندرہ ہزار ہیں مجھے آگے معائنہ کرنی ہے تاکہ مزید اسٹاک لے سکوں اسٹور خالی پڑا ہے یہاں آدھوں آدھ رقم غائب ہے۔“ اس نے پریشانی سے سر پکڑ لیا۔

”ارے تو میں کیا جانوں کتنی رقم رکھی تھی مجھے دکھا کر رکھی تھی کیا ہم تو غیر ہیں آپ کے لیے، ہم سے تو ہر بات چھپائی جاتی ہے اب بھگتو۔“

الٹا چور کو وال کو ڈانٹنے کے مصداق وہ اسے ہی سنا کر چلی گئی۔

اور جلد ہی مقبول احمد کو اپنی چوری شدہ رقم اپنے نے نوٹیلے بیٹے کے ہاتھ میں لہراتے موبائل کی صورت میں نظر آ گئی مگر بیماری کے ہاتھوں کمزور ہو جانے والے اعصاب سے پہلے بھی وہ کوئی لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں تھا۔

اب شاہدہ بیچاری نے بھی عمر جیسے تیسے نکال کر جو ان ہوئے لڑکے کے ساتھ بھابی بھی اسے گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یوں سمجھیں آپ کی ایک ہاں کسی بے کس کے لیے جامے پناہ فراہم کر دے گی۔ بھابی نے سمجھانے میں پورا زور یہاں صرف کر دیا تھا۔

اور مقبول احمد بھابی کی باتوں میں چھپی رمز اچھی طرح سمجھ گیا یہی ان کا مشورہ جتنی برخلوس ہی تھا۔ لیکن یہ فیصلہ مقبول احمد سے زیادہ شاہدہ اور اس کے لڑکے کے مفاد میں رہا۔ انہیں نہ صرف ایک بنانا یا گھر بلکہ مقبول احمد کی صورت میں ایک مٹی کا مادہ بھی مل گیا جو گھر میں کچھ بھی ہوتا رہے چپ چاپ دیکھتا رہتا ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ اس مہربانی اور خلوس کے بدلے میں جو انہیں مقبول احمد سے ملا وہ بھی بدلے میں اسے وہی توجہ اور محبت دیتے اس کی ذمہ داریاں ہانٹنے کی کوشش کرتے مگر اس بات کا احساس نہ انہیں مقبول دلا۔ کہ نہ شاہدہ نے کبھی اپنے بیٹے کو باپ کا سہارا بنانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس کچھ ہی دنوں میں اسے ان وجوہات کا اندازہ ہونے لگا جس کی وجہ سے شاہدہ کے بھائی بھابی نے اتنے عرصے برداشت کرنے کے بعد اچانک اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ کاروبار کے لحاظ سے ایک مصروف ہفتہ تھا اور اسٹور میں اسٹاک ڈلوانے کیلئے رقم علیحدہ کرنے کے بعد بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم منافع کی بد میں بچی تھی جسے وہ بلاشبہ شاہدہ کے قدموں کی برکت سمجھتا تھا اور اسی خوشی میں اس نے نئی نئی بنی ٹیلی کے لیے ٹریٹ کا بندوبست کیا مگر

مقبول احمد نے حقیقی معنوں میں ایک والد کی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی تھی مگر شاہدہ کو تا گوار گزرنی روک ٹوک کے سبب مقبول احمد نے ان ماں بیٹے کے معاملات میں دخل نہ دینا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆☆

پلیٹ ابھی آدمی سے زیادہ بھری ہوئی تھی شکم سیری کا احساس ہوا تو اس نے پلیٹ کو ڈھانپ کر کچن میں رکھ چھوڑا اور پھر پیار کر آ رام سے لیٹ گیا اچانک باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ اس نے ذرا سا جھانک کر دیکھا وہ شاہدہ کا بیٹا منتر تھا۔ ہاتھ میں حسب معمول سلنگٹن ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔ سگریٹ دیکھ کر مقبول احمد کو وہ دن یاد آ گیا جب اس نے پہلی بار اس چودہ پندرہ سالہ بچے کو اپنے کمرے میں چھپ چھپ کر سگریٹ تیار کرتے دیکھا تھا۔ اس دن مقبول احمد اپنے مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی گھر واپس آ گیا اور منیر کے معمولات سے ناواقفیت کی بنا پر اسے گھر میں پا کر اچھا خاصا حیران ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا کمرے کی کھڑکی سے جھلکتے منظر نے اسے سکتے میں ڈال دیا۔ وہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا اپنی ماں کی موجودگی میں گھر میں بیٹھ کر سگریٹ بھڑھاتا تھا۔ مقبول احمد ایک بڑھالکھا عزت دار انسان تھا اس کے خاندان میں دور دور تک کوئی پان سٹکے کا شوقین بھی نہ تھا کجا کہ چرس۔ اس نے غصے سے کانپتے ہوئے اسی وقت شاہدہ کو بلایا اسے لگا کہ شاہدہ اس تمام بات سے لاعلم ہے۔ مگر اپنے اندرونی غصے سے قطع نظر اس نے بہت نرمی سے مخاطب کیا۔

”دیکھو شاہدہ اگرچہ میں اس کا سا باپ نہیں مگر اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں یہ جن راہوں پر چل رہا ہے اس کا انجام سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں اور یہ جس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے گھر میں بیٹھ کر تمہاری موجودگی میں میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تم اسے سمجھا دیا پھر میں کچھ اور سوچوں۔“

اور شاہدہ کا جواب سن کر جیسے خون اس کی رگوں میں ہی جم گیا۔

”مقبول احمد۔“

وہ اس کی تمام بات خاموشی سے سن کر بہت سرد لہجے میں بولی تھی۔

اس کی مرحومہ بیوی جب تک زندہ رہی دونوں مہیاں بیوی یوں شیر و شکر رہے کہ خاندان میں ان کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ مرحومہ کو یاد کر کے مقبول احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

☆☆☆☆

پیٹ میں دوڑتے چوہوں کی بھاگ دوڑ کو مزید نظر انداز کرنا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا باورچی خانے میں دھلے برتن ایک ترتیب سے شفٹ میں سجے تھے۔ صبح کے ناشتے کے برتن جو عموماً دوپہر تک منگ میں موجود ہوتے وہ بھی صاف کر کے رکھ دیئے گئے تھے ورنہ انہیں میں بچا کھیا کچھ پیٹ پوچا کے کام آ جاتا۔ اس نے محن میں نظر دوڑائی۔ شدید پیش سے بننے ہوئے بخارات سے لہریے سے بن رہے تھے۔ وہی لہریے جو صحرانوں کے مسافروں کو سراب میں مبتلا کرتے تھے۔ اس شدید برستی حرارت میں باہر جا کر کچھ کھانے کو لانا یا خالی پیٹ دوبارہ اسٹورنگ جا کر کچھ کھانے کو لینے کی بے احتیاطی کرنا دونوں ہی تجاویز اس وقت ناقابل قبول تھیں۔

خاموشی سے پیر کھینٹا ہوا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ باہر کی تیز روشنی کے مقابلے میں کمرے کا چھایا تنگ ملگجا اندھیرا اس کی دھکتی ہوئی آنکھوں کو بھلا محسوس ہوا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو نیل پر دھری مکشتری پر نظر پڑی جسے دوسری پلیٹ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس نے بے تابی سے اوپر کی پلیٹ ہٹائی۔ خوشنما رنگ برنگے میوہ جات سے سجے چادلوں کی صورت ہی نہایت اشتہا انگیز تھی۔ اس نے بڑا سا جھج بھر کر منہ میں ڈالا خوشبو دار چادلوں کا ذائقہ منہ میں گھلتا چلا گیا اس نے تیزی سے دو تین بڑے بڑے چمچ بھر کر منہ میں ڈالے۔ دل سے بے اختیار شاہدہ کیلئے دعا نکل حالانکہ اس طرح کی مہربانیاں وہ اس پر کم ہی کرتی تھی اور آج کل تو ویسے بھی اس کا مزاج بگڑا ہوا ہی رہتا تھا۔ اس کا لڑکا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ کوئی روک ٹوک نہ ہونے اور شاہدہ کے بے جالا ذیابار کے سبب کچھ ایسی سرگرمیوں میں مبتلا ہونے لگا تھا جو بالکل مناسب نہ تھیں اکثر کالج کے اوقات میں گھر پر پایا جاتا مارے باندھے چلا بھی جاتا اگر مٹھی بھر کر نوٹ اس کے حوالے کیے جاتے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں

”اگر تم نے کبھی اولاد پیدا کی ہوتی کبھی اولاد کی محبت کو سمجھا ہوتا تو میں میرے بیٹے کی معمولی سی حرکت کو کچلا کرتا بیٹھ جاتا ارے

جوانی میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے چوریاں ڈاکے یہ تو معصوم سا لڑکا ہے کون سا اس نے لڑکی بھگائی جو آپ کی عزت قدموں میں آگئی ہائے میرا یتیم بچہ خدا کسی کو یتیمی کا داغ نہ دے۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ سہرا تھوں میں دیئے پھسک پھسک کر رونے لگی تو مقبول احمد خاموشی سے وہاں سے نکل گیا

☆☆☆

اس وقت گھر میں اس کی موجودگی بتا رہی تھی کہ آج بھی کالج کی راہداریاں اس کے باہر کہ قدموں کی دھمک سے محفوظ رہی ہیں۔

مقبول احمد نے خود ہی یہ بات سوچی اور خود ہی اس سے محفوظ ہو کر نرس دیا۔ وہ باور پچی خانہ کھنگال کر اب اپنے کمرے میں جا چکا تھا جیسے میں اچانک ہونے والی جملن نے اسے سمجھا دیا کہ بے احتیاطی رنگ لار ہی ہے اس نے شوگر کنٹرول کی ٹیبلٹ نکالیں اور پانی سے نگل لیں۔

لیکن اس سے بھی کچھ فرق نہ پڑا تکلیف جیسے سینے سے اتر کر معدے تک پہنچنے لگی تھی ایسا درد تو اس وقت بھی نہ تھا جب وہ صبح کا بھوکا گھر تک پہنچا تھا۔ اس نے تکلیف کی شدت کم کرنے کیلئے اٹھ کر ٹھلنا چاہا مگر اسی وقت پیٹ میں اٹھنے والے شدید درد نے ارادہ متزلزل کر دیا وہ وہیں پڑا ہانپتا رہا کچھ ہی دیر میں اس کی یہ حالت تھی کہ اپنے نزدیک رکھا پانی کا گلاس اٹھانا بھی اس کے لیے کار دشوار ہو گیا۔ وہ بے بسی سے ترختے ہوئے لیوں اور خشک ہوتے گلے کے ساتھ سینے اور پیٹ کو مسلاتا ہوا کسی سچا کا شہر تھا۔

اچانک اس کی کمرور پڑتی سماعتوں میں دردناک کھلنے کی آواز آئی اس نے شاہدہ کو آواز دی مگر اتنی بھم آواز خود اس کے کانوں تک رسائی نہ پاسکی لیکن وہ خود ہی اس کی کمرے سے باہر موجود چہل دیکھ کر اندر آگئی۔ مقبول احمد نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کیوں کہ اب اس کی زبان بھی کچھ بولنے لائق نہیں تھی۔ اس نے بمشکل پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن شاہدہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

وہ کچھ بے چین ہوا کہ کس طرح اپنی شریک حیات کو اپنی کیفیت سمجھائے کہ وہ کس عذاب سے گزر رہا ہے اسے مدد کی ضرورت ہے۔ بہت مشکل سے اس نے ہمت مجتمع کی اور اپنی پوری کوشش سے آواز لگائی۔

”میری مدد کرو ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر اس کے سامنے رکھی گھٹیت کر پاس بیٹھ گئی۔

”اس پر سائن کرو مقبول احمد۔“

اس نے ایک اسٹمپ پھر اس کے سامنے رکھا جس پر کچھ تحریر لکھی تھی مگر وہ اس کو پڑھنے لائق نہیں تھا۔

”دیکھو مقبول احمد میں تمہیں بار کر قاتلہ بنا نہیں چاہتی

اگر تم اس پتھر پر دستخط کرو تو میں فوراً ڈاکٹر کو بلا دوں گی تم ٹھیک ہو جاؤ گے ورنہ اتنا درد اتر ڈاڑھ پر ہے کہ ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر زمر دے بس اس مکان کی ملکیت میرے بیٹے کے نام ہو جائے خود سے تو تم بھی یہ کام کرو گے نہیں۔ میرے بیٹے سے خدا واسطے کا میر جو ہے لو جلدی یہاں اپنا نام لکھو میں نہیں چاہتی بڑھے ویلے تمہاری چاکریاں میں کروں اور جاننا تمہارے بوڑھے گدھ بھائی لے جائیں۔“

لیکن مقبول احمد اس قابل ہی نہیں تھا کہ کوئی حرکت کر سکا اس کا ذہن تیزی سے اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔

سامنے کا منظر دھندلانے لگا تھا شاہدہ کی آواز بھاری

ہو کر سماعتوں سے گمراہی تھی۔ اس نے اذیت سے

آنکھیں میچ لیں مگر تکلیف کی شدت نے یہ راحت بھی

جھین لی اندر جیسے کوئی اس کے جسم کو چھوئے چھوئے ٹکڑوں

میں کاٹ رہا تھا۔ اس کی کمزور سماعتوں کو اچانک ایک مبہمی

آواز سنائی دی جیسے کوئی چیز گری ہو شاہدہ تیزی سے لپک کر

باہر گئی اس کا رخ منیر کے کمرے کی جانب تھا۔ اور کچھ ہی

حصوں کی تاخیر سے مقبول احمد نے وہ آواز سنی جس کو سننے کی

خاطر اس کا دم سینے میں اٹکا تھا۔

”منیر میرا بچہ منیر آنکھیں کھول ارے کوئی ڈاکٹر کو

بلاؤ۔“ دھیرے دھیرے اس کی آواز کم ہوتی گئی۔ شاہدہ کا

واپس بلا مقبول کے لیے موت کی آخری موسیقی جیسا ثابت ہوا

ایک پتلی سی خون کی لکیر نے اس کا گریبان چھوا اور اس نے

سکون سے آنکھیں موند لیں۔



چاہت

صباح احمد خان

اے ابن آدم! ایک تیری چاہت ہے۔ ایک میری چاہت ہے۔ پر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔ پس اگر تو خلاف ہوا اس کے جو میری چاہت ہے تو میں تجھیں لوں گا وہ تجھ سے جو تیری چاہت ہے۔ اگر تو نے رنگ لیا خود کو اس میں جو میری چاہت ہے تو میں وہ بھی تجھے دونگا جو تیری چاہت ہے۔

اس کی چاہت کا فائدہ جو رلاتا بھی ہے اور لبوں کو مسکراہٹ سے آشنا بھی کرتا ہے

☆☆☆.....

ٹیک ٹیک ٹیک! وہ 16 بج کی ٹیکل پہنے بڑی نزاکت سے فانیو سٹار ہوٹل میں داخل ہوئی تھی بہت سی گردنیں بیک وقت اسے دیکھنے کے لیے مڑی تھیں کیونکہ وہ ایسی ہی تھی جہاں بھی جاتی بس چھا جاتی۔ اللہ جب حسین دیتا ہے تو نزاکت آتی جاتی ہے وہ اس مثال پر پورا اترتی تھی۔

”ارے بھئی بیٹا آئیں آئیں آج بہت دنوں بعد آئی آپ۔“ اسے دیکھتے ہی منیجر اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس کے پاس آیا تھا وہ ان کو دیکھ کر مسکرائی تھی کیونکہ اس کے بار بار منع کرنے کے باوجود ہمدانی صاحب ایسے ہی اسے رسیو کرتے تھے۔

”ہمدانی اکل اتنے لوگ ہیں نا آپ کیوں آ جاتے ہیں باہر۔“ اس نے بے تکلفی سے ان کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا اس کی سہیلیاں اس کا سایہ بنی ہوئی لگ رہی تھی۔

”بس میرا پیار ہے اپنی بیٹی کے لیے۔“ انہوں نے اس کی کرچہ چھتاتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کا ٹیکل خالی ہے ہمیشہ کی طرح۔“ ہمدانی صاحب نے اس کے ٹیکل والی سائیز پر اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ابھی وہ مزید کوئی بات کرتے کے اچانک برتنوں کے گرنے کی آواز آئی تھی ابھی یہ سب ہوا ہی تھا کہ ہال میں ایک زوردار چھڑکی کی آواز گونجی تھی دوسرا چھڑ ہوا میں لہرایا ہی تھا کہ کسی نسوانی ہاتھ نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

وہ اسپتال کی چھت کو ٹنگی باندھ کر دیکھ رہی تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ رب آج آسمانوں سے اتر کر اس کے بہت قریب چلا آیا ہے اور اسے کہہ رہا ہے ”ٹانگ آج تو کیا مانگتی ہے۔“ چھت ان دونوں کے درمیان پردے کا کام دے رہی تھی اس کا مجرم بنار ہے۔

باللہ یہ کیسا امتحان ہے حیرے لوگ ترس رہے ہیں تیری نعمت کے لیے اور میں ”لہجہ میں کرب کی کیفیت واضح تھی وہ اس ہستی سے ہمکلام ہوتے ہوئے بھول گئی تھی کہ وہ اس ذات سے شکوہ کتنا ہے آنسوؤں کو جیسے راستہ مل گیا تھا آنسو سے دھلا چہرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا اس وقت کوئی بھی اسے دیکھ لیتا تو دیوانہ ہو جاتا اس کا خدا سے ہمکلام ہونے کا نور اس کے چہرے کو روشن کئے ہوئے تھا

اچانک نا جانے اس کے دل میں کیا سائی وہ دیوانہ وار اپنے بیڈ سے تھوڑی دور پڑے جھولے کی طرف گئی تھی بچے کو سینے سے لگائے وہ اسے چومتی جا رہی تھی اس کے آنسو اس کے سینے کے دودھ میں جذب ہو رہے تھے۔ ”میرا لعل میں کتنی بد بخت ہوں حیرے آنے پر رو رہی ہوں ماں تو بیٹے پیدا ہونے پر سرخسر سے بلند کر دیتی ہیں میں ایسی ماں ہوں ” وہ خود سے ہمکلام تھی اپنے آپ سے ہمکلام ہونا ایک بہت دشوار عمل ہے جس میں سوال بھی خود کرنے پڑتے ہیں اور جواب بھی خود دینے پڑتے ہیں اور اگر کوئی وضاحت ہو تو وہ بھی خود دینی پڑتی ہے

”تم میرا ہاتھ پکڑو گئی؟“

مقابل نے آنکھوں سے شعلے اگلنے ہوئے کہا تھا۔
مصدر قیوم ایک بہت بڑا بزنس مین تھا اس وقت بھی وہ ایک
بزنس میٹنگ کے سلسلے میں وہاں موجود تھے۔
”یہ ہماری آئر ہیں قیوم صاحب آپ چلیں ہم آفس
میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ ہدائی صاحب نے بات کو
سنجانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ یعنی نے قیوم کو نظر انداز کرتے
ہوئے ویٹر کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہا تھا

”جی وہ میں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے ہلکاتے
ہوئے جواب دیا تھا مصدر قیوم کے تن بدن میں آگ لگ
گئی تھی وہ اس سے زیادہ فوٹک ایک ویٹر کو دے رہی تھی
یعنی کوٹا جانے کیوں اسے چڑانے میں مرہ آ رہا تھا اچانک
اسے لگا جیسے ویٹر گر کر لگا ہو اس نے آگے بڑھ کر اس کا
ہاتھ تھام لیا تھا۔

”ارے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ یعنی نے حیرت
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ سانولے سے رنگ کا نوجوان خود سے بے نیاز ہو کر
کام کر رہا تھا یعنی کو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا تھا ”ہدائی
انگل آپ قیوم صاحب کو لے کر آفس جائیں میں ان کو
لے کر اسپتال جا رہی ہوں اینڈ گرلز آپ کھانا کھا کر جانا۔“
یعنی نے تیزی سے کہتے ہوئے سن گلاسز چہرے پر
چڑھائے تھے۔

ان سب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا جو
ایک ویٹر کو اتنی اہمیت دے رہی تھی یہ تو اس کے مزاج کا
خاصہ نہیں تھی۔

☆☆☆☆

وہ شام تک اسپتال سے خارج کر دی گئی تھی کوئی بھی
اسے لینے نہیں آیا تھا وہ اللہ سے ناامید نہیں ہوئی تھی وہ اللہ
سے سب اچھا ہونے کی دعا کر رہی تھی کیسی اسے گیٹ
کے سامنے اتار کر چلی گئی تھی گود میں بچہ اٹھائے بڑی
مشکل سے ایک ہاتھ سے اس نے گیٹ پر دستک دی تھی
10 منٹ گزرنے کے بعد کوئی دروازہ کھولنے آیا تھا۔

”کیا کرنے آئی ہو یہاں تم تمہیں کہا نہیں تھا مجھے اپنی
ہلک بھی مت دیکھانا۔“ مقابل نے غصے سے پھونکارتے

ہوئے بنا گواہی سے کہا تھا

”جمل اسنے کھورنا بنو میں آپ کی بیوی ہوں آپ کے
بچوں کی ماں میرا نہیں تو اس کا تو خیال کریں میں کہاں
جاؤں گی بھلا میرا ہے ہی کون آپ کے سوا اس دنیا میں۔“
اس نے تڑپتے ہوئے اسے احساس دلانے کی کوشش کی تھی
نا جانے کیا سوچ کر وہ دروازے سے ہٹ گیا تھا جس کی
اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔

”آ جاؤ اندر اب عذاب بن گئی ہو میرے لیے تم۔“
جمل نے بلند آواز کہتے ہوئے راستہ دیا تھا۔

وہ اسنے میں ہی خوش تھی وہ چاہے اس کے وجود کو
اہمیت نہ دے مگر اس کے لیے یہ صحبت بہت اہم تھی جس کو
کھونے کا وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی اس کے تحت جگر بھی
توڑتے وہاں وہ بھلا جاتی تو کہاں جاتی۔

”ماما ماما! آپ ہمارے لیے بہن لائی ہیں نا؟۔“
دانیال اور فہد نے بے قراری سے ماں کی ٹانگوں سے لپٹنے
ہوئے کہا تھا۔

”نہیں بیٹا! اللہ نے آپ کو ایک ننھا سا پیار سا بھائی دیا
ہے۔“ اس نے پیار سے بچوں کے ذہن کے سوالوں کو
پڑھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”مگر ابو تو کہہ رہے تھے۔“
”بھائی کو نہیں دیکھو گے کیا؟“ وہ بات بدل گئی تھی اس
نے چھوٹے گودنالی کی گود میں لٹا دیا تھا اور خود مت جمع کر
کے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”کیوں آئی ہو میرے کمرے میں تم۔“ اس نے بے
پروائی سے کہا تھا۔

”میں نے بنا سوچے سمجھے آپ پر اپنی محبت نچھاور
کر دی اور آپ نے ان 5 سالوں میں مجھے سوائے نفرت
اور تکلیف کے کچھ نہیں دیا آخر کیوں کونسا گناہ ہے جس کی
مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔“ اس نے ضبط کا دامن
چھوڑتے ہوئے کہا تھا وہ سب سستی آئی تھی پہلے بیٹے کی
پیدائش پر پڑنے والی بار دوسرے بیٹے کی پیدائش پر پڑنے
والی بار اور تیسرے بیٹے کی پیدائش پر گھر سے نکالے جانے
کا عذاب۔

”بیٹے تو باپ کا بازو دھوتے ہیں لوگ تو اللہ سے بھیک
مانگتے ہیں بیٹوں کی اللہ آپ کو بن مانگے نواز رہا ہے آپ

کیوں ناشکرے بن رہے ہیں۔“ اس نے فکرتہ لہجہ میں
جمل کو کھیرے میں کھڑا کیا تھا
”کتنی بار بتاؤں تمہیں پاگل عورت اللہ جب بہت
خوش ہوتا ہے تو بیٹی دیتا ہے بیٹی رحمت ہے اللہ کی مجھے
بیٹیاں چاہیں تم بیٹے پیدا کر کر کے میرے سر پر لا دو رہی ہو
میں کہاں سے کھلاؤں ان کو۔“

وہ ہاتھ نچا نچا کر اوجھی آواز میں بولا تھا وہ اس وقت
بالکل گنوار لگ رہا تھا اس کی ساری ڈگریاں اسے مٹی میں
ملتی نظر آرہی تھیں وہ اس کی اس عجیب سی خواہش پر اندر ہی
اندر کڑھتی رہتی تھی کبھی بھی اسے جمل کی داغی حالت پر
حک ہونے لگتا تھا وہ بیٹی کیوں چاہتا تھا یہ بات اس کی سمجھ
سے بالکل باہر تھی اس کی ٹوٹی پھوٹی وضاحت بھی اسے
مطمئن بنا کر پاتی تھی

☆☆☆☆

صفر قیوم کے ذہن میں یعنی ایسے سا گئی تھی جیسے نیند
میں خواب سا جاتے ہیں وہ ناچا پتے ہوئے بھی اسے سوچتے
لگا تھا اسے وہ اسٹاکس سیڑگی بہت بھاگتی تھی وہ مسکرا رہا تھا
جب اچانک اس کا دوست عامر کمرے میں داخل ہوا۔

”بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں کیا ہو گیا
یار بڑا چپکے چپکے مسکرایا جا رہا ہے۔“ عامر نے بڑی بے لگافی
سے چہر پر کرنے کے انداز میں بیٹھے ہوئے کہا تھا وہ براہ
راست قیوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھا تھا۔
”کچھ نہیں یار بس وہ کل والی بات۔“

”ارے اب میں سمجھا تم وہ کیا نام بتایا تھا تم نے وہ
ہاں یعنی اس کو سوچ کر مسکرا رہے ہو۔“ عامر نے قیوم کی
بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا تھا وہ مزید کچھ بولا اگر
قیوم اسے سختی سے نہ گھورتا۔

”اچھا ہو جاتا ہوں چپ گھوروں تو مت۔“ عامر نے
ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بتاؤ اب کل جو بزنس ڈیل کے لیے پارٹی آرہی ہے
اس کو کہاں کھانا دیا جائے۔“ عامر واپس پر وقیش ٹاپک کی
طرف آیا تھا قیوم نے بھی خود کو خالوں سے نکالتے ہوئے
بزنس میٹنگ کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی۔

”جانا کہاں ہے کل والے ہوٹل میں ہی چلتے ہیں۔“
اس نے بڑی احتیاط سے اپنا نقطہ نظر عامر کے سامنے رکھا تھا

عامر جو ٹوک لے کر بیٹھا تھا اچانک سر اٹھا کر قیوم کی
آنکھوں میں دیکھا اور پتیارہ منہ بنا کر ضبط کرتے کرتے
پیٹ پر ہاتھ رکھ کے ہنسنے لگا تھا۔

”رک تو ذرا آج۔“ قیوم کہتے ہوئے اس کے پیچھے
بھاگا تھا جب تک عامر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب
ہو گیا تھا۔

وہ دونوں بچپن کے دوست تھے وقت کا کام ہے گزرتا
اور وہ گزرتا چلا گیا قیوم اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا زندگی
بہت اچھی اور پرسکون گزر رہی تھی کے اچانک قیوم کے
والد زہیر کو بزنس میں بہت بڑا نقصان ہوا اور حالات
خراب ہوتے چلے گئے اس مشکل وقت میں عامر نے اپنے
دوست کا ساتھ دیا اور اپنے حصے میں آنے والی گاؤں کی
تمام زمین بیچ کر زہیر صاحب کے ساتھ انویسٹ کر دیا زہیر
نے سارا بزنس قیوم اور عامر کے حوالے کر دیا ان دونوں
کے کمپنی میں 50 50 پرسنٹ شیئر تھے اس طرح ان
دونوں کی دوستی اس قدر مضبوط ہو گئی کہ وہ ایک دوسرے
کے لیے لازم و ملزوم ہوتے چلے گئے عامر اپنے والدین
اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر قیوم کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

اسے گھر آئے 5 دن ہو گئے تھے مگر جمل نے ایک بار
بھی اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا وہ ایک بار پھر سب بھولے
جمل کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی چہرے پر مایوسی کی مٹا کا
نور چھائے وہ بہت مقدس لگ رہی تھی

”میرے کمرے میں کیوں آئی ہو تم اب کمرہ بھی چھوڑ
کر نکل جاؤں کیا؟“ جمل اسے دیکھتے ہی ہنسنے لگا تھا۔

”اللہ ہمیں بنی بھی دے گا نا امید مت ہو یہ بھی تو آپ کا
بی بیٹا ہے آپ کا بازو میں نے اس کا نام آیا ان رکھا ہے۔“

اس نے جمل کے سامنے چھوٹے بیٹے کو کرتے ہوئے کہا تھا۔
”نہیں تم مجھے بنی نہیں دے سکتی میں ہی پاگل ہوں

جواب تک تمہارے ساتھ رہتا آرہا ہوں کہاں سے کہاں
کر کھلاؤں میں تم لوگوں کو۔“ جمل نے اسے بچے سمیت

زور سے دھکا دیا تھا وہ کرتے کرتے بجلی بھی مگر وہ چیزوں کو
ٹھوکر مارنا غلط کام لایاں نکالنا کمرے سے نکل گیا تھا۔

اس کے ذہن میں نا جانے کیا آیا کہ وہ باہر جاتے
جاتے اچانک واپس پلٹا تھا دانیال اور فہد کو پکڑ کر اسی

کمرے میں لایا تھا جہاں وہ بیٹے کو گود میں لئے رو رہی تھی اسے بس ایک نظر دیکھ کر بیٹوں کو وہاں چھوڑ کر اس نے کمرے کو لاگ کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے یہ سب کرتے دیکھتی رہی تھی اسے لگا شاید شام تک وہ لوٹ آئے گا مگر دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی مگر وہ واپس نہیں آیا بچے بھوک سے بے حال ہو گئے وہ خود آیان کو فیڈ کرواتے کرواتے بڑھ چلا ہو گئی تھی۔

”ماما بھوک لگی ہے۔“ دانیال نے روتے ہوئے اسے کہا تھا اچانک اسے یاد آیا کہ الماری میں محل اپنے لیے بکٹ اور ٹکولہ کر رکھتا ہے تو وہ پانچلوں کی طرح الماری کی طرف بھاگتی تھی مگر خالی الماری اس کا منہ چڑا رہی تھی وہ وہی سر پکڑ کر بیٹھتی تھی آنسوؤں نے شدت پکڑ لی تھی بچے ماں کو رو تادیکھ کر کہہ گئے تھے۔

”ماما آپ نارویس میں نہیں مانگوں گا اب کھانے کو کچھ۔“ دانیال نے ماں سے لپٹتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا صبح میں آپ کو اچھا سا کھانا بنا کر کھلا دوں گی اب آپ سو جاو۔“ اس نے بیٹے کو گود میں لینا کر پیار کرتے ہوئے کہا تھا ہند بھی چپ کر کے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

.....☆☆.....

جب وہ پیدا ہوئی تو اس کی ماما ڈیپوری کے دوران ہونے والی شادی کے باعث انتقال کر گئیں مگر بابا نے اسے خندہ پیشانی سے گلے لگایا انہوں نے اپنی بیٹی پر منحویت کا شہرہ نہیں لگنے دیا دادی کے پرزور اصرار پر بابا نے شادی کے لیے ہای بھر لی شائستہ پیگم نے باپ بیٹی کو سنبھال لیا ابھی سوئی ماں اپنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ عینی کو پیار دیا جتنا اس کی ماما بھی شاید اسے نادمہ نہ سکتی ایک بار پھر سے ان کے گھر میں بچے کے رونے کی آواز گونجی اللہ نے حمید مرزا کو ایک چاند سا بیٹا دے کر ان کی فیملی مکمل کر دی نا جانے وہ وقت کی کوئی بے رحمی تھی جب ان دونوں بچوں کو پیگم کر دیا ان کے والدین روڈز ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے عینی اور علی پر تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی علی نے اپنی گرجویشن ادھوری چھوڑ دی اور انگلینڈ سے پاکستان لوٹ آیا جہاں اس کی بہن ایکلی بھی علی نے اسے آپ کو سنبھالتے ہوئے عینی کو تعلیم جاری رکھنے کا کہا اور خود ہوں کو سمجھانے میں مصروف ہو گیا ہمدانی صاحب نے قدم قدم پر ان دونوں کی مدد کی وہ

ان کے لیے ایک باپ کی حیثیت رکھتے تھے جو ہمیشہ ان کے ساتھ کھڑے رہتے تھے انہوں نے حمید صاحب سے کی دوستی بہت اچھے سے نبھائی تھی اور بھائی آرہے تھے۔ نا جانے عینی کی زندگی کا یہ کیسا دور شروع ہوا تھا۔ اس ویٹر کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اس نے بار بار اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر دیکھا تھا مگر وہ بھولا بھالا اس کے دل میں ایسے ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا جیسے اس کا دل اس کی سلطنت ہو اور وہ اس سلطنت کا بادشاہ۔

کتنی ہی دیر وہ ہوئی میں بیٹھی بیٹھی بیٹھی نظروں سے اسے دیکھتا رہتی رہتی تھی اس کی نگاہوں کا ارتکاز ہمدانی صاحب نے بری طرح محسوس کیا تھا۔

”کیا بات ہے عینی بیٹا میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں آپ یہاں آکر کم مسمی بیٹھی رہتی ہیں۔“ ہمدانی صاحب نے اپنے دل کی بات کو زبان دی تھی۔

”ارے کچھ نہیں ہمدانی انکل میں ٹھیک ٹھاک ہوں آپ کو تو بابا کی طرح بس وہم ہو جاتا ہے۔“ عینی نے نظریں چراتے ہوئے جھوٹ بولا تھا۔

”میری طرف دیکھو بیٹا کیا چچ میں آپ مجھے کچھ نہیں سمجھتی؟“ ہمدانی صاحب بھی آج اس سے سب اگلوئے

کا سوچے بیٹھے تھے کیونکہ ان کی تجربہ کار آنکھیں وہ سب جان چکی تھیں جو عینی خود سے بھی چھپائے بیٹھی تھی عینی نے ایک لمحے کے لیے ہمدانی صاحب کی طرف دیکھا تھا ان کی آنکھوں میں نا جانے اسے کیا نظر آیا کہ وہ سب اقرار کر بیٹی چلی گئی تھی جو وہ ابھی خود سے کرتے ہوئے بھی گھبراتی تھی عینی کو خود بڑ حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے ہمدانی انکل کو سب بتا لی چلی گئی سب کچھ عینی کے منہ سے سن کر ہمدانی صاحب بہت پریشان ہو گئے تھے ان کو عینی پر بہت حیرت ہو رہی تھی اس میں کیا کمی تھی؟ جو وہ ایک ویٹر شکر.....

”یہ آپ نے خود کو کس امتحان میں ڈال لیا ہے عینی بچے آپ تو بہت اچھا بہت اچھا بڑو کر رہی ہیں۔“ ہمدانی انکل نے تاسف سے عینی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہمدانی انکل پتہ نہیں یہ سب کیسے ہو گیا مگر وہ میرے دل کی خواہش ہے وہ جو ہے جیسا ہے مجھے قبول ہے آپ بھائی سے بات کرے۔“ عینی نے سر جھکا کر دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔

”مگر عینی۔“

”اگر مگر میں نہیں جانتی اکل آپ کے علاوہ یہ بات میں کسی کو نہیں کہہ سکتی آپ جانتے ہیں نا۔“ عینی نے ٹوکتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا تھا۔

”اگر میں کہوں کہ مجھے بھی تمہارے لیے صحیح نہیں لگ رہا تو۔“ ہدانی اکل نے اپنے لہجے کو سرسری سا بناتے ہوئے کہا تھا۔

”اکل پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کریں میں اس کے بغیر نہیں جی سکوں گی اگر میں زندہ بھی رہی تو پھر میں کبھی شادی نہیں کروں گی کیونکہ میرے دل میں اب اس کے علاوہ کوئی نہیں سا سکتا۔“ عینی نے اپنے دل کی بات کو زبان دی تھی

مزید بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے لیے فیصلہ کر چکی تھی بنا سوچے کے اس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔

☆☆☆.....

ساری رات گزر گئی مگر وہ نہیں لوٹا صبح صبح بچوں نے پھر سے بھوک کا رونا شروع کر دیا تھا۔ بھوک کے مارے اسے چکر آ رہے تھے بچوں کو بہلاتے بہلاتے وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اس کے دل نے آج شدت سے اسے یاد کیا تھا جسے وہ ماضی سمجھ کر بھول گئی تھی آج وہ اس کے سامنے سراٹھا کر کھڑا تھا۔

”میں تمہارے لوٹ آنے کا منتظر رہوں گا میں نے تمہیں شدت سے چاہا ہے سچے دل سے تمہیں اپنے رب سے مانگا ہے اور مجھے یقین ہے میرا رب تمہیں مجھ سے ہمیشہ کے لیے کبھی دور نہیں کرے گا۔“ اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز گونجی تھی۔

”تو کیا تم سچے تھے؟ میں آج اس موڑ پر تمہیں یاد کر رہی ہوں تو کیا تم جیت گئے؟“ وہ خود سے ہلکا مٹی کا ش ایک بار ایک بار میں نے تمہاری باتوں پر ایمان لایا ہوتا تو مجھے اتنی بڑی ٹھوک نہیں لگتی۔

ماضی کی یادیں کسی بڑے سانپ کی طرح اسے ڈس رہی تھی۔

☆☆☆.....

صفر قیوم نے جب سے ہدانی صاحب سے سنا تھا اسے چین نہیں آ رہا تھا زندگی میں پہلی بار اس کے دل کی

دھڑکن کسی کا نام لینے لگی تھی مگر وہ تو کسی اور کی طرف متوجہ تھی بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا ہے اس کا دل کسی اور کے لیے دھڑک رہا تھا کسی اور کا نام لے رہا تھا۔

”کیا بات ہے کہاں کھوئے ہو جناب۔“ عامر نے قیوم کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا اس کے روم میں آنے کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ افسردہ سے لہجے میں جواب آیا تھا۔

”قیوم تم اس کے بھائی سے کیوں نہیں ملتے ہو؟ تمہارے سامنے اس ویٹر کی کیا حیثیت ہے؟“ عامر نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا وہ اسے اس طرح ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”جب اس کے دل پر میرا نام نہیں لکھا تو میں زبردستی کیسے کر سکتا ہوں۔“ قیوم نے ٹکھڑے ہوئے لہجے میں کہا تھا ”جب تم جانتے ہو کہ وہ غلط فیصلہ کر رہی ہے پھر بھی تم؟“

”جیسے اسلام زبردستی کا قائل نہیں ویسے ہی محبت بھی کسی زبردستی کا قائل نہیں۔“ قیوم نے عامر کو لا جواب کرتے ہوئے کہا تھا۔

عامر نے دل ہی دل میں عینی کے بھائی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنے دوست کی زندگی برباد نہیں ہونے دینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ اس کا کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے نا ہی وہ جذباتی ہونے والا انسان ہے اس کے دل نے پہلی ہی نظر میں عینی کو چن لیا تھا بار بار سوچنے کے باوجود اس کا دل کسی اور طرف توجہ دینے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆.....

ان کو اس ایک ہی کمرے میں بند ہوئے 24 گھنٹے گزر چکے تھے مگر واپس نہیں آیا تھا نا جانے کہاں چلا گیا تھا وہ 3 سالہ دانیال اچانک رونے لگا تھا۔

”کیا ہوا میری جان۔“ اس نے بیقراری سے دانیال کو گلے لگایا تھا۔

”ماما میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ دانیال نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے رو کر کہا تھا۔

اس کا ضبط پھر سے جواب دینے لگا اور اس نے چیخ کر دروازہ پینا شروع کر دیا اسے دیکھ کر ہمدردی مند کو آ گیا تھا۔

”کوئی ہے؟ ہمیں باہر نکالو کوئی میری آواز سن رہا

تھی۔

”مجھے باہر نکالو میرا بچہ مر رہا ہے۔ خدا کے لیے کوئی تو میری آواز سن لو۔“ لہجے میں کرب عیاں تھا۔ اور وہ آواز وہ کیسے بھول سکتے تھے ان کا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔

”یعنی یعنی بیٹا میں آ رہا ہوں حوصلہ رکھو میرے بچے۔“ انہوں نے اونچی آواز میں اسے تسلی دیتے ہوئے پاس پڑے پتھر کو تالے پر مارنا شروع کیا تھا۔

اندر سے چیخ و پکار نے اور بھی شدت پکڑ لی تھی اس پاس کے لوگ بھی پہلی بار اس طرح کی صورت حال دیکھ کر انکھیں ہو گئے تھے ہمدانی صاحب کی مدد کو دو جوان آگے آئے تھے اور سب تالے ٹوٹتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆.....

یعنی کی نظروں کے پیغام محل کو سمجھ میں تو آرہے تھے مگر اس کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا اس کے لیے یعنی کی خوبصورتی انہیں بھی بلکہ اس کا اسٹیشن اہم تھا وہ خود کو اس ہوٹل کے مالک کے روپ میں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش رہتا تھا اس کے دل و دماغ میں صرف اور صرف لالچ بھر ہوا تھا۔

ہمدانی صاحب نے علی سے بات شروع کی تو وہ آگ بکولہ ہو گیا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ اس کی بہن اور ایک ویز ہمدانی صاحب نے مختلف دلائل دینے کی کوشش کی مگر ان کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ وہ علی کے سامنے سرنا اٹھا سکی۔

عامر بھی انہی دنوں میں علی سے ملا تھا اور صفدر قیوم کا پرپوزل اس کے سامنے رکھا علی نے فوراً ہی صفدر قیوم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے اسے گھر بلوایا تھا علی نے یعنی سے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”یعنی“ علی نے دروازہ ناک کرتے ہوئے اسے آواز دی تھی یعنی اپنے خیالات سے چونک کر باہر نکلی تھی اور دروازہ کھولا تھا۔

”تو آج میرے بھائی کو یاد آگئی میری۔“ یعنی نے لاڈ سے علی کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔ علی کے اعزاز میں کسی قسم کی گرجوش نہیں تھی جیسی عمو اس کے لہجے میں یعنی کے لیے ہوتی تھی یعنی کی چمٹی حس نے اسے الٹ کر دیا تھا علی خاموشی سے صوفے میں دھنس کے بیٹھ گیا تھا۔

ہے؟“ وہ تڑپ تڑپ کر دروازے کو بجار ہی تھی کتنا کرب تھا اس کی آوازیں آسمان بھی کانپ اٹھا تھا ماں کی متادیکھ کر۔

”ماما ماما بھائی بول نہیں رہے“ فہم نے اس کے قریب آ کر روتے ہوئے کہا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے شدت سے اس شخص سے نفرت محسوس کی تھی جس کے لیے وہ سب سے ٹکرا گئی تھی وہ دروازہ اور بھی زور سے پینٹنے لگی تھی مگر نا کوئی آیا تھا اور نہ ہی کسی کو آنا تھا ان کے روز روز ہونے والے جھگڑوں کے لوگ اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب ان کے گھر سے شورنا اٹھتا تو وہ پریشان ہو جاتے وہ دانیال کا سر گود میں لیے اس پر آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے زندہ آگ کی بجھی میں پھینک دیا ہو جہاں آگ کے شعلوں کی لپٹیں اسے اپنے اندر مقید کر چکی ہوں بالکل ویسے جیسے وہ کل سے اس کمرے میں مقید تھی۔

ہمدانی صاحب کا دل نا جانے کیوں گھبرا رہا تھا ان کے اندر اتنا جتن بھر گیا تھا کہ ان سے خود اپنا وجود بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا اچانک وہ کچھ سوچتے ہوئے مطمئن ہوئے اور گاڑی کی چابی اٹھا کر ہوٹل سے نکل آئے تھے۔

وہ جتنا بھی ناراض رہ لیتے یعنی سے مگر وہ ان کے دل سے کبھی دور نہیں گئی تھی انہوں نے ہمیشہ اس میں اپنی بیٹی کی جھلک دیکھی تھی جو آج سے 10 سال پہلے اپنی ماں سمیت منوں مٹی تلے جاسوئی گئی

نا چاہتے بھی آج پھر انہوں نے گاڑی اس راستے پر ڈال دی تھی جہاں وہ 5 سال سے چاہتے تھے مگر گھر کے اندر جانے کی ہمت ان میں نہیں ہوئی تھی نا جانے وہ کیوں اتنے بے بس ہو جاتے تھے بھلا کسی کی اولاد سے کسی کو اتنی محبت کیسے ہو سکتی ہے وہ چھپ چھپ کر اس گلی میں اسے دیکھتا ہو محسوس کرتا ہو۔

ان کے پیروں نے گیٹ پر جا کر بریک لگائی تھی۔ ان کو ایسا لگا جیسے وہ خواب سے ابھی جاگے ہو گیٹ کے باہر ایک بڑا سا تالا لگا تھا۔

ایسا تو انہوں نے 5 سال کے عرصے میں نہیں دیکھا تھا کہ گیٹ کو تالا لگا ہوا وہ اترا کر گیٹ کے پاس گئے تھے۔ کسی سے پوچھ کچھ کرنے کی نیت سے پلٹے ہی تھے کہ آواز آئی

بن کر آگیا مگر علی نے ایک نظر بھی نہیں ڈالی وہ ہر وقت کمرے میں بند ہوتا یا ہوٹل چلا جاتا یعنی کے اکاؤنٹ میں ایک بھاری رقم ٹرانسفر کروا کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا تھا۔

یعنی اپنے آنے والے سہانے دنوں کی یادیں کھوئی تھی جب اچانک اس کے کمرے میں پڑافون بجا تھا۔

اس نے اپنا منہ اٹھا کر آگے بڑھا کر فون اٹھایا تھا اور تعارف کے بعد وہ خاموشی سے فون کان سے لگائے سنتی رہی تھی نا جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر اس جذبے پر محبت کا جذبہ غالب آ رہا تھا اور محبت کے جذبے سے بھی بڑا اور کوئی جذبہ ہوتا ہے بھلا؟

.....☆☆.....

رخصت ہو کر وہ اپنے گھر آگئی تھی علی نے عین وقت پر صرف اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور چلا گیا وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ اسے گلے لگا کر چھوٹ چھوٹ کر روئے گا مگر.....

ہمدانی انکل بار بار اپنی نم آنکھوں کو صاف کر رہے تھے۔
”خوبصورتی سے تو لاڑ کا مالامال ہے جب بھوک لگے گی تو اسی کو کھائے گی۔“ گزرتے ہوئے اس کے کانوں نے سرگوشی سنی تھی اس کے خیالات میں جھم سے بخار میں تپتا مگر کام کرتا ہوا جمل آیا تھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ اپنے آپ ہی آگئی تھی۔

خوب صورت چہرہ اور جذبات سچائے وہ جمل کی زندگی میں شامل ہوگئی تھی بارات میں صرف جمل کی بوڑھی ماں اور گاؤں کے کچھ دوست شامل تھے ان کو دیکھ کر تو لب بھر کے لیے وہ ہنسی مٹی مگر پھر محبت ہر جذبے پر غالب ہوئی چلی گئی۔
ڈینس میں رہنے والی ایک چھوٹے سے محلے کے دو کمرے کے مکان میں آکر بہت خوش تھی محبت کو پالنے کا نشہ اسے سرور کئے ہوا تھا۔

بات بے بات مسکراہٹ لبوں کو چوم جاتی تھی خوشبوؤں میں کسی وہ پری جمل کی زندگی کو حسین بناتی چلی گئی تھی جمل پہلے تو اس کی دولت سے مرعوب تھا اب اس کی خوبصورتی کی بھی دیوانہ ہو گیا تھا۔

مگر خوشی کے لمحات کی عمر بھی مختصر ہوتی ہے ان کی زندگی کے خوشی کے لمحات بھی گزر گئے جمل کو معلوم نہیں تھا

”اصل میں بات یہ ہے یعنی آپ کی مجھے ہمدانی انکل نے آپ کے بارے میں کچھ بتایا ہے جسے ماننے کو میں اول و دماغ ہرگز آمادہ نہیں ہے وہ ایک ویز بھی ہوتا تو خیر بھی مگر مجھے دوسرے ویزز نے اس کی جس طرح کی عادات کے بارے میں بتایا ہے ایک بھائی ہونے کے ناتے میں آپ کو کسی صورت ایسا کرنے نہیں دے سکتا۔ صفر قیوم کا نام تو سنا ہے نا آپ نے آج شام میں وہ آرہے ہیں آپ کا پر پوزل لے کر مجھے آپ کے لیے ان سے بہتر کوئی نہیں لگا وہ انتہائی سچے ہوئے اور انگلیش انسان ہیں آپ ایک ویز کرو۔“

”ہرگز نہیں اور کیا ویز ویز لگا رکھی ہے آپ نے؟ جمل نام ہے ان کا مجھے کسی صفر قیوم سے شادی نہیں کرنی میرے لیے پیہر کوئی اہمیت نہیں رکھتا علی مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ سب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں اپنی بڑی بہن کو۔“ اس نے کہتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا لہجے میں بغاوت کا جذبہ نمایاں تھا علی نے اسے بہت پیارا اور جیسے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی جو اس نے بالکل الٹ لی تھی۔

”کیوں دشمن سمجھ رہی ہیں آپ مجھے میں کیونکر آپ کا برا چاہ سکتا ہوں؟“ اس نے بے یقینی کی کیفیت میں گھر کر کہا تھا۔

”میری خوشی صرف جمل ہے۔“ دوڑک جواب آیا تھا۔
”پھر آپ کی آپ یہ بھول جائیے گا کہ آپ کا کوئی بھائی بھی ہے۔“ علی نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”میرے گلے بھائی پہلے بھی تم کہاں ہو سوتیلے پن تو دکھا گئے ہی مگر جاؤ علی میں اپنے حصے کی تمام جائیداد سے دستبردار ہوتی ہوں میں بھی تم سے کچھ نہیں مانگنے آگئی۔“

”بس اب مزید ایک لفظ بھی نہیں عینا کل مرزا اور نہ میں بھول جاؤنگا سب کچھ۔“ علی نے غصے سے کانپتے ہوئے یعنی کو اس کے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا اور دروازے کو شوکر مار کر نکل آیا۔

سب معاملات خود بخود حل ہوتے گئے اور ان دونوں کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی علی نے یعنی سے بات چیت بالکل بند کر دی تھی مگر اسے پروا کبھی ہمدانی صاحب بھی خاموشی سے سب کاموں میں لگے رہتے اس کا فریج

ہی مول کس بلا کا نام ہے یہ جان کر یعنی نا جانے کتنی دیر ہنسی رہی تھی۔

جمل کی ماں بھی واپس گاؤں لوٹ گئی تھیں کیونکہ ان کے بقول شہر میں ان کا دم گھٹتا ہے اب تنہائی ہی تنہائی تھی اور وہ دونوں تھے

”مجھے نہیں پسند آپ کی ویٹر کی نوکری؟“ ایک دن عینی نے منہ بتاتے ہوئے کہا تھا۔

”تو اب میں ویٹر کہاں رہا ہوں وہاں کا مالک بن گیا ہوں مالک۔“ جمل نے اپنی ہلکی ہلکی موچھوں کو تاو دیتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں جمل ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں علی سے مجھے کچھ نہیں لینا مجھے آپ چاہیے تھے اور وہ مجھے مل گئے بس۔“ عینی کو جمل کی بات نے ٹھکنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس نے حقیقت جمل کے سامنے رکھ دی تھی جمل کو اپنے خواب پل بھر میں ٹوٹنے نظر آئے تھے۔

☆☆☆

آئی سی یو روم کے باہر کھڑی وہ دروازے پر سرخ بیخ کر رہی تھی اس کے اپنے فیصلے نے اسے آج کس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا اس کا معصوم بچہ کمرے میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا ہمدانی صاحب دوسرے دونوں بچوں کو کھر میں ملازمہ کے پاس چھوڑ آئے تھے اور خود اس کے پاس بیٹھے وقت کی ستم ظریفی دیکھ رہے تھے۔ بکھرے بال چہرے پر سیاہ دجے سوچی ہوئی آنکھیں وہ تو وہ عینی لگ ہی نہیں رہی تھی جسے وہ جانتے تھے گلاب کی طرح کھلا چہرہ شرارت کرنی نہیں گلابی ہونٹ وہ مزید کچھ سوچتے مگر ان کی یادوں کے تسلسل کو ڈاکٹری کی آواز نے توڑا تھا۔

”بچے کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟“ پیشہ وارانہ لہجے میں دریافت ہوا تھا۔

”جی میں میں ماں ہوں اس کی۔“ عینی نے اٹھتے ہوئے ہنسنے سے جواب دیا تھا ”ایم سوری محترمہ ہم آپ کے بچے کو نہیں بچا سکے بچے کی بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی صلاحیت 24 سے 36 گھنٹے ہوتی ہے مگر۔“ وہ اور بھی بتا جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے عینی دیوانوں کی طرح چہنچہ گئی تھی۔

”میرا دانیال نہیں مر سکتا جھوٹا ہونے ہو تم لوگ ملے

ہوئے ہوتم لوگ جمل سے۔ میرا بیٹا میرا بیٹا نہیں۔“ کہتے ہوئے وہ ہمدانی صاحب جو اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے ان کی ہانپوں میں جھول گئی تھی ماں کی گود اجڑ جائے تو وہ بھلا تاب کہاں لاسکتی ہے۔

ہمدانی صاحب کے سر پر بھی آسمان ٹوٹ پڑا تھا ایک تو عینی کی حالت اور اوپر سے دانیال کی موت ان کے اندر بہت کچھ ٹوٹا تھا۔

بہت ہمت کر کے انہوں نے علی کو فون کیا تھا۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی وہ پریشانی سے اٹھ کر فون کی طرف گیا تھا نا جانے کیوں اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا الارم بجا کر اسے آنے والے طوفان کے لئے تیار کر رہی تھی۔

”ہیلو۔“ علی نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے بہت ڈھیلے سے انداز میں کہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں ہمدانی انکل میں ابھی آ رہا ہوں آپ عینی کو سنبھالیے۔“ علی نے ہمدانی صاحب کی بات سن کر جو اس باختہ ہو کر ان کو کہا تھا وہ فوراً ہسپتال کی طرف نکل گیا تھا اپنی بہن کے پاس جو اسے سوتیلے ہونے کا احساس دلا کر اس سے سارے رشتے ناٹے توڑ گئی تھی۔

”کیا ہوا جو آپ نے شادی کر لی میں نے کیوں ان کو چھوڑ دیا ان کے حال پر میں اس کی خبر پڑھتا تو شاید جمل اسے تنہا سمجھ کر اس کے ساتھ یہ سب نہیں کرتا۔“ وہ خود سے ہمسکام تھا کرب اس کی روح میں سرایت کر گیا تھا۔ بہن کی بربادی کا ذمے دار وہ خود کو ٹھہرا رہا تھا۔

☆☆☆

اس ذات کا بلاوا تو اٹل ہے جس کو کوئی کچھ بھی کر کے نہیں روک سکتا۔

عینی کو سسکتا بلکتا چھوڑ کے دانیال بھی منوں مٹی تلے جا سوا تھا۔

کچھ یاد آنے پر عینی نے اپنے جسم کو نوچنا شروع کر دیا پاس بیٹھی خواتین نے اسے سنبھالا مگر وہ چلا کر بس ایک ہی بات دوہرا رہی تھی۔

”نوج ڈالوں گی میں ان رگوں کو جس میں خون کی جگہ اس کی محبت دوڑا کر رہی تھی چھوڑ دو مجھے۔“

نجانے کب سے علی اسے دیکھ رہا تھا اس سے رہنا گیا

تو آگے بڑھ کر اس نے عینی کو پکڑ کے اپنے سینے سے لگا لیا تھا وہ بھی نرم سلس محسوس کر کے پرسکون ہو گئی تھی۔
”بھائی میرا ادنیال۔“

”کیا کر رہی ہو عینی؟ ادنیال اتنی ہی ذمہ داری لے کر آیا تھا فہد اور آیان کی خاطر خود کو سنبھالو۔“ علی نے اسے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔

عینی تو جیسے خواب سے جھگی تھی اس نے نظر بھر کر بھائی کو دیکھا تھا اور خاموش ہو گئی تھی اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی کیسے اس نے علی کو سوتیلے ہونے کا احساس دلایا تھا اور وہ منہ سے اف بھی ناکر پایا اور خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

”اب اجازت دیں باجی ہم کل صبح آ جائیں گے۔“ ایک عورت نے آگے بڑھ کر عینی کو گلے لگاتے ہوئے اجازت چاہی تھی وہ بمشکل اپنے آپ کو حال میں لاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا پاتی تھی۔

”چلو تم بھی جاؤ بچوں کے پاس ان کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔“ علی نے بے حد نرم لہجے میں کہا تھا۔

”نہیں نہیں آپ ایسے کیوں کر رہے ہیں مجھے ماریں اس گھر سے دھکے دے کر نکالیں اور کچھ نہیں تو تو نفرت سے منہ ہی پھیر لیں۔“ وہ روٹی روٹی پھر سے دیوانی ہو رہی تھی۔

”عینی سنبھالو خود کو مجھے بہت تکلف ہو رہی ہے مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تمہیں روتا دیکھ سکوں۔“ علی نے کرب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

”صاحب باہر کوئی حضور فیوم آپ سے اور عینی بی بی سے ملنے آئے ہیں۔“ ملازمہ نے آکر اطلاع دی تھی ان دونوں نے چونک کر ملازمہ کی طرف دیکھا تھا علی نے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا اور خود عینی سے مخاطب ہوئے تھے۔

”جاؤ بچوں کے پاس تم۔“

عینی نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور کمرے کی طرف چل پڑی تھی

کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ فہد بیڈ سے اتر کر اس کی طرف بھاگا تھا۔

”ماما دادنیال بھائی کہاں ہیں؟ صبح سے آپ بھی نہیں

آئی۔“ فہد نے معصومیت سے اس سے لپٹتے ہوئے سوال کیا تھا تبھی علی بھی صفدر کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے فہد کا سوال سن لیا تھا یعنی پھر آنسو بہانے لگی تھی

”آپ کے بھائی اللہ پاس ہیں بیٹا۔“ علی نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”اللہ تو اسے کھانا دیں گے نا؟“ پریشانی لیے لہجہ میں فہد بہت تکلیف دہ بات کر گیا تھا۔

”ہاں بیٹا بالکل دیں گے۔“ علی نے خود کو سنبھالتے ہوئے پیار سے جواب دیا تھا۔

صفدر نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں پر ضبط کیا تھا۔ دشمن جان کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا تھا

عینی کو بھی علی کا صفدر کو یوں اس کے پاس لے کر آنا اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ اس کا برلا اظہار نہیں کر پاتی تھی اس کی پوری کوشش تھی کہ صفدر اسے مخاطب نہ کرے۔

صفدر کو اس کی آنکھوں میں ناگواری کی جھلک صاف نظر آئی تھی اظہار افسوس کے فوراً بعد اس نے اجازت چاہی اور نکل آیا۔

گاڑی چلاتے ہوئے بار بار اس کی نظروں کے سامنے عینی کا سراپا آ رہا تھا وہ کتنی بدل گئی تھی خود سے بے نیاز آنکھوں پر لال ڈورے ڈالے پونے سو جن کی وجہ سے اندر دھنسن کر عجیب و غریب سا تاثر دے رہے تھے۔

☆☆☆.....

کیسے کیسے خواب سجائے تھے اس نے اپنی آنکھوں میں جب وہ سارا دن بیٹھ کر رنج و کام میں مصروف دیکھتی تو اسے وہ اور بھی دل کے قریب محسوس ہوتا۔

لڑکیوں کی طرف تو وہ بہت کم دیکھتا تھا مگر جب بھی چور نظروں سے وہ عینی کی طرف دیکھتا وہ اس کی چوری پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا لیتی۔

اس کے دل میں بچوں سے کھلنے لگتے ایک ایک ٹکڑا جاتا مسکراہٹ تو گویا اس کے ہونٹوں سے چٹ جاتی تھی۔

شادی کے بعد وہ محل و رہائش نہیں تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی تھا ہوٹل میں سویرا نظر آنے والا چمچ

مگر میں دھوئی اور بنیان پہنے رکھتا وہ پریشان حال بھی

کچھ فکر پر بھی خوش ہو جاتے ہیں یہ محبت ہی تو ہے جو اپنا آپ منواتی ہے۔

☆☆☆

وہ بڑے دنوں سے گاؤں میں ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا بڑی ہمت کر کے آخر ماں نے پوچھ ہی لیا۔

”وئے بجل پتر تو شہر کیوں نہیں جانا (جانا) اب دوہائی اور بچیاں نوں کہاں جھڈ آیا ہے (دہن اور بچے کہاں چھوڑ آئے ہو)۔“

”اماں تجھے بھی نامیرا سکون برداشت نہیں ہوتا جب دیکھو مجھے یہاں سے نکالنے کو ہی لگی رہتی ہے“ اس نے بڑے تیز لہجے میں جواب دیا تھا۔

”بس دی کر دئے چلا جاو نکال تیری بہو نے پھر میرے سر پر بیٹے کا لہجہ چڑھا دیا ہے خود تو سارا کچھ بھائی کو دئے آئی ہے میں کہاں سے خرچے پورے کروں بھلا۔“ اس نے عجیب جاہلانہ انداز میں کہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے پتر تو یو (باپ) کا ماں ہوتے ہیں کیلے (پاکل)۔“ اماں بی نے سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا تھوڑی دیر وہ اس کی کسی بات کا انتظار کرتی رہی مگر جب وہ چپ ہو گیا تو منہ میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پتہ نہیں کس نے نکالا ہو گا ان کو مر ہی جائیں تو اچھا ہے میری بلا سے“ اس نے برا سانسہ پٹاتے ہوئے سوچا تھا مگر اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا تا کہ صورت حال کا جائزہ لے سکے۔

☆☆☆

علی اپنی بہن کو اتنی تکلیف میں دیکھ کر ہر وقت کرب کا شکار رہتا تھا کسی بھی پل اسے چین نہیں آتا تھا ایمان میں تو اس کی جان تھی جب جب وہ اسے دیکھ کر ہنستا اسے ایسا لگتا جیسے اس پر پھولوں کی برسات ہو رہی ہے۔ وہ عینی کے مستقبل کے بارے میں وہ بہت پریشان رہنے لگا تھا اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں وہ محسوس ہو بارہ اس کی بہن کی زندگی میں شامل نہ ہو جائے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے عینی سے دو نوک بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ انہی

اسے سمجھاتی تو کبھی خود کو اس باجول میں ڈھالنے کی ہر کوشش اسے بے کار نظر آنے لگی تھی یہی اس کو ماں بننے کی نوید ملی اور وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی..... مگر وہ خوشی بھی اسے اس نہیں آئی تھی بجل نے پہلے بیٹے کی پیدائش پر اسے وہ تھکا دیا تھا جسے باکروہ نہ حال ہوئی تھی۔

تب اس نے پہلی بار سوچا تھا

”عینا کل یہ تم نے کیا کر دیا۔“

☆☆☆

رات کی تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا کرسی پر بیٹھے اس شخص کی حالت میں زہر بھر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی آنکھوں کی نیند کا مظہر پاس میز پر بڑی چائے اٹی بے کسی کارونا رو رہی تھی کمرے کی لائٹس آف تھیں سورج کی شعاعیں پردوں کا سینہ چیرتی ہوئی اس پر پڑ رہی تھیں بالکل اسی طرح جیسے ساری رات اس کی یادیں اس کا سینہ چیرتی ہوئی اسے اپنے ہونے کا احساس دل رہی تھیں۔

”تو کیا میں اب ہتھیار ڈال دوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

”تم نے پہلے کب ہتھیار اٹھائے تھے تم نے تو ہتھیار اسی دن ڈال دئے تھے جس دن تمہارا دل اسے دیکھ کر پہلی بار دھڑکا تھا اسے دیکھ کر جب تم نے محبت جیسی خطا کرنے کی کوتاہی کی تھی اب تو منزل ہے یہ اس کو پالو کہیں پھر سے اسے وہ درندہ ناک لگ لے جیسے تم پانچ سالوں سے خواب میں عینی کو لگتے دیکھتے آرہے ہو۔“

اس کے دل کا جواب آیا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا تھا وہ کسی بھی نتیجے کی پروا کئے بغیر وہ فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

کتنا دکھ تھا..... کتنی تکلیف تھی..... اس کے دل میں۔ جب جب وہ عینی کو اس شخص کے ساتھ تصور کرتا اس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر دوڑنے لگتا۔ مگر اب جب وہ اس سے دور تھی تو وہ اسے دوبارہ اس کے پاس جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

محبت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی آنا کو چکنا چٹا ہے تب جا کر بڑے انتظار کے بعد۔ محبت آپ کی جھولی میں ایسے ڈال دی جاتی ہے جیسا بچا کچھانگر۔ مگر محبت کرنے والے اپنے دل و جان سے کسی کو چاہنے والے اس بچے

خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک عینی دستک دیتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
 ”ارے واہ کیا خوب عمر پائی ہے تم نے میں ابھی تمہاری طرف ہی آنے کا سوچ رہا تھا“ علی نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا تھا۔
 ”ایسی کیا بات ہے بھائی جو آپ کو پریشان کئے ہوئے ہے میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں آپ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتے ہیں۔“ عینی اس کے پاس بیٹھتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”عینی میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی زندگی اس شخص کے لیے خراب کرو اس لیے میں نے اور ہمدانی انکل نے مل کر ایک فیصلہ کیا ہے کہ“ وہ لہجہ بھر کے لیے غصہ اٹھا۔
 ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم محل سے خلع کا مقدمہ درج کروادو۔“ کہہ کر اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ خود اپنے منہ سے بھی اپنی بہن کو طلاق کا کہے گا۔
 عینی سن کر سکتے میں آگئی تھی یہی جنگ تو اس کے ذہن میں بھی چل رہی تھی اس کے بٹنے کا جو دو خاک میں ملتے ہی اس کی محبت بھی خاک میں مل گئی تھی اس نے اس شخص کے لیے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

”اگر تم نہیں چاہتیں ایسا تو میں تمہیں فورس نہیں کروں گا۔“ علی نے اپنے خدشات کو دباتے ہوئے کہا تھا۔
 ”نہیں بھائی مجھے آپ کا اور ہمدانی انکل کا فیصلہ منظور ہے اس شخص سے محبت کرنا میری زندگی کی بہت بڑی غلطی تھی“ عینی نے بہت ہمت جتا کر آخر کار جواب دے دیا تھا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی زندگی اپنی غلطیاں سدھارنے کا دوسرا موقع بہت کم لوگوں کو دیتی ہے تم خوش قسمت ہو جو تمہیں زندگی دوسرا موقع دے رہی ہے۔“ علی کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی اسے عینی سے اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔

عینی نے حیرت سے اسے بھائی کو دیکھا تھا کون کہتا ہے سو تلے رشتوں میں محبت نہیں ہوتی اگر کچھ نہیں ہوتا سو تلے رشتوں میں تو وہ تربیت ہوتی ہے اگر ماں غیر جانبدارانہ انداز میں تربیت کرتی ہے تو وہ رشتہ محبت اور

خلوص سے گندھتا چلا جاتا ہے۔

عینی نے اس بات کو دل سے تسلیم کر لیا تھا وہ خاموشی سے مزید کچھ کہے نہ لگتی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں یہ بات آج آئی تھی کہ فیصلے کرنا مشکل نہیں ہوتے بلکہ فیصلے نبھانے کے لیے ہمت چاہیے ہوتی ہے جو اس نے کر لی تھی اس شخص سے ہمیشہ کے لیے رشتہ توڑنے کے لیے۔

.....☆☆☆.....

وہ گاؤں سے واپس آیا تو مکان کے باہر تالا نہیں لگا ہوا تھا اپنا منہ مقرر میں چپائے وہ کسی خطرناک مجرم کی طرح دکھائی دے رہا تھا تالا کھلا دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا وہ خاموشی سے مقرر اتارتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تھا اور عینی کو آواز دی تھی۔

اچانک برآمدے سے ایک عورت نکل کر باہر آئی تھی۔ ”اوئے کون ہو تم جو بنا پوچھے گھر میں داخل ہو گئے ہو؟“ عورت نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے التان سے سوال کیا تھا۔
 ”ہمارے ہی گھر میں کھڑے ہو کر ہم سے ہی سوال پوچھ رہے ہو۔“ وہ عورت مزید آپ سے باہر ہوئی کسی محل کی سمجھ میں جیسے سب کچھ آ گیا تھا۔

”آپ اس گھر میں نئے کرائے دار ہیں؟“ محل نے خدشات بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اب کے اس عورت کے مزاج میں بھی نرمی آئی تھی۔

”ہاں جی۔“ اس نے بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔
 ”اچھا معذرت چاہتا ہوں۔“ عجلت سے کہتے ہوئے وہ باہر نکل آیا تھا۔

بہت سوچ سمجھ کر وہ عینی کے میکے کی طرف چل دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا اس گھر کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے اگر وہ زندہ ہوئی تو وہاں ہی ہوگی۔

اس کا شک درست ثابت ہوا تھا جب اس نے فہد کو گاڑی میں اسکول سے واپس آتے دیکھا تھا۔

”واہ تو مہارانی یہاں عیش کر رہی ہے مجھے تو ایک دن یہ سب عیش نصیب نہیں ہونے دیا اور اسے بیٹوں کو دیکھو گاڑیوں میں گھما رہی ہے۔“ اس نے سگتے ہوئے سوچا

تھا۔

”یعنی۔“

”تم نا بھی بتاتیں تو مجھے پتہ چل گیا تھا۔“ لہجے میں شرارت جھلک رہی تھی۔

”وہ بھائی کو پولیس لے گئی ہے انہوں نے جمل بہت مارا تھا آپ پلیز جا میں ان کی ضمانت کروالائیں۔“ یعنی نے اس کے لہجے سے اکتاتے ہوئے جلدی سے کام کی بات کی تھی جس کے لیے اس نے فون کیا تھا۔

”اچھا آپ پریشان نا ہوں میں ابھی جاتا ہوں۔“ صفدر نے غلٹ سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

فورا اٹھ کر اس نے گاڑی نکالی تھی اور تھانے کا رخ کیا تھا۔

نجانے کیا سوچ کر وہ گیٹ پر آ گیا تھا مگر گیٹ کپڑے اسے اندر جانے سے روک لیا تھا۔

تجبی علی بھی ہوٹل سے واپس آیا تھا اور اس شخص کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا فوراً گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے اس پر کھول اور لائق کی بھر مار کر دی تھی شور مچاتی بھی باہر نکلی تھی اور جمل کو مار کھاتا دیکھ کر فوراً اندر بھاگی تھی اور پولیس اسٹیشن فون کر کے انہیں بلایا تھا کیونکہ جو بار وہ کھا رہا تھا وہ اس کے لیے کافی نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کے ہاتھ اس کے خون سے آلودہ ہوں۔

فہد بار بار علی کو ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔

”ماموں اسے اور مارے یہ ماما کو بھی ایسے ہی مارتا تھا۔“

سب کچھ خود بخود سمجھ جاتا تھا جمل کو بیوی اور بچوں پر تشدد کرنے اور بیٹے کی موت کی تمام وجوہات عدالت میں پیش کرنے پر 25 سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔

ساتھ ہی ساتھ یعنی کو طلاق دینے کا بھی حکم صادر کیا گیا تھا۔

جمل چلا چلا کر یعنی کو آوازیں دیتا رہا مگر یعنی نے پلٹ کر واپس نہیں دیکھا۔

بالکل اسی طرح جس طرح اس کا بیٹا چنچا رہا مگر وہ کچھ نہیں کر سکی

علی اور ہدانی بالکل ہر پل اس کے ساتھ کھڑے رہے تھے صفدر رقوم نے اس دن فورا علی کو رہا کر دیا تھا جس کے لیے وہ اس کی بہت شکر گزار تھی اب وہ کوئی بھی فیصلہ خود نہیں کرتی تھی چاہے وہ فہد کے اسکول کے سلسلے میں ہو آیان کے چیک اب کے سلسلے میں وہ ہر بات علی سے محل کر ڈسکس کرتی اور کل کر کوئی فیصلہ کرتے۔

اس کی عدت ختم ہونے والی تھی وہ چاہتی تھی کہ اب جلد از جلد بھائی کے سر پر ہر سہرا سجا دیکھ لے بھائی کی شادی کے ارمان ماں کے علاوہ بہنوں کو ہی ہوتے ہیں اس کے بھی سب ارمان جاگ گئے تھے۔

انہی سوچوں میں گھری تھی کہ فہد علی کے ساتھ کھیلا ہوا اندر داخل ہوا ان دونوں کو ہنستا سکراتا دیکھ کر وہ جی سی ٹھنکتی تھی وہی۔ ایک کک ایک کی اس کے دل کو

تجبی پولیس سائرن کی آواز گونجی تھی اور انہوں نے جلدی سے اتر کر علی کو اس سے دور کیا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے علی کے سر پر خون سوار ہو کتنا کڑھتا تھا وہ اپنی بہن کو دیکھ کر آج وہ اچھے ہوئے جذبات اس صورت میں ہے تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

پولیس نے فوراً بے سدھ پڑے جمل کو گرفتار کر لیا تھا۔

”علی صاحب ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ اس طرح قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ آپ کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ پولیس اہلکونے آکر علی تا سرف سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”چلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ علی نے فوراً ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا تھا۔

یعنی کو ایک دم سے عجیب سی تنگی نے گھیر لیا تھا اندر جا کر اس نے ہدانی بالکل کو فون ملایا مگر کوئی بھی رسیو نہیں کر رہا تھا۔

نجانے اس کے ذہن میں کیا سائی کے اس نے وہ نمبر ڈائل کر دیا جس نمبر سے اسے زندگی میں صرف ایک بار کال آئی تھی مگر اس کے تمام الفاظ اسے حرف با حرف یاد تھے۔

تیل گئی تھی تیسری تیل پفون اٹھا لیا گیا تھا۔

”ہیلو۔“

”وہ میں بات کر رہی ہوں۔“

”وہ آپ کون بات کر رہی ہیں؟“

Digitized by Google

”مگر ہمدانی انکل۔“

”ایک بار پھر ہمارے فیملے کو مت جھٹلاؤ یعنی ہم تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتے۔“ ہمدانی انکل نے اسے ٹوکتے ہوئے دھکے سے کہا تھا۔

علی خاموشی سے ہمدانی انکل کو دیکھ رہا تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں جہادِ خیال جاری تھا

”جیسے آپ کی اور بھائی کی مرضی انکل مگر بس ایک بات کا خیال رکھنے کا میں اپنے بچوں کو ہرگز نہیں چھوڑ دوں گی۔“ یعنی تیزی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اس نے لپک کر آیا سے آیان کو پکڑا تھا جس نے رورو کر برا حال کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

سارا کچھ خاموشی سے طے کر دیا گیا تھا صفدر نے جب فون کر کے نکاح کی اطلاع دی تو اسے 440 واٹ کا جھٹکا لگا تھا۔

”کیا کیا کہا ہے تم نے مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا؟“ عامر نے حیرانگی سے کہا تھا۔

”مان لے میرے دوست محبت اگر جی ہو تو مل ہی جاتی ہے۔“ صفدر نے سرور لہجے میں کہا تھا۔

”میں آکر ملتا ہوں تجھ سے۔“ خوشی سے کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا تھا

صفدر لیوں پر مسکان سجائے اپنے دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا جو شادی ہونے کے بعد بھی نہیں بدلا تھا

محبت کو پالنے کا نشہ اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا وہی اس کے دل میں خوف کا ناگ بچپن پھیلا کر بیٹھا تھا

کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے وہ بھی تو کھو دینے کا اب تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ اس کے لیے پہلے دن کی طرح ہی حسین تھی اس کے دل کی ملکہ بن کر وہ چھپلے 6 سالوں سے حکمرانی

کرتی آ رہی تھی گھر والے بھی صفدر کی 6 سالوں کی شادی نا کرنے کی ضد ٹوٹنے سے خوش تھے

وہ اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر اپنی اور اس کی خوشی بھیک مانگ رہا تھا اب اسے وہ خود سے بھی جدا نہیں ہونے

دینا چاہتا تھا

یعنی نے دل کڑا کر کے صرف بھائی اور انکل کا مان رکھنے کے لیے شادی کی ہامی بھرتو لی تھی مگر وہ پہلے تجربے

ویران کر جاتی تھی۔

”فہد کی ماما کن سوچوں میں کھوئی ہوئی ہیں۔“ علی نے پاس آکر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا تھا

”میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نا آپ کی شادی کر دی جائے۔“ یعنی نے مسکراتے ہوئے علی پر نظریں لگاتے ہوئے کہا تھا

”ارے واہ ماموں کی شادی ماموں کی شادی۔“ فہد نے باقاعدہ وصال ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

اسے وصال ڈالتے دیکھ کر دونوں کھٹکھٹا کے ہنس دیے تھے۔

”فہد جاؤ بیٹا باہر کھیلو مجھے آپ کی ماما سے بات کرنی ہے۔“ علی نے پیار سے اس کے سر پر چٹ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ ناچتا ہوا باہر نکل گیا تھا تبھی دروازہ ٹاک کرتے ہوئے ہمدانی انکل اندر داخل ہوئے تھے۔

”کیا حال ہے میرے بچوں کا؟“ ہمدانی انکل نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہم تو ٹھیک ہیں مگر اب آپ بہت دنوں بعد آئے ہیں۔“ یعنی نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بس عمر کا تقاضہ ہے بیٹا اب محبت ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے میرا۔“ ہمدانی انکل نے کمزور لہجے میں جواب دیا تھا۔

”ہمدانی انکل اللہ اکبر محبت دے آپ نا ہوتے تو۔“ علی نے دانت بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”بس بیٹا! اب تو ایک ہی خواہش ہے جنہیں اور یعنی بچے کو اپنے گھر میں بست دیکھ لو۔“ ہمدانی انکل نے اصل

بات کی طرف آتے ہوئے کہا تھا جس کے لیے ان کو دہاں بلایا گیا تھا۔

”میرا تو یہی گھر ہے اب انکل۔“ یعنی نے اداس لہجے میں کہا تھا۔

”بیشک یہ تمہارا گھر ہے مگر اب میں اور علی دونوں یہ چاہتے ہیں کہ تم شادی کر لو۔“ ہمدانی صاحب نے اسے

دونوں لہجے میں ساری حقیقت بتا دی تھی

کمرے میں جا کر اس نے اپنا بند کیا ہوا سانس بحال کیا تھا

”یا اللہ یہ کیسا امتحان ہے اتنے امتحانوں کے قابل نہیں ہوں میں مجھ پر رحم کر۔“ یعنی نے رب کے حضور گڑ گڑاتے ہوئے کہا تھا

رات قطرہ قطرہ پھل رہی تھی سورج کی کرنیں رات کے آندھیرے کو اپنے اندر پیچ رہی تھی

دونوں اپنے اپنے طریقے سے رب کے حضور گڑ گڑا رہے تھے

.....☆☆☆.....

علی کے فون نے اسے اندر سے دہلا دیا تھا وہ اسے اپنے اتنے قریب آتا محسوس کر کے اب پھر خود سے دور جانے نہیں دینا چاہتا تھا اس تصور سے ہی اس کی جان لگنے لگی تھی

وہ یعنی کو پانے کے لیے اب کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا وہ پہلے کی طرح اب اس کے راستے سے ہٹنے کو کسی طور پر تیار نہیں تھا۔

فیصل کن انداز میں سوچتے ہوئے وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

دل کا اضطراب کسی صورت کم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

یعنی کے بھی دل دو مارے میں ایک جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔

مصدر کو ٹھکرا اس نے جمل کو فقیہ دی تھی اب جب وہ ایک بار پھر دو بچوں کے ساتھ کسی کی خطرگی تو مصدر پھر سے اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

آیان کو صبح تیز بخار ہو گیا تھا وہ ایک بار پھر سے سولی پر لٹک گئی تھی وہ پہلے سے بہت زیادہ حساس ہوئی تھی فہد اور آیان کو ذرا سا کچھ ہوتا تو اس کو اپنی جان لگتی محسوس ہوتی تھی۔

جب وہ اٹھی تو علی ہوٹل جا چکا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یعنی سے بہت خفا ہے فہد کو تیار کر کے اس نے ڈرائیور کے ساتھ اسکول بھیج کر وہ آیان کو تیار کرنے لگی تھی۔

باہر جیسے ہی گاڑی کا بارن ہوا وہ تیزی سے آیان کو اٹھا کر نکل آئی تھی بیک ڈور کھول کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اس کا دھیان صرف اور صرف آیان کی طرف تھا جو بخار کی وجہ سے بے سندھ سا ہو گئی تھی اللہ نے شاید ابھی اس کی

سے بہت خوفزدہ تھی بیٹی کی خواہش میں وہ شخص اسے کہاں سے کہاں لے آیا تھا

گہری نیند میں جب جب آیان بھوک سے روتا اسے لگتا جیسے اسے کسی نے جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا ہو ساری رات وہ اسی خوف سے کہی آیان بھوک سے رونا پڑے جاگ کر گڑا رہی تھی

رات کے تاجا جانے کو نے پھر وہ گھبرا کر جاگ اٹھی تھی دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی نکل اس کے گلا دبا رہا تھا

وہ کسی چیز یا کی طرح سہم کر ارد گرد دیکھ رہی تھی کچھ دیر بعد جب اس کے ہوش بہال ہوئے تو اس نے پانی پینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر جک خالی تھا

ہمت جمع کر کے وہ پکن کی طرف گئی تھی فریق سے پانی نکالا اور گلاس میز پر رکھ کر پانی ڈالنے لگی مٹی پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں اس نے اپنے خشک ہالک میں اٹھایا تھا وہ واہیں جانے کے لیے مڑی ہی تھی کے پکن کے دروازے پر علی کو کھڑے دیکھ کر اس کی پیچ لگنے لگنے لگی تھی

”آپ نے تو ڈر دیا مجھے بھائی۔“ یعنی نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا

”ڈرنا چھوڑ دو زندگی ڈرنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔“ علی نے دروازے سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر رکھتے ہوئے کہا تھا

”ہر کوئی آپ جیسا بہادر نہیں ہوتا بھائی۔“ یعنی نے افسردہ لہجے میں کہا تھا

”میں نے مصدر سے تمہارے نکاح کی ڈیٹ فکس کر دی ہے۔“ علی نے بڑی ہمت جتا کر اسے بتایا تھا

”مگر بھائی۔“

”وہ دونوں بچوں کو باپ بن کر پالنے کو تیار ہے تمہیں بہت خوش رکھے گا یہ سب باتیں آج ماں ہوتی تو تمہیں شاید مجھ سے بہتر سمجھا سکتی“ علی نے اس کو ٹوکے ہوئے کہا تھا

ماں کا ذکر کرتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گیا تھا

یعنی کی آنکھیں بھی پر نہ تھیں

”میں آپکو سوچ کر بتاؤں گی تب تک پلیز آپ یہ سب روک دے“ کہتے ہوئے وہ پکن سے باہر نکل گئی تھی

آزمائش ختم ہی نہیں کی تھیں ابھی اس نے ایسا سوچا ہی تھا کہ آواز آئی تھی۔

”اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزماتا ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اس نے آزمائش کے لیے تمہیں اور مجھے جن رکھا ہے۔“ بہت پیار بھرے لہجے میں اس کے خیالات کی تردید کی گئی تھی

یعنی ایک دم سے چوکی تھی۔ وہی لہجہ وہی آواز نظریں اٹھا کر اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اس شخص پر پہلی بار نظر ڈالی تھی اپنی جلجت پر اسے جی بھر کر غصہ آیا تھا۔

”بندھا میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ تو بس آپ نے جلدی میں کچھ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔“ صفر نے اسے وضاحت دی تھی۔

”پلیز صفر مجھے جلد از جلد ڈاکٹر کے پاس جانا ہے آیان کی طبیعت مجھے بہت پریشان کر رہی ہے۔“ عینی نے اس کو اکڑ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی توجہ آیان کی طرف مبذول کی تھی۔

”اچھا بس آپ پریشان مت ہوں۔“ شائستہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے گاڑی کی سپیڈ بڑھائی تھی۔

☆☆☆.....

”موسم میں تبدیلی کی وجہ سے ہلکا سا فلو اور ٹیبر پکڑ ہے۔“ پروفیشنل آنداز میں میں ڈاکٹر نے ان کو ٹولی دی تھی۔

”بے سدھہ سا کیوں ہے پھر یہ۔“ عینی کی پریشانی جو کہ تو تھی

”بس آپ اس کا خیال رکھیں اور سردی سے بچائیں۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس ساری گفتگو میں وہ خاموشی سے بیٹھا مسکراتا رہا تھا۔

”آپ کی مسر ز بہت کبیر تک ہیں۔“ ڈاکٹر نے ان دونوں کو مسکراتے ہوئے کہا تھا

عینی نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ صفر نے شکر یہ کہہ کر اجازت چاہی تھی

عینی اپنا غصہ صبر کرتے ہوئے اس کے پیچھے ہی نکل آئی تھی

”بتانے کیوں نہیں دیا آپ نے مجھے؟“ عینی نے باہر آتے ہی صفر سے سوال کیا تھا

”اس کی غلط فہمی تو۔“

”گاڑی میں بیٹھو۔“ صفر نے اس کی بات کاٹ کر

سجیدہ لہجے میں کہا تھا

یعنی اس کے بدلے تیور دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی چپ چاپ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہی میں آفیت جانی تھی

وہ بھی دروازہ زور سے بند کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا

”آج سے چھ سال پہلے جانتی ہو میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟“ صفر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا

”مگر آپ۔“

”نہیں عینی آج تمہیں سننا ہو گا وہ سب کچھ جو تم جان کر بھی انجان بنی رہی میں نے کہا تھا تمہیں کے میں منتظر

رہوں گا تم لوٹ کر آؤ گئی مجھے یقین تھا میری محبت اگر قوتی ہوتی تو آج میں یوں تمہارے سامنے نہ ہوتا میں نے ہر پل

ہر دعا میں تمہیں مانگا ہے تمہاری خوشی میں کوئی روکاؤٹ کھڑی نہیں کی تو اب کیوں تم میری محبت کی راہ روکے

کھڑی ہو مجھے راستہ دو عینی مجھے راستہ دو میں بہت سہ چکا ہوں میری آزمائش ختم کر دو تمہاری بھی سب آزمائشیں

میں اپنی محبت سے جن لوں گا تمہارے دکھ اپنی جھولی میں ڈال لوں گا مگر اب بس کر دو۔“ اس کا لہجہ اس کے کرب کا

گواہ تھا۔

اس کی سرخ آنکھیں اس کی رت جلنے کی گواہ تھیں وہ کیسے جھٹلا دیتی اس کے کسی ایک لفظ کو بھی جب کے

اس پر ایمان تو وہ اس دن ہی لے آئی تھی چپ اس بند کرے میں اس کے بچے کی سانسیں بند ہو گئی تھیں اور اس

کے کانوں میں اسی کی آواز گونج رہی تھی

وہ آیان کو گود میں لیے اس کے کان دھے پر سر رکھ کے رو دی تھی۔ اس کی محبت کی گواہی تو آسان بھی دے رہا تھا

جہاں اچانک بہت سے آوارہ بادل سر جوڑے برسنے میں مگن تھے۔

دکھ، تنہائی، اور غم کے بادل چٹ گئے تھے۔



”لوگوں کی ہزاروں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ کسی کے افسانے واہ واہ سمیٹ رہے ہیں تو کسی کا ناول شہرت کے گن گار رہا ہے۔ ایک میں ہوں! جس کی کہانی کوئی بھی در کھٹکتا ہے تو ایک ہی جواب ملتا ہے۔ ناقابل اشاعت۔ ناقابل اشاعت۔ کسی کہانی کا نصیب کھل بھی جائے تو وہ سات آٹھ مہینے دھکے کھا کر اشاعت کی سیٹ تک پہنچتی ہے جہاں ستاروں کے جھرمٹ میں میری ٹھنڈی ہوئی کہانی کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے میرا یہ خواب مجھے اندھا کر دے گا۔ لکھ لکھ کر میرے اعصاب تھک گئے لیکن، عزت شہرت وہ آسمان ہے جہاں تک میری بولی کہانیاں کے ہاتھ ہی نہیں پہنچ پاتے۔ مجھے سخت ڈپریشن ہونے لگا ہے زوار۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میری ہنسی پٹی کہانیاں اور اُن کے ناکام کردار مجھے مار ڈالیں گے۔“ حنیبہ آندری روز کی طرح اپنی کہانیوں کو ناکامی کی آگ میں جلتا دیکھ کر خود کو جھلسانے لگی۔

”کم آن خنی۔ ایسا مت کہو! ایک دن تمہارا بھی نام ہوگا۔ تمہاری کہانیوں کے چرچے ہوں گے۔ تمہارے لکھے کردار لوگوں کی بات چیت کا حصہ بنیں گے۔ تمہارے گہرے لفظوں کا ہر دل برا اثر ہوگا۔ تمہارے کام کو ہر جگہ سراہا جائے گا۔“ اُس کے بڑے دکھ کے آگے زوار کی تسلی ہمیشہ کی طرح کھوٹی تھی وہی لہجہ وہی کوفت وہی الفاظ۔

”تم بھی جھوٹے ہو تم نے کہا تھا میری کہانی ”تعبیر“ کامیابی کے جھنڈے گاڑ دے گی، مگر اُس نے تو میرا خواب ہی چٹکا چور کر دیا۔ آج پانچویں جگہ سے جواب ملا ہے ناقابل اشاعت۔ یہ ساری چیزیں تم ہی رکھو، کیمرز کھیلو۔ گانے سنو۔ موویز دیکھو۔“ حنیبہ نے آنکھوں سے ٹکرائیں بھیگی ٹٹوں کو مزید بکھیر کر موبائل، لپ ٹاپ، زوار کی جانب پھینکے۔

”وہ کہانی بکواس تھی جی۔ میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ ایم سوری کہ میں نے تمہارا دل رکھا۔ یا تو تم لکھنا چھوڑ دیا کچھ ایسا منفرد لکھو جو تھمکے چارے۔“ زوار کے ہونٹوں پر جھوٹی شرمندگی کے ساتھ سچا مشورہ بھی تھا۔ بکواس کے اعتراف پر جہاں حنیبہ کی برستی آنکھیں غصے سے پھیل گئیں وہیں منفرد کے اشارے پر سرکرتے ہوئے سوچ میں ڈوبنے لگیں۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو مجھے کچھ الگ سا لکھنا چاہیے۔ کچھ انوکھا جو کسی کے دماغ کو سوال در سوال کے کھیل میں پھنسا کر چھپے راز سے پردہ اٹھائے۔ کچھ ایسا جو کسی کے دل کی ابھمی ہوئی گانٹھ کھول کر حیرت کا تماشا ختم کر دے۔ ایک ایسی کہانی جو میرے لیے تمغہ ہو تو مجھ پر ہنسنے والوں کے منہ پر طمانچہ۔ ایک ایسی طوفانی کتھا جس کے آگے باقی کہانیاں سہم جاویں۔“ اب اُس نے بالوں کو سلیقے سے سمیٹ کر لاواہنے خیالات کو پرسکون کیا۔

”بالکل جی کچھ ایسا لکھو جو کسی نے نہ سنا ہو نہ پڑھا ہو نہ لکھا ہو۔ جو من گھڑت ہو کر بھی من میں مل چل کر دے، جو حقیقت ہو کر بھی حقیقت نہ لگے۔ کوئی پڑھے تو حیران ہو کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کوئی نے تو یقین کرے میرے ساتھ بھی یوں ہوا تھا۔“ حوصلے کی ڈپٹی کستی پار لگانے میں زوار کا کردار اُسے آہستہ آہستہ نئی کہانی کے کنارے تک لا رہا تھا۔

”ہاں! زوار اب تک شاید میں نے اپنے ہنر کو ٹھیک سے آزمایا ہی نہیں۔ اب تک اپنی صلاحیتوں کا کڑا امتحان ہی نہیں لیا۔ میں مشہور ہوں گی، میں ہار نہیں مانوں گی۔ میں آج رات کچھ ایسا لکھوں گی جو کل میری زندگی کو یکسر بدل دے گا۔“ اُس نے مفلوج امید کو تھپک کر پیروں پر کھڑا کیا اور جوش و خروش سے کمرے میں بیٹھنے لگی۔

”سوچو! تم ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ سکتی ہو، تم حسین دماغوں کو لٹکار سکتی ہو۔“ زوار دھیرے دھیرے چلتے ہوئے قدموں کو دوڑنے پر اُکسار ہاتھ۔ پورے کمرے میں گھومتے، گھومتے وہ بے چین ہونے لگی۔ کبھی جوڑے کو کس کر منظر کا پھیلاؤ دیکھتی، بالوں کو نکھیر کر جلوں کی پینٹ سنواری، لٹوں کو کھینچ کر کرداروں کو سامنے رکھتی تو کبھی ہاتھ مسل کر عنوان کی بغض تھا متی، سر پکڑ کر آغاز انعام کے سرے پکڑتی، دل پر ہاتھ رکھ کر جذبات کی دھڑکن سنٹی۔ اچانک وہ چلتے چلتے رک کر بستر پر ڈھے سی غمی۔ زوار کو لگا وہ حوصلہ ہار چکی ہے، مگر کچھ دیر بعد اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوا جب حبیبہ کی ناامید آنکھیں ڈھانت اور شیطانیت سے چمکنے لگیں۔

”زوار میں نے ایک بہت ہی منفرد اور انوکھی کہانی سوچی ہے، لیکن میں تب ہی کامیاب ہو سکوں گی جب تم میرا ساتھ دو گے۔“ وہ بیٹھتے ہوئے اُس کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بولو! کیا کہانی ہے؟ اگر میرے ساتھ دینے سے تم اس پریشانی سے نکل سکتی ہو تو میں ضرور تمہارا ساتھ دوں گا۔“ زوار ایک اچھا شوہر ہونے کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تو سنو! یہ کہانی ہے ایک ناکام لکھاری عورت کی جو پریشان ہے، بد حال ہے اور دن بادلن ڈپریشن کے گڑھے میں گرتی جا رہی ہے۔ ایک رات اُس کا شوہر اُس کے خالی دماغ کو ایک کہانی سوتا ہے۔ اُس کی جھوٹی کہانیوں کے سامنے اپنی سچی کہانی رکھتا ہے۔ اُس کا حال سنوارنے کے لیے اپنا ماضی پیش کرتا ہے۔“

حبیبہ نے دونوں ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے اپنا خیال بیان کیا۔

”کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ یہ کس طرح کی کہانی ہے؟“ زوار نے اپنی حیران سوال کرتی ہوئی آنکھیں اُس کی کھوئی ہوئی آنکھوں پر لگا دیں۔

”زوار یہ تمہاری میری کہانی ہے۔ اس کہانی میں تمہارا کردار اتنا جاندار ہے کہ میرے مردہ حال اور مستقبل میں جان پڑ جائے گی تم نے بس یہ کہنا ہے کہ اپنے ماضی کے متعلق ہر بات کھول کر میرے سامنے رکھنا ہے۔ ہر جھوٹا عارضی شہر، ہر سچی طویل محبت۔“ حبیبہ دیے جانے والے سب دھوکے تمہاری کی مٹی ہر نا انصافی، وصل کی رد مان پرور گھڑیاں، ہجر کے اذیت ناک لمحات پھر میں اُس دکھ کرب اور محرومی کو محسوس کروں گی اور میرے ہاتھوں سے سیاہ ہونے والے یہ کاغذ میرے مستقبل کو تباہ کر دیں گے۔“ طرف کے ہاتھوں پر سچ بیانی کا تختہ رکھتی ہوئی یہ ایک دلچسپ کہانی ہوئی۔ ایک رائٹر اور اُس کے محبوب شوہر کے سچ محبت، مجھرو سے اور ذہنی ہم آہنگی کی اچھوتی داستان۔“ حبیبہ آٹھویں اپنی نرالی سوچ پر نازاں بھرتی سے لیپ ٹاپ آن کرنے لگی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کہانیاں صلاحیت سے لکھی جاتی ہیں، چالاکی سے نہیں۔ خود کو اٹھانے کے لیے تم مجھے اس حد تک گمراہی ہو۔ اپنے کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے تم ہمارے رشتے کو قتل کرنا چاہتی ہو۔ میرے دل میں تمہارے علاوہ کسی لڑکی کا خیال تک نہیں گزرا اور تم نے میری وفاداری کا امتحان لینے کا سوچ لیا۔ افسوس کہ تم نے بہت ہی بھونڈا راستہ اختیار کیا ہے۔“ زوار کو اپنی شرافت اور وقار پر کیے گئے اس حملے نے سخت برہم کر دیا تھا۔

”مڈل کلاس گھرانوں میں شہزادے پیدا ہو جائیں تو اُن پر مرثیے والی شہزادیاں بھی جنم لے لیتی ہیں۔ تمہاری متناطیس آنکھوں نے کسی دل کو اپنی جانب نہ کھینچا ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا، تمہاری گہری باتوں میں کسی کے ارمان نہ ڈوبے ہوں ایسا ممکن ہی نہیں۔ مکمل شخصیت کی کوئی ادھوری کہانی تو ضرور ہوتی ہے زوار۔ دیکھو! میں فرضی بھی لکھ سکتی ہو، لیکن جب تک تڑپوں کی نہیں تڑپ کا اثر لفظوں میں نہیں سمائے گا۔ فسانے میں جب تک حلقہ حقیقت کا تڑک نہ لگے درد کی خوشبو دور تک نہیں جاتی۔ مجھ پر مجھرو سے کرو، ہماری محبت پر کوئی آج نہیں

آئے گی۔ ویسے بھی شادی کے پانچ سال بعد، دس سال پرانے معاشقوں کی وہ بازگشت نہیں رہتی کہ ساتھیوں اور دل بے قرار ہو اٹھیں۔“ حبیبہ نے ذہانت کا ہر جال پھینکا تا کہ زوار کے اعتماد کو پوری طرح پھنسا سکے۔

”سٹرپس نے تمہارے دماغ کو اُس مقام پر لاکڑا کیا ہے جہاں تم اپنی سمجھ بوجھ کھورہی ہو۔ اپنے فائدے کے لیے تم رشتوں کو استعمال کرنا چاہتی ہو۔ کان کھول کر سن لو! میرا ماضی بالکل شفاف ہے۔ تمہاری دکان چکانے کے لیے میں اسے گندہ نہیں کر سکتا۔“ زوار اُس کی باتوں پر پہلے سے زیادہ بھڑکنے لگا۔

”جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو۔ اگر یہ کہانی چھپ گئی اور لوگوں میں مقبول ہوگی تو سوچو میرے کتنے فینز ہونگے۔ کیا پتا کسی پروڈیوسر کی نظر اس کہانی پر پڑ جائے، پھر ایسا سارے دار و دارمہ کون نہیں بنانا چاہے گا۔ زوار تم کب تک زندگی کی گاڑی اکیلے تھکیو گے، چار پیسے میں کمالوگی تو عیش و آرام کی رفتار اور بڑھ جائے گی۔ شہرت عزت اور پھر پیسہ۔ زیادہ مت سوچو! سب لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں اس بیٹھڑ میں چکی جاؤں گی۔ میرا ہاتھ تھا مو اور دوڑو۔“ زوار کے دل میں ناچاچے ہوئے بھی لالچ پیدا ہونے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حبیبہ کی ایک سہیلی کو ڈرامہ لکھنے کی آفر ہو چکی ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی کو اُس مقام پر دیکھنے کا آرزو مند تھا۔

”ٹھیک ہے جی، میں تمہیں اپنے ماضی کے متعلق کچھ باتیں بتاتا ہوں۔ ان باتوں کو چھپانے کا مقصد ڈرنا، خود کو برا ثابت کرنے سے بچانا یا تمہیں دھوکہ دینا ہرگز نہیں ہے۔ میں نے آج تک ماضی کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ میرے آج سے زیادہ اہم نہیں۔ یوں تو بتانے کو کچھ زیادہ نہیں ہے، مگر جو بھی ہے میں سچ بولوں گا۔ میں جانتا ہوں تم ایک بڑے دل کی عورت ہو۔ تمہاری سوچ کا پتہ نہ عام عورتوں جتنا نہیں۔ میں امید کرتا ہوں یہ سب سننے کے بعد تم بالکل بھی نہیں بدلو گی۔“ زوار کچھ ہچکچاتے ہوئے اُس کا ساتھ دینے پر پوری رح سے آمادہ ہو گیا۔

”یہ ہوئی نا اچھے دوست اور شوہر والی بات۔ میں کچھ اپنی انگلیوں سے تحریر کروں گی اور کچھ دماغ میں محفوظ کرتی جاؤں گی۔ پھر سارے ٹکڑوں کو جوڑ کر اس شہکار کو جلد ہی کامیابی کے سفر پر روانہ کر دوں گی۔“ حبیبہ نے لپ ٹاپ سامنے رکھتے ہوئے پورا منصوبہ خوشی سے سنایا۔

”میری زندگی میں محبت جب داخل ہوئی جب میں میٹرک میں تھا۔ اُس کا سنی آنکھوں والی کا نیا مکان ہمارے پرانے مکان کے بالکل ساتھ تھا، لیکن اُس کا اصل گھر تو میرے دل میں بن گیا۔ سب سے بڑا فرق عمر کا تھا۔ میں اُس وقت ایک طالب علم اور وہ ایک ٹیچر تھی۔ وہ بچوں کو جانے کیا پڑھاتی تھی، مجھے تو محبت سکھا گئی۔ یہ عمر سے بڑی بات کہنے کے لیے میرا بڑا ہونا بہت ضروری تھا۔ میں نوٹ بکس پر چھپ چھپ کر اُس کا نام لکھتا رہ گیا اور اُس نے ایک دن اپنا نام کسی اور کے نام کے ساتھ لکھوا لیا۔ میرا مکان تو بس پرانے سے نہ ہوا تھا، لیکن اُس کا تو گھر ہی بدل گیا۔ وہ سرخ پھول پہنے میرے دل میں کانٹے چھسو کر میکے سے سرال چلی گئی۔ بہت بارش ہوئی تھی اُس دن اندر باہر ہر جگہ۔“

زوار نے پھر پورا اعتماد کے ساتھ اپنی محبت کی پہلی داستان سنا ڈالی۔ ایک پل کے لیے حبیبہ کے دل میں ٹیس سی اٹھی، لکھتے لکھتے اُس کے ہاتھ لرزے، لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں کہ پہلی محبت کا بے جان وجود آج بھی تمہارے اندر کروٹ لیتا ہے۔ آج بھی جب بارش ہوتی ہے تو کرب کی بوندیں تمہاری آنکھوں سے چلتی ہیں۔ کم سن میں ایسی کہانی کا جنم لینا کوئی بڑی بات نہیں، اس لیے نہ سنانے والے کو برا محسوس کرنا چاہیے نہ سننے والے کو۔ اس ناکام محبت کے بعد کیا ہوا؟ کب دوسری بار محبت نے تمہارے دل پر دستک دی؟“ حبیبہ نے کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے ٹھگسار دوست کی طرح پوچھا۔

”دوسری محبت ہاں دوسری محبت۔ پہلی محبت اندھی ہو کر بھی دوسری محبت کے لیے روشنی دان کر جاتی ہے۔ میں بھی پرانے کھڑے جوڑ رہا تھا کہ میرا دل سبیل سے جڑ گیا۔ وہ مجھے کالج میں لے گئی۔ کیا کیا نہ کیا میں نے اُس کی خاطر۔ پیسے جمع کر کے نیا موبائل لے کر دیا، ہر اچھی جگہ پر کھانا کھلایا، ہر اچھی جگہ سے شاپنگ کروائی، مگر وہ ناشکری مجھے چھوڑ کر میرے دوست کے ساتھ چلی گئی۔ پہلی بار مجھے خوش گمانی نے ڈسا تو دوسری بار غربت نے۔“ زوار کے چہرے پر نفرت اور حسرت کے تاثرات ایک ساتھ ابھرے۔

”بھئی میری تو تم نے اتنی فرمائشیں پوری نہیں کیں۔ موبائل لے کر دیا تو خوبی استعمال کرتے ہو، ایک بار شاپنگ کروا کر دس بار جتانے ہو، متواتر اچھا کھا بھی لیں تو کئی دن تک ڈگمگا بجٹ ہضم نہیں کرنے دیتا، لیکن خیر محبوبہ اور بیوی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اُس وقت تم نادان تھے تو ایسی نادانوں کا حساب کیا لیتا۔ یہ بتاؤ کیا تم نے بھی کبھی کسی کا دل توڑا ہے؟“ حبیبہ ہلکے کاراستہ اعتبار کرتے کرتے مصلحت اور تجسس کی راہ پر مڑ گئی۔ وہ آج کی رات کو کسی بھی قیمت پر لڑائی کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”جب میری پہلی نوکری ہوئی تو وہ میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ ہماری محبت ہر مرحلہ طے کر کے شادی تک پہنچی ہی تھی کہ نیلوفر کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ایکسیڈنٹ میں وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکی تھی۔ میں زندگی کو گھٹینا نہیں چاہتا تھا اس لیے ایک لنگڑی بیوی کا ساتھ قبول نہیں کیا۔“ زوار کے چہرے پر ایسی سفاکی تھی کہ حبیبہ کو یکدم وحشت سی ہوئی۔ ایسی سنگدلی پر اُسے شدید غصہ آیا لیکن وہ غصے سے ہٹا ہٹایا کام خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم نے ٹھیک فیصلہ کیا زوار۔ خوشیاں بھاگتی دوڑتی ہی اچھی لگتی ہیں ایجاب خوشیاں تو تو نا دکھوں کے ہم پلہ ہوتی ہیں۔ زندگی ہمیں ایک بار ملتی ہے اور محبت کئی بار۔ محبت کی خاطر زندگی کی آسانوں کو واڈ پر لگا کر سراسر حماقت ہے۔“ اُس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ الفاظ ادا کیے۔ بیوی کی متفقہ رائے سے زوار کے اندر بچا کچا تھوڑا سا بچھتاوا بھی جیسے دم توڑ گیا۔

”اچھا آگے بٹاؤ اور کیا ہوا تمہاری زندگی میں؟“ آدمی رات کی پروا کیے بغیر وہ ایک بار پھر بٹاشت سے پوچھنے لگی۔

”بس کر دو خن! تمہارا کیا خیال ہے میں ساری زندگی عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں جو تقاسب بتا دیا۔ مجھے اب نیند آرہی ہے، تم بھی سو جاؤ۔“ زوار کی آنکھوں میں نیند اور بیزاری کی گہری جھلک تھی۔

”تم کہانی کو بیچ میں بے قرار کر کے نہیں سو سکتے۔ ادھوری کوشش پوری کا سیانی کبھی بھی نہیں دے سکتی۔ مجھے یہ سب جان کر بھی تم سے ویسی ہی محبت ہے۔ میرا اعتبار اب بھی قائم ہے زوار۔ میری محبت تو اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ تم نے ٹوٹے دل کے ساتھ بھی میرے دل کو خوش رکھا۔“ حبیبہ نے اُس کے بچتے ہوئے ہڈ بے کومہارت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا اتنا سنو! میری زندگی میں چوتھی لڑکی ماریہ تھی۔ ماریہ سے میری دوستی انزنیٹ پر ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی تصویر دیکھائی اور میں اُس کے حسن کے جال میں ایسا پھنسا کہ لاہور تک کھنچا چلا گیا لیکن وہ تو اپنی تصویر کے بالکل برعکس لگی۔ تصویر میں بڑی بڑی بولتی آنکھیں اصل میں اندک کو دھنسی ہوئی تھیں جہاں سادے ٹائٹل جیسے لال کال حقیقت میں بری طرح بے چنگے ہوئے تھے نہ رنگت میں وہ سفیدی تھی نہ بالوں میں وہ سیاہی۔ اُس نے مجھے کسی اور کی تصویر دیکھا کر ہی خوف بنایا تھا۔ وہ سمجھتی تھی میں اُس کی سیرت سے اتنا متاثر ہو چکا ہوں کہ صورت کا دھوکہ بھول جاؤں گا مگر میرے نزدیک یہ دھوکہ قطعی قابل معافی نہ تھا۔ اس قصے پر پہلے غصہ آتا تھا اب تو ایسی آتی ہے۔“ زوار نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ باقی کا وہ رنگ حبیبہ نے قریب سے دیکھا۔

”ہوسکتا ہے وہ زمانے کی ٹھکرائی ہوئی مایوس لڑکی ہو اور یہ دھوکہ اُس کے چنے کی آخری اُمید ہو، مگر تم جیسے مرد تو دھوکہ بھی اپنی پسند کا کھانا چاہتے ہیں۔“ یہ زہر وہ اُگھٹا چاہتی تھی پر کہانی کی ہٹاکے لیے بی گئی۔

”تم نے ٹھیک کیا محبت کی بنیاد ایمان داری پر رکھی جاتی ہے۔ اس پر بے ایمانی کی دیوار کھڑی کر دی جائے تو رشتہ نہ اس پار سانس لیتا ہے نہ اُس پار۔ کیا ماریہ کے بعد بھی تم نے محبت کو آزمایا؟“ حبیبہ نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے گہری سانس لی اور کچھ پل کے لیے اپنی انگلیوں کو آرام دیا۔

”اس کے بعد میری زندگی میں غدا اور سارہ آئیں مگر اُن کا آنا ایسے تھا جیسے خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کی تانک جھانک۔ ایسے موسمی عشق موسمی بخار کی طرح چنے اور اتر گئے۔ پھر ایک بار میرا دل انہم کے لیے دھڑکا۔ ہماری منگنی بھی ہو چکی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے یہ بات تم سے چھپائی۔ میں تمھارا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ ہماری منگنی دو سال رہی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے، لیکن بڑوں کے دلوں میں ایسی دراڑ پڑی کہ رنجش کا زہر ہمارے بیچ بھی کھل گیا۔“ وہ یہ راز ہاتھ ملتے ہوئے عداوت سے سر جھکا کر بتا رہا تھا۔ سخت سردی میں حبیبہ کی کان کی لونیں تپنے لگیں۔ وہ چاہ کر بھی اپنی کہانی کے اس کردار کو کوئی الزام نہ دے سکی۔ اُس نے اس کہانی کا عنوان ظرف رکھا تھا اور یہ ظرف اُسے ہر حال میں نبھانا تھا۔

”خیر میری کہانی بس یہی ہے۔ تم سمجھ گئی ہوگی کہ ایک محبت کا غم مٹانے کے لیے انسان سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے، لیکن اب میں تمھارے سوا کسی کے بارے میں سوچتا تک نہیں۔ اپنی کہانی کو مزید چٹ پٹانے کے لیے کچھ فرضی کردار تم خود پیدا کر لو۔ مجھے یقین ہے اس پر ایک بہترین ڈرامہ بنے گا اور تمھارے قدموں میں صرف شہرت ہی نہیں پیسہ بھی ہوگا۔“ اُس نے محبت سے حبیبہ کا ہاتھ تھام کر کہانی کو یہیں ختم کر دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ کہانی بھولنے والی نہیں ہوگی۔ یہ کہانی لوگوں کے دل میں بس جائے گی۔ تم نے میرے بے رنگ لفظوں میں جو حقیقت کے رنگ بھرے ہیں اُس کے لیے میں احسان مند رہوں گی۔ تم اب سو جاؤ۔ کھجور یا پوسی کی آخری رات ہے۔ کل کا سورج ہمارے لیے ایک بہتر تبدیلی لے کر آئے گا۔“ وہ مسکرا کر اُس کے بال سہلانے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی بیوی ذہین اور محنتی ہے بس اُسے ایک منفرد کہانی کی ضرورت تھی۔ وہ خوشی خوشی سو گیا اس اُمید کے ساتھ کہ آنے والی زندگی اب سے کہیں زیادہ پر لطف ہوگی۔

”جی..... جی.....“ صبح دس بجے زوار کی آنکھ کھلی تو اُس نے سب سے پہلے اپنی بیوی کو پکارا۔ جواب نہ آنے پر اُس کی ہلکی مسکراہٹ اور ٹھہری ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ جب وہ کسی آواز کا جواب نہیں دیتی تو کچن میں اُس کے لیے کچھ مزیدار بنانے میں مصروف ہوتی ہے۔ وہ فوراً اٹھ کر کچن کی جانب چل دیا۔ وہ جوں جوں قدم بڑھاتا گیانا ک سے ٹکرانے والی اشتہا انگیز خوشبو اُس کا گمان بیچ ثابت کرنے لگی۔

اُس نے جالی کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سامنے ٹیلف پر رکھی ٹرے میں اُس کا پسندیدہ ناشتہ اُس کا منتظر تھا اور ساتھ ہی بڑے سے مگ کے نیچے ایک چھوٹا سا خط۔

”میں ایک کہانی کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے اند کی عورت کو کبھی نہیں مار سکتی۔ ایک مصنفہ کو تم نے جیت کی خوشی دی، مگر ایک بیوی سے تم ہار گئے۔ ہمارے رشتے کی یہ آخری رات تھی جس کا سورج اب کبھی طلوع نہیں ہو سکتا۔“

☆.....☆/☆.....☆

تمہارا کزن..... محمد شعیب

سچ لکھوں یا جھوٹ؟ حال دل لکھوں یا پھر ہمیشہ کی طرح خام خیالی باتیں..... جن کا کوئی وجود نہیں یا شاید ہے مگر

مجھے اندازہ نہیں تھا۔ لکھنا تو جی ہی چاہتا ہوں مگر پھر ہاتھ کیوں ساتھ نہیں دے رہے؟ ہاتھوں میں موجود قلم کیوں کانپ رہا ہے؟ وہ لکھنا کیوں نہیں چاہتا؟ کیا اتور کا اختتام ہمیشہ کی طرح کسی اداس شاموں کے ساتھ ہوگا؟ جیسے خزاں رسیدہ ہے درختوں پر اپنی آخری سائیں لے رہے ہیں۔ کیا میرا بھی بالکل اسی طرح آخری وقت چل رہا ہے؟

دیکھنے والا اندازہ لگانے سے قاصر ہے۔ تھت..... روپ..... رنگ..... خوبصورتی..... قد و قامت..... سب یہی تو دیکھ رہے ہیں۔ چہرے پر چھائی بناوٹی مسکراہٹ، اسی کوچہ مجھ رہے ہیں مگر کیا یہ سچ ہے؟ نہیں..... یہ سب سچ نہیں ہے۔ جھوٹ ہے یہ سب۔ سب جھوٹ ہے۔

قلم کار کتنا ایک جھوٹ ہے۔

قرطاس پر بھری سبائی ایک جھوٹ ہے۔

حرفوں کا لکھ کر لفظ بنانا ایک جھوٹ ہے۔

آنکھوں کا بھرا کر ایک جھوٹ ہے۔

ان میں تیری نمی ایک جھوٹ ہے۔

دفعۂ موسم کا بدلنا ایک جھوٹ ہے۔

ہواؤں کا سرگوشیاں کرنا ایک جھوٹ ہے۔

احساس کا جسم میں سرایت کر جانا ایک جھوٹ ہے۔

سب کا مجھے ہنسا ہوا دیکھنا ایک جھوٹ ہے۔

میرا سب کو مسکرا کر جواب دینا ایک جھوٹ ہے۔

سماعت میں گونجتی آوازیں ایک جھوٹ ہیں۔

نگاہوں نے جو دیکھا، وہ جھوٹ ہے۔

اگر یہ سب جھوٹ ہے تو سچ کیا ہے؟

یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ سچ کیا ہے؟

وہ ایک احساس..... جو اس پل میرے دل میں پیدا ہوا تھا، کیا سچ ہے؟

وہ ایک درد..... جو اس ایک جملے کے سننے پر میں نے محسوس کیا تھا، کیا سچ ہے؟

وہ کڑواہٹ..... جو شیریں لفظوں میں، میں نے محسوس کی تھی۔ کیا سچ ہے؟

وہ اپنائیت..... جو کڑواہٹ میں پنہاں تھی، کیا سچ ہے؟

وہ خلا..... جو اس وقت میرے چاروں اطراف کسی ان دیکھے وجود کی طرح موجود ہے، کیا سچ ہے؟

نہیں..... یہ بھی سچ نہیں۔

سچ تو بس وہ تھا، جو اس نے کہا تھا۔

مسکراتے ہوئے..... شرماتے ہوئے..... ہمیشہ کی طرح، اپنے دل کی بات سب سے پہلے مجھے بتاتے ہوئے..... پہلے

رنگ کے حسین جوڑے میں میرے سامنے آکر دل کے تاروں کو ایک سر میں ہلاتے ہوئے، اس نے ایک سارا لاپا تھا۔

ایک ایسا ساز..... جو برسوں سننے کے باوجود میں انجان بن رہا تھا۔

ایک ایسا ساز..... جس کو سننے کے بعد مجھے کسی اور ساز کو مجھے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک ایسا ساز..... جو میں خوابوں کی دنیا میں بھی محسوس کر سکتا تھا۔

ایک ایسا ساز..... جو میری روح تک میں اتر چکا تھا۔

وہی ساز، اُس وقت بھی مجھے سنائی دے رہا تھا۔ جب وہ میرے سامنے تھی۔

سب کچھ تو یاد ہے مجھے۔ بھول بھی کیسے سکتا ہوں..... ایسی انہی..... کچھ دیر پہلے کی تو بات ہے۔ دیر نہیں..... بلکہ چند گھنٹیاں پہلے۔ جب میرے احساسات یہ نہیں تھے۔

مجھے درو سے سروکار نہیں تھا۔

مجھے اپنے اندر جیسے جذبات کے عالم کا علم نہیں تھا۔

جب میرے ارد گرد خوشیوں کا سماں تھا، ایسا لگتا تھا جیسے وقت قہم قہم گیا ہو۔

پہلی بار مجھے کسی کو سچے دل سے چاہنے کا احساس ہوا تھا لیکن وہ بل، کچھ لمحوں کا مہمان تھا۔

گلاب کی پگھلنیاں کچھ اس انداز سے گویا ہونی لگیں کہ میرے اندر ایک طوفان برپا کر دیا۔ میری آنکھیں جن میں

کچھ دیر پہلے محبت کا جہان آباد تھا۔ اگلے ہی لمحے آنسوؤں کا مسکن بن گئے مگر وہ انہیں تب بھی نہ دیکھ سکی تھی۔ شاید اس

لیے کہ میں ان پر بند باندھ چکا تھا۔

وقت رہتے..... اپنے جذبات کو سمیٹ چکا تھا۔

وقت رہتے..... دل کو سنہال چکا تھا۔

وقت رہتے..... درد کو چھانکر..... لیوں پر تنہم بکسیر چکا تھا۔

لیکن وقت رہتے ہی..... گلشن کو آباد کرنے کی بجائے خنجر زمین میں تبدیل بھی کر چکا تھا۔

”تم کمرے میں ہو..... میں نے ہر جگہ تمہیں ڈھونڈ لیا..... مگر تم تو اپنے ڈیرے میں ہی چپے بیٹھے ہو۔“ ہمیشہ کی

طرح اس کا انداز بے تکلف ساتھ۔ فقط وہی نہیں..... میں بھی تکلف نہیں برتنا تھا۔ بھی تو محبت کا سفر طے ہوا تھا مگر یک

طرف..... دل دھڑکتا تھا مگر شاید محض میرا۔ وہ تو اپنے وجود میں کسی اور کو شریک ٹھہرا چکی تھی۔

”اب زیادہ اور ہونے کی کوشش مت کرو..... تم اچھے سے جانتی ہو میں ہمیشہ سے کمرے میں ہی ہوتا ہوں۔ یا

شاید تمہاری ٹائمنگ ہی کچھ ایسی ہے جب آتی ہو، مجھے کمرے میں ہی پانی ہو۔“ میں اُس وقت ٹائی کی ناٹ کھج کر رہا

تھا۔

”میری ٹائمنگ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہے۔“ وہ آگے بڑھی اور مجھے شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ ٹائی کی ناٹ

خود سے سیدھی کی تھی۔

”تم میری عادت بگاڑ رہی ہو۔“ میں نے ذوقی لہجے میں کہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی مگر وہ ان شریر آنکھوں

میں جیسی حقیقت نہ سمجھ سکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ انجان تھی۔

”بھلا میں نے تمہاری کون سی عادت بگاڑ دی؟ جو مفت میں میری ذات کو موجب الزام ٹھہرا رہے ہو؟“ اس نے

ابرواچکاتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔

”میرا کام خود کرنا..... بھلا عادت بگاڑنا ہی تو ہے۔ ایسے تو ساری عمر کے لیے میں تمہارا محتاج ہو کر رہ جاؤں گا۔“

میں نے بناوٹی انداز میں سرواہ بھری تھی۔ آنکھوں میں ایک شرارت تھی۔

”بے فکر رہو..... تمہاری یہ شکایت اب بہت جلد دور ہونے جا رہی ہے۔“ شریر لہجے میں اس نے ایک انداز سے

میرا کان پکڑ کر ہل بھر کے لیے نوچا تھا۔ یہ الفاظ جیسے میرے اندر طوفان برپا کر گئے تھے۔ اوسان بھی منجمد سے ہوتے

دھماکی دیے۔

”مم مطلب؟“ سننے میں وقت درکار تھا مگر سنہلنا ضروری تھا۔

”مطلب یہ کہ میرے عزیز..... میرے پیارے نٹ کھٹ کزن۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے رہی تھی۔ چہرے پر

انتہا کی خوشی اور سرخی نے ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔ میں یک ٹک اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی بجلی آنکھوں کا

مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”پوری بات کرو۔“ دل مضطرب کی آنے والے طوفان کو جیسے محسوس کر چکا تھا۔ بھی ہڑبڑا کر پوچھا تھا۔

”بات یہ ہے حماد..... کل میرا نکاح ہے۔“ بس یہ آخری جملہ تھا جو میری ساعت کا حصہ بنا تھا۔ دینا ہی تو جیسے کہیں غائب ہی ہو چکی تھی۔ ہر شے دھندلا سی گئی۔ دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ دل نے بھی لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ لب بچائی سی کیفیت میں دھیرے سے گویا ہوئے تھے۔

”ننگ..... کیا؟“ کچھ ایسے ہی الفاظ ادا ہوئے تھے اور ایسا میں نے جان بوجھ کر نہیں پوچھا تھا بس ایک فطری عمل تھا۔ جب بھی کوئی غیر معمولی بات ہمارے سامنے کی جاتی ہے یا ایسی بات جس کی ہمیں توقع نہیں ہوتی تو لب دوبارہ تصدیق کے لیے متحرک ضرور ہوا کرتے ہیں۔ میرے بھی ہوئے تھے۔ ہر شے سامنے تھی۔ حقیقت عیاں تھی۔ اس کی آنکھوں کی رعنائیاں صاف صاف بتا رہی تھیں مگر میرا وجود تھا کہ ہر شے کو جھٹکا کر بس ایک بار اس کے لبوں سے تردید کا خواہاں تھا مگر افسوس..... انہی الفاظ سے میرے وجود پر دوبارہ ضرب لگائی گئی تھی۔

”کل میرا نکاح ہے۔“ زمین پھٹے بغیر کوئی زندہ درگور کیسے ہوا جاتا ہے؟ میں نے اس وقت جانا تھا۔ اپنی خوشیوں کا عمل سجانے کی تمنا لیے تیار ہونے والا اب آنکھوں میں آنسوؤں کا انبار لیے کھڑا تھا۔ مگر وہ انہیں دیکھنے سے قاصر تھی۔

میری زندگی..... میری خوشی..... میری کزن..... میری عیال..... جس کے ساتھ میں ہمیشہ سے ہی فریادیں کر رہا کرتا تھا۔ جس کے ساتھ رہنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ جس کے ساتھ گزارے گئے وقت کی قیمت میں پہلے نہ سمجھ سکا تھا اور سمجھا بھی تو جب، جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب پانی سر سے بہت اوپر جا چکا تھا۔ واقعی پانی سر کے اوپر تھا اور میں اس پانی میں غوطے لگا رہا تھا۔ بھی ہر شے دھندلی تھی۔ پاس ہوتے ہوئے بھی میرے اس کے درمیان دفعتاً فاصلے نمودار ہو گئے۔

”حماد..... تم تن رہے ہو؟“ اس نے میرے شانوں کو جھٹکا دیا تھا۔ خاموشی کا بت ٹوٹا۔ گردن میں ہلکا سا خم نمودار ہوا۔ بے یقین آنکھوں نے دوبارہ اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہی خوشی..... جو کسی بھی لڑکی کے چہرے پر ہوا کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر تھی۔ دل شکوہ کر رہا تھا۔ اس سے ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر محبت کے آگے بے بس تھا۔ بھلا محبت کرنے والا بھی شکوہ کتنا ہوتا ہے؟

”ہوں؟“ بے یقین لہجہ خود بخود گویا ہوا تھا۔ لب ابھی تک سلے ہوئے تھے جو شاید اب کبھی نہ کھل سکتے تھے۔ مڑگان کے کنارے پیچھتے چلے گئے۔ جنہیں میں نے رخ موڑ کر چھپا لیا تھا۔

”جنہیں خوشی نہیں ہوتی؟“ اس کی خوشی ہمیشگی محسوس ہوتی معلوم ہوئی تھی۔

”یہ..... تم سے..... کس نے کہا؟..... خوشی..... اور مجھے..... بہت خوشی ہوئی۔ اتنی خوشی..... کہ دیکھو الفاظ ہی محدود ہو چکے ہیں۔“ کندھا ہوا لہجہ اپنا تاثر چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔ دل کسی بچے کی طرح دھڑکیں مار مار کر دھڑکنا چاہتا تھا۔ اس کو تھلانا چاہتا تھا کہ مجھے خوشی نہیں بلکہ دنیا کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔

بھلا اپنی محبت کو کسی اور کا ہونا دیکھنا آسان ہوتا ہے کیا؟

بس یہی تو کہا ہی تھی۔ ایک لمحے کی۔ میری ڈائری کے آخری ورق کی۔ اس کے بعد زندگی تو جیسے ٹھہر ہی چکی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ اس ڈائری کے ختم ہوتے ہی میری زندگی کے تمام تر باب ختم ہو جائیں گے۔ تمام تر رعنائیاں رخصت ہو جائیں گی۔ ایک کہانی محبت کی، زندگی کو ایسا روک دے جائے گی جس کا دور دکھا تو نہیں جاسکتا اور نہ ہی کسی اور کو محسوس کروایا جاسکتا ہے۔ یہ تو ایک احساس ہے، جسے طے بس وہی جانتا ہے۔

بس یہی انجام تھا میری خاموش محبت کا..... میرے خوابوں کے جزیرے کا..... میرے ہدم..... میرے ہمسفر کا..... جو میرے ساتھ تھا..... مگر میرے ساتھ نہیں..... جو میرے دل میں تھا..... مگر میں اس کے دل میں نہیں..... جس کے لیے میں جیتا تھا..... مگر وہ میرے لیے نہیں..... جس کے نزدیک میں پاگل تھا..... نہٹ کھٹ تھا..... بے وقوف تھا..... جذبات سے عاری تھا لیکن پھر بھی اس کا کزن تھا اور اب میرے لیے بھی فقط یہی رشتہ باقی بچا ہے۔ دنیا کے سامنے خود

کوتم سے منسوب تو کر سکتا ہوں لیکن صرف اتنا کہہ کر..... تمہارا کزن۔

☆.....☆/☆.....☆

وہ کون تھی..... عثمان غنی

میں جب بہت چھوٹا سا تھا تب میرے ماں باپ کا انتقال ہوا تھا، مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں کیسے بڑا ہوا، یا پھر کیسے اب تک جی رہا ہوں، کہنے والے کہتے ہیں کہ میرا باپ بہت امیر آدمی تھا، اس کے پاس جائیدادیں زمینیں تھیں، پر سارے میرے چچاؤں نے ہتھیالیں، مجھے در بدر دھکے کھانے کے لیے ادھر ادھر چھوڑ دیا، میں کتنا بد نصیب تھا کہ اپنے حق سے بھی محروم رہ گیا اور چچاؤں نے مجھے ماموں کے ہاں بھیج دیا، وہاں نا کسی نے پڑھایا، بس ہر ایک نے نوکر کا سا سلوک کیا، ماموں اور ممانی اور اس کے بچوں نے مجھے کسی نوکر سے بھی کم ہرگز نہ سمجھا، وہ لوگ مجھ سے ایسے کام لیتے تھے جیسے میں کوئی مزدور ہوں یا پھر کوئی ایسی مشین جو ٹھیک بھی نہیں۔

اور مامی کے طعنے میں الگ سے سنتا کہ جائیداد دوسروں نے ہتھیالی، خالی لوٹا ہمیں بھیج دیا، اب میں اگر لوٹا تھا بھی، تو یہ لوٹا تو ان کو استعمال میں بھی لانا تھا، کیوں مجھے وہ لوگ مفت کی روٹیاں کھلاتے، اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے پر مجھے بازار، میں ایک ایک روپے کے لفافے بیچتا اور رات کو اس سے جو کمائی ہو جاتی، پیسے ماموں زبردستی لے لیتے، مجھے پیسوں کی کیا ضرورت تھی، ہاں ان کا جو کھارہا تھا، گرمیوں میں پانی بیچتا کور میں۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آ گیا، مگر کیا کر سکتا تھا، کوئی جائے پناہ بھی نہیں تھی۔ دن رات ان کی خدمت میں ایک کر دیے۔ پر کسی نے بھی ایک لفظ کی تعریف تک نہ کی، ماموں کی لڑکی اب میری ہم عمر تھی۔ وہ جوان ہو چکی تھی اور کافی حسین بھی، کانچ جانے لگی تھی۔ پتہ نہیں کانچ میں کیا کرنے جانی تھی، کیونکہ ایک لفظ تو اسے آتا نہیں تھا، الناحجہ پر رعب جمانی تھی، پتہ نہیں وہ اتنی خود سر کیوں ہو چکی تھی کہ اپنے بھائیوں کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے لوٹے کی بانیگ پر پیچھے جانے کہاں کہاں کی خاک چھاتی پھرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے ایک لڑکے کے ساتھ مختلف بازاروں میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا بھی تھا، تو جواب میں مجھ پر چوری کا الزام لگا کر خوب سارے گھروالوں سے پڑایا تھا۔ وہ لڑکا بھی اس کی طرح آوارہ سا لگتا تھا۔ پتہ نہیں کون تھا؟

ایک مجھ سے بڑا بیٹا تھا، یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا، مگر پتہ نہیں ایسے بن ٹھن کر جاتا کہ کلیجے کو آگ لگ جاتی اور ایک چھوٹا بیٹا تھا، وہ ابھی میٹرک کر رہا تھا، پتہ نہیں ماموں کے پاس اگر اتنے پیسے تھے، تو اس نے مجھے کیوں نہیں پڑھایا، یہ سوال مجھے اکثر پریشان کیا کرتا تھا، اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ماموں کے گھر میں تو مجھے جگہ مل گئی۔ پر دل میں وہ لوگ مجھے جگہ نہیں دے سکے۔

مجھے بہت افسوس ہوتا کاش میں کسی یتیم خانے میں بل جاتا، پر اس جہنم میں نہیں آتا۔ آج بھی میں یہاں اسی طرح غلام کی حیثیت سے اس گھر میں رہ رہا تھا۔ میں نے کئی بار بھاگنے کا سوچا مگر کامیاب نا ہو سکا۔ شاید میں بزدل بھی بہت تھا، اپنوں کے سہارے جی رہا تھا، مگر یہ کیسے اسے تھے، جو مجھے اپنا سمجھتے ہی نہیں تھے۔ میں جانتا بھی تو کہاں؟ کون مجھے اپنے گھر میں رکھتا، کون مجھے پناہ دیتا، اگر میں بھاگ بھی جاتا، تو کیسے بھاگتا۔ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں تھے، اس جہنم سے نکلنے کے لیے، آج بھی بازار میں آوارہ گردیاں کرتا ہوں، میرے بال بہت بڑے ہو جاتے ہیں اتنے بڑے کے کندھوں سے نیچے آنے لگتے ہیں مگر میرے پاس انہیں کھانے کے پیسے تک نہیں ہوتے۔ میں صرف ایک غلام ہوں اور اس گھر کے سب افراد مجھے ایک پاگل سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ مگر ان کو سب پتہ ہے، میں پاگل نہیں ہوں اور ان سب کے ساتھ رہتے ہوئے پاگل ضرور ہو سکتا ہوں۔

ایک دن میں بازار میں لفافے بیچ رہا تھا، کل جو لفافہ میں ایک روپے کا بیچا کرتا تھا، آج میں وہ دس روپے کا بیچ رہا تھا، میرے بال بڑے ہوئے تھے اور کپڑے پٹے ہوئے تھے، میں کوئی ایک مہینے سے اسی گندے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ سبزی منڈی میں جس کے پاس زیادہ سودا ہوتا اس کے پاس جاتا اور لفافہ لینے پر اصرار ضرور کرتا، مگر بڑے ڈھٹ لوگ تھے بھی لفافہ لے لیتے اور بہت سارے انکار بھی کر دیتے تھے۔ اس دن ایک انٹراڈرنی لڑکی میں نے سبزی منڈی جاتے ہوئے دیکھی، اس کے ہاتھ فروٹ کے بڑے شارپز سے بھرے ہوئے تھے اور ایک بڑا سا سبزی کا تھیلا بھی تھا۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ رہی تھی اور میں سمجھا کہ وہ تھیلا لینا چاہتی ہے، اس لیے گا ہک سمجھ کر اس کے پاس چلا گیا۔

”بابی تھیلا چاہیے!“

”نہیں، تم میرے ساتھ یہ سامان میری گاڑی تک پہنچا دو۔“

اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا سا سامان میرے ہاتھوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، میں نے شارپ والا اسٹینڈر گلے میں لٹکا لیا اور اس کا سارا سامان پکڑ کر اس کے پیچھے چلنے لگا، سبزی منڈی کے قریب پارکنگ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی، وہ بہت خوبصورت گاڑی تھی۔

اس نے ڈکی کھولی اور میں نے سامان اس میں رکھنا شروع کر دیا۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی۔ ایسا لگا کہ چاروں اور خوشبو ہواؤں میں رچ بس گئی ہو۔ میں جانے لگا اور اس نے کہا۔

”رکیے۔“

میں نے مڑ کر اس کی سمت نا بھیجی سے دیکھا۔

”تم ایسے ہی رہتے ہوں۔“ اس نے میری طرف ترس سے دیکھا۔

”ہاں کیوں کوئی خرابی ہے اس میں۔“ میں حیران ہوا۔

”نہیں مگر ایسے گندے سندے کیسے راجا جاتا ہے؟“ وہ حیران تھی۔

”جیسے میں رہتا ہوں۔“ میں مسکرایا اور بھی مسکرائے لگی تھی۔

”اچھا یہ تو تم یہ کچھ پیسے رکھ لو اس نے اپنے بیک میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں سے بھری ہوئی گڈی نکال کر میری طرف بڑھائی، تم اس سے اپنی زندگی بدل سکتے ہو۔“

وہ پانچ پانچ ہزار کے بیکڑوں نوٹ تھے، اتنے سارے پیسے میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے اور وہ جوتائی خوبصورت اور معصومی لڑکی تھی وہ مجھے اتنے معمولی سے کام کے لیے لاکھوں روپے دے رہی تھی۔

”نہیں جی، میں یہ پیسے نہیں لے سکتا۔“ میں وہ پیسے دیکھ کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے وہ پیسے نا ہوں، زہریلے پتھرو ہوں، جو مجھے ڈس لیں گے۔

اور میرے ایسا کہنے پر وہ کلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”ارے باگل یہ سانپ تو ڈیڑی ہیں، جو تم اس سے ڈر رہے ہو۔“

”نہیں ان پیسوں کی وجہ سے ہی تو میری یہ حالت ہوئی ہے، میرے دشمن ہیں یہ۔ تم اس سے مجھے دور رکھو۔“ وہ کلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے دیکھنے لگی۔ پھر کہنے لگی۔

”نہیں یہ کسی کا دشمن نہیں ہے اور تمہارا بھی نہیں ہے یہ تم رکھ لو اور میں تمہیں بتاتی ہوں۔“

”نہیں جی میں اتنا محنت کرتا ہوں، سارا دن بازار میں پھر پھر کر شاپر پیچتا ہوں اور اس کی کمائی بہت ہو جاتی ہیں، وہ ہاموں لے لیتے ہیں تو یہ اتنے سارے پیسے میرے پاس کہاں رہنے دیں گے اور تم مجھے یہ اتنے سارے پیسے کیوں دے رہی ہو۔“ میں نے حیرت سے اسے کہا۔

”اس لیے کہ یہ میرے پاس بہت زیادہ ہے اور جہاں کسی غریب کو دیکھ لیتی ہوں، تو اسے پیسے دے جاتی ہوں۔“

”کیا تم کوئی فرشتہ ہو۔“
 ”نہیں مگر شیطان بھی نہیں ہوں۔“ اس نے جب یہ کہا، تو میں نے اس کے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔
 ”اب میں جا رہی ہوں۔ تم ان پیسوں سے اپنی زندگی بنانا۔“
 وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟ اور میں کیسے اتنے سارے روپوں کی حفاظت کر سکوں گا بازار میں سارے لوگ دیکھ رہے ہیں، کوئی مجھ سے یہ سارے روپے چھین لے گا۔“
 ”گاڑی میں بیٹھو، میں تم کو سمجھا دوں گی۔ کہ تمہیں زندگی میں اب کیا کرنا ہے؟“
 اس نے دروازہ کھولا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔
 اب وہ خراماں خراماں گاڑی چلا رہی تھی۔

”میں کسی کو اپنا نام نہیں بتائی، تم یہ والے پیسے اپنے پاس رکھو اور سنو میں کسی کو ایک فصیحی بھی کر رہی ہوں، میں تمہیں بتا رہی ہوں آج سے تم اپنے ماموں کے گھر جاؤ ہی مت، جہاں کوئی تمہیں ایک بے تنخواہ نوکر کے کچھ بھڑکتا ہی نہیں ہے۔“

”آپ کو یہ سب کیسے پتا؟“

”مجھے سب پتہ ہوتا ہے۔ مگر انسان ہی انسان پر ظلم ڈھاتا ہے، پھر اللہ کی مار پڑتی ہے، تو آہ وہ بکا کر رہا ہے۔“
 ”آپ تو بہت اچھی ہیں، آپ مجھے کہاں لے کر جا رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہیں ایک مشورہ دے چکی ہوں اور تمہاری راہ نمائی کے لیے ایک جگہ چھوڑ کر جا رہی ہوں، تم یہ اپنے پیسے کسی محفوظ جگہ پر رکھنا۔ جب ضرورت پڑے پھر خرچ کر دینا۔“

”مگر میرے پاس کوئی بھی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ جہاں میں رہ سکوں۔“
 ”تمہیں سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔“ اس نے گاڑی کے بریک لگائے۔ ”گاڑی رک گئی۔“
 ”وہ سامنے عمارت دیکھ رہے ہو وہاں جاؤ اور ان سے مدد مانگو۔“

”ان سے کیا کہوں۔“ وہ ایک رفاقی ادارہ ہے۔ تم اسے بس اتنا کہنا کہ تم تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو اور تمہارا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“

میں گاڑی سے اتر اور اس ادارے کی طرف جانے لگا، میں نے جب مڑ کر دیکھا، تو وہ مہربان لڑکی غائب تھی نہ اس کی گاڑی تھی نہ وہ تھی۔

میں ہنس دیا وہ تو بری جیسی پیاری تھی، بہت تیز گاڑی چلائی ہوگی اور چلی گئی ہوگی۔

میں جب اس ادارے میں چلا گیا تو اندر لوگوں کا ایک جھوم تھا۔ وہاں میں اس کے سینئر آدی سے ملا۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو ان لوگوں نے مجھ سے دھڑا دھڑا سوالات پوچھنے شروع کر دیے، اور میں نے ان کے ٹھیک طریقے سے جوابات دیے۔

مجھے اسی ادارے نے اپنے پاس رکھ لیا اور میں ان کے ساتھ ادارے میں تعلیم بالغان کے تحت تعلیم سیکھنے لگا، وہاں دو سال کے اندر اندر میں نے اتنا کچھ سیکھا کہ میں بتا نہیں سکتا اور میں آج ایک کامیاب آدی ہوں، اسی ادارے کی ایک یتیم لڑکی کے ساتھ میری شادی کروادی گئی ہے، آج میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے، اور جو پیسے مجھے اس مہربان لڑکی نے دیے تھے، اس کے تحت میں نے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا ہے۔

میری بیوی منال بھی بہت اچھی اور پیاری ہے پر میں اس مہربان لڑکی کو بھی نہیں بھولا۔

اصل میں آج جو کچھ بھی ہوں صرف اور صرف اسی لڑکی کی وجہ سے ہوں، اسی کے دیے پیسوں سے میں نے

کپڑے کا کام شروع کر دیا ہے اور اسی کی وجہ سے مجھے دین اور دنیا کی تعلیم ملی اور ایک خوبصورت بیوی۔

مجھ کہا ہے کسی نے انسان اپنے حصے کا ہی کھاتا ہے جو انسان کے نصیب میں ہوتا ہے، رزق اس کے پاس چل کر آتا ہے اور وہ رزق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

میری بیوی بچے کی ماں بننے والی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے حصے کا رزق اپنے ساتھ لے کر آ رہا ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، اس انجان لڑکی کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد کرتا ہوں اور آج بھی یہی سوچتا ہوں کہ یہ نہیں وہ کون تھی؟ مگر جو بھی تھی میرے لیے اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ایک فرشتہ ہی تھی۔

☆.....☆/☆.....☆

تمکین کافی..... اسحاق جنجوعہ

لندن سرد جھونکوں سے جھوم رہا تھا۔

برف کی باریک باریک کرچیاں سڑک پر چلنے والے بے شمار لوگوں کی برساتیوں اور چھتریوں پر گر کر انہیں نم کر رہی تھیں۔

مجھے ٹھنڈ زیادہ محسوس ہونے لگی تو میں ایک کافی شاپ میں گھس گیا۔

کاؤنٹر پر کام کرنے والی میزبان خاتون بہت مصروف تھی اس نے پیسے وصول کرنے کے بعد ایک ٹرے میں کافی کا ڈھکن لگا کاغذی کپ، شکر کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں اور پلاسٹک کا ننھا سا چمچ رکھ کر میرے سپرد کیا جسے لے کر میں قریبی میز پر بیٹھ گیا۔

میں نے جلدی سے کافی میں ایک بڑیا گھول کر پہلی چسکی لی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

خالی پڑیا کو دیکھا تو وہ شکر کی بجائے نمک کی تھی، جسے میزبان خاتون نے غلطی میں میری ٹرے میں رکھ دیا اور میں بھی بے دھیانی میں گھول گیا۔

تمکین کافی کی یہ چسکی مجھے چند پرانی یادوں میں دھکیل گئی۔

وہ بھی سرما کے آغاز کی ایسی ہی اداس سپہر تھی۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لوگ لمبے لمبے اور کوٹ اور برساتیاں پہنے سڑکوں پر چل رہے تھے۔

میں ایک بلڈنگ کی تیسری منزل پر واقع ٹریا کے فلیٹ کی کھڑکی میں کھڑا باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ”کھڑکی بند کرو ڈاکٹر، ہوا ذرات خراب ہیں تو تمہیں زکام ہو جائے گا اور میں کافی کے اس کپ کے سوا تمہاری کوئی خدمت نہیں کرنے والی۔“ ٹریا نے کافی بناتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

”آج کی شام تک ہی تو تمہارا ہوں تمہارے لندن میں، اگلا پڑاؤ تو کینیڈا کی پر بہار فضاؤں میں ہوگا۔ جی چاہ رہا ہے کہ آج اس شہر کی ساری ٹھنڈ سمیٹ لوں، یہ شہر جو ہمیشہ سرگرم رہتا ہے۔ ہمیشہ مصروف اس کے موسم میں تغیر کب آ جائے کے معلوم تو میری دیر بتاتی ہے، کیوں نہ اسے جی بھر کر محسوس کر لیا جائے۔“ میں نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو تمہارا خیال ہے تمہیں کینیڈا میں تمہارے دیس کی طرح ٹھہرا ہوا موسم مل سکے گا یا تم جیسے ٹھہرے ہوئے جذبے کے لوگ یادہ ٹھہری ہوئی بھی نہ بدلنے والی محبت جو ہمیشہ سے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

کافی کے کپ میں فولاد کے پیچ سے گھنٹاں بجاتے بجاتے ٹریا نے جیدگی بھری آواز میں کہا۔

”نہیں۔ اس کا قطعی طور پر کوئی امکان نہیں مجھے یورپ کی طرح کینیڈا سے محبت ڈھونڈ لینے کا وہم تک نہیں۔ محبت

صرف مشرقی لوگوں کا خاصہ ہے محبت کرنا بھی جانتے ہیں اور محبت جھانا بھی کینڈا تو میں بس اپنی کہنی سے کیا معاہدہ پورا کرنے جا رہا ہوں سال بھر کے لیے۔ پھر وہاں سے اپنے دیس لوٹ جاؤں گا اپنا ویران گھر سنانے اور اپنی محبت ڈھونڈنے، مجھے یقین ہے وہ مجھے اپنے دیس کی ہلکی خوشبو والی ہلکی مٹی میں ہی ملے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”محبت کسی خاص علاقے کے لوگوں کی میراث تو خدائی ہے وہ تو کہیں بھی ہو سکتی ہے، کہیں بھی مل سکتی ہے، تم نے اپنے بے کار کے مفروضے کی سوچ سے باہر نکل کر نگاہ دوڑائی ہوئی تو تمہارا نقطہ نظر مختلف ہوتا محبت تو خدا کی عطا ہے بالکل بارش کی طرح ہر جگہ ہر قسم کے لوگوں کو یکساں بھگودیتی ہے، بے وفائیاں تو تمہارے دیس میں بھی ہوتی ہیں زندگی کے سانچوں میں جھکڑے تو وہاں بھی ہوتے ہیں کچھ بھی بچ رہے بغیر جانے تم نے کیوں اپنے ذہن میں یہ بار بٹھار رکھی ہے کہ مغرب میں سرعت سے بدلنے موسم کی طرح لوگ بھی پلپک جھپکتے بدل جاتے ہیں ساون کی بارش میں چھپروں کے نیچے جس تو تمہارے دیس میں بھی محسوس ہوتا ہے تم ہی بتاتے ہو بھی کبھی بارش اور دھوپ تو وہاں بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ تم نے نگاہ تو دوڑائی ہوئی کہیں دور کہیں قریب۔ سوچو اگر تم کسی کی محبت ہو اور اپنے دیس سے دور ہو یہاں پر تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تمہاری محبت بھی یہیں ہو۔ تم نے کوشش تو کی ہوئی۔“

”ہا ہا محبت اور یہاں مجھ سے سچی محبت کس نے کر لی تھی یہاں گلو ریانے جو ویلنٹائن ڈے کی صبح میرے ہاتھ سے زرد پھول لے کر شام جو ہی جینز کی گود میں سر رکھے بیٹھی تھی یا مورین جس نے ریمیں کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ اسے چھینوں میں بیرون ملک نہیں لے گیا، یا وہ جینی جو اپنے دو سابقہ عاشقوں کے بچے پالتے ہوئے بھی مجھے اپنا اصلی اور سچا پیار ہونے کا یقین دلانے پر ہی کوشاں رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ یا ساپانو جو میرے اسٹڈی ٹیوشن کے بدلے چند شاہیں میرے نام کرنے کو محسوسات محبت کا نام دے رہی تھی۔“ میں نے طنزیہ سی تقریر کر ڈالی۔

”یہاں گلو ریا، مورین جینی اور ساپانو کے علاوہ بھی بہت سی لڑکیاں ہیں تمہاری ہم عمر تم ہی خوبو، تم سب کی ایکلی اپنی دنیا میں مگن تم سب کی اور مجھ کی بھی تم دیکھتے تو ڈھونڈ لیتے کافی بن گئی ہے آؤ پی لو۔“ ٹریا نے کپ میز پر کھٹے ہوئے کہا۔

”چلو پھر بھی لندن آیا تو دیکھوں گا۔“ میں نے کھڑکی سے پلٹتے ہوئے کہا اور کھانے کی میز پر آ بیٹھا وہ بھی اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رد مال رکھ کر چہرہ چھپائے میز کی دوسری طرف آ بیٹھی۔

”تمہیں فلو کی دوا لے لینی چاہیے کھی، ایسا لگتا ہے روتے ہوئے باتیں کر رہی ہو۔“ میں نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اچانک ٹھنڈے ہونے والے موسم کا اثر ہے جلد ٹھیک ہو جاؤں گی تم اپنا دھیان رکھو۔“ ٹریا نے جواب میں نصیحت کی۔

”کمال کرتی ہو لندن میں پیدا ہوئی یہیں پلی بڑھی اور اس کے معمول کے مطابق ہوتی موسم کی ہلکی سی شرارت بھی برداشت نہیں کرنا تیں مجھے دیکھو مجھ پر تو نہیں اثر ہوا۔“ میں نے اسے چھیڑا۔

”تم تو لندن کی کسی چیز سے متاثر نہیں ہوئے نہ موسم سے، نہ لوگوں سے، نہ معاشرت سے، نہ مجھ سے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم بہت اچھی ہو، سب سے جدا، اسی لیے تو میری اکلوتی دوست ہو۔“ بولتے بولتے میں نے کافی کی چسکی لی تو میری ہلکی نکل گئی۔

”لگتا ہے فلو نے تمہیں پاگل کر دیا ہے خود تو پھیک کافی جیتی ہو اور میرے کپ میں چھینی کی جگہ ٹمک ڈال دیا ہے۔“

”اوہ سوری شاید میرا دھیان نہیں رہا لاؤ میں دوسری بنا دوں۔“ ٹریا نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔

”رہنے دو اب ٹمک کی جگہ سوڈا انڈال دینا اور تمہیں پتا ہے مجھے کھانے پینے کی اشیاء ضائع کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا ویسے بھی یہ نمکین کافی بہت اچھی لگ رہی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور کپ اٹھا کر واپس کھڑکی کے پاس آ گیا۔

وہ بھی ناک نہڑکتے ہوئے مسکرائی اور میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

”اچھا، یہ بتاؤ لندن واپس آؤ گے کبھی؟“

”شاید ہاں..... شاید نہیں۔“

”لندن کو یاد کرو گے؟“

”شاید۔“

”لندن کے موسم کو؟“

”شاید!“

”لندن کے لوگوں کو؟“

”شاید۔“

”مجھے؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے مزاحیہ انداز سے جواب دیا۔

”سنو! مجھے ضرور یاد کیا کرنا، میں بھی تمہیں یاد کیا کروں گی، ہر روز ہر دقت۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے

گوٹ کا کارسیدھا کرتے ہوئے بھاری ہونی آواز میں کہا۔

اس کی بات سن کر اس پاس کچھ سناٹا سا چھا گیا اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے جھانکتے، میرا چہرہ اس کے

چہرے کے قریب آنے لگا، نہ جانے کیوں اس کی سانس سے سانس لگراتے ہی میں چونک سا گیا۔

”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے، بہت تیاری کرنی ہے، فلائٹ نہ کس ہو جائے کہیں۔ نمکین کافی کے لیے

بے حد شکریہ۔ خدا حافظ۔“

میں نے حلق میں پھنسنے الفاظ ہو لے ہو لے باہر نکالے اور کافی کا خالی کپ میز پر رکھ کر باہر کی جانب چل پڑا۔

”پھر ملیں گے۔“ فلیٹ کے دروازے سے نکلتے ہوئے میرے کانوں میں ٹریڈ کی مدھم سی آواز گونجی۔

میں بلڈنگ کی سڑکیاں اتر کر لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے غیر ارادی طور پر میری نگاہ

ٹریڈ کے فلیٹ کی کھڑکی کی طرف اٹھی تو وہ بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا

میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا اور موڑ مڑ کر اس کی نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔

☆☆☆.....

میں چار سال قبل تعلیم کے سلسلے میں لندن آیا تھا ٹریڈ میری کلاس فیلو تھی اور یونیورسٹی کے پہلے دن سے ہی میری

دوست تھی۔

سرخی آنکھوں اور بھورے بالوں والی خنسی سا بدن اور چہرے پر نین نقوش اخلاق کی بہت اچھی تھی دوسرے طلباء

خصوصاً دوسری لڑکیوں کی طرح اس میں شوخ پن، فیشن پرستی، خود نمائی اور چلبلا پن ناپید تھا زیادہ تر تنہا اور خاموش رہنا

پسند کرتی تھی میں بھی اپنے سیکشن میں اکیلا پردیسی تھا اور یہاں کے کھلے ڈھلے ماحول میں خود کو رچا نہیں پار تھا پہلے ہی

دن اس نے لائبریری میں کچھ مطلوبہ کتب ڈھونڈتے اس نے میری مدد کی اور وہیں سے ہماری دوستی شروع ہو گئی ہم

دونوں کا آپس کے سوا کوئی دوست نہ تھا بس ہم جماعتوں کے ساتھ معمولی رسم و راہ تھی۔

شام کو میں ایک مقامی دواخانے میں معاون کے طور پر کام کرتا تھا جہاں وہ باقاعدگی سے ڈیا بیٹس، فشار خون اور

دل کے ایک پیچیدہ مرض کی دوائیں لینے آتی تھی اپنی معر خالہ کے لیے وہ اور اس کی خالہ فلیٹ میں اکٹھے رہتے تھے اور

کوئی تھا بھی نہیں ان کے خاندان میں اور میں نے کبھی ذاتی معاملات کے بارے میں استفسار بھی نہیں کیا تھا ٹریڈ کے

قول اس کی خالہ ہر ہفتے اپنی کسی بچپن کی کہانی سے ملنے شہر کے مضافاتی علاقے میں چلی جاتی تھی مجھے بھی صرف ہفتے

کے اختتامی روز ہی چھٹی ملتی تھی اس لیے بھی اس کی خالہ سے ملاقات نہیں ہو پائی ہم ہر ہفتے کی شام ملنے تھے بس کافی

پہنے اور ہلکی پھلکی گپ شپ۔۔۔ لے، ابھی اس کے فلیٹ پر اور بھی کسی ریسٹوران میں گپ شپ میں ہماری زیادہ تر بحث وفاداری و بے وفائی، درہم دونوں کے بغیر جیون ساتھیوں کے زندگی گزارنے کے موضوع پر ہوتی تھی۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے ایک ہی سوال ہوتا۔ اس کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ اگر اس نے گھر گرہتی شروع کر دی تو اس کی بہار اور ضعیف خالہ کیلے رہ جائے گی اور اس کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

”ویسے مجھے جلدی بھی کوئی نہیں، بہت وقت بڑا ہے ابھی۔“ وہ اس معاملے کی ہر بحث کو اسی فقرے پر سیمتی جبکہ میں ہمیشہ مغرب کے بے رخ اور وفا و محبت سے ناشناس معاشرے کا ہی گلہ کرتا، اسے اپنے دیس کی پریم کہانیاں اور وفا کے قصے مثالیں بنا کر سناتا اور مغرب کے پل پل بدلتے موسم کی طرح بدلتے رشتوں پر طنز کرتا۔

تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے ادویات کی ایک کمپنی میں باقاعدہ ملازمت کی پیشکش ہو چکی تھی اور مجھے ایک سال کے پہلے معاہدے پر کمپنی کی کینیڈا میں قائم فیکٹری میں بھیجا جا رہا تھا۔ وہ لندن میں میرا آخری روز تھا جب مجھے ٹریسا کے ہاتھوں نمکین کانپنے کو ملی۔

میں کینیڈا چلا گیا اور پھر روز بروز ملتی ترقیوں کے ساتھ بڑھتی ہوئی مصروفیات نے لندن اور لندن والوں یاد کرنے کا موقع ہی نہیں دیا میں اپنے دیس بھی نہ جا سکا وہاں بھی میرا کوئی تھا ہی نہیں سوا اس محبت کے جو مجھے وہاں جا کر ڈھونڈتی تھی کمائی کے نشے نے میرا دھیان وہاں سے بھی ہٹا لیا تھا۔

کمپنی نے میری پہلے سال کی بہترین کارکردگی پر مجھے مستقل ملازمت دے دی اور مزید دو برس کینیڈا میں ہی بیت گئے اب میں اس کمپنی کے اعلیٰ ترین بورڈ کارکن بن چکا تھا۔ لندن کے پلانٹ میں کچھ عرصے سے شدید مسائل پیش آرہے تھے جس بنا پر کمپنی نے مجھے لندن واپس بھیجا جہاں نمکین کانپ کی ایک چسکی نے مجھے ماضی کی یادوں میں ڈھکیل دیا۔

☆☆☆.....

میں نے اپنی نمکین کانپ ختم کی اور پیدل ہی ٹریسا کے فلیٹ کی جانب چل پڑا، وہ علاقہ یہاں سے دور نہ تھا۔ فلیٹ پر پہنچ کر میں نے دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا، میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر فلیٹ نمبر کی تصدیق کی۔

”کہو نو جوان میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ بزرگ نے اپنی وحشی ہوئی نیلی آنکھوں پر لگا موٹے عدسوں والا چشمہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”جی میں ٹریسا سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے شائستگی سے جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے نو جوان، تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے یہاں کوئی ٹریسا نہیں رہتی اس فلیٹ میں صرف میں اور میری بیوی رہتے ہیں۔“

”نہیں انکل وہ یہیں رہتی تھی میں ہر ہفتے اس سے یہیں ملتا تھا۔“ میں نے وضاحت دی۔

”کہیں تم لمبے عرصے بعد تو نہیں آئے۔“

”جی یہی کچھ تین برس بعد۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ ہم یہاں پچھلے اڑھائی سال سے رہ رہے ہیں، یہ فلیٹ ہمیں سماجی بہبود کے سرکاری ادارہ کی طرف سے عاریتاً دیا گیا ہے ہمیں سابق کینٹون کے بارے میں معلومات چاہئیں تو ادارے کے دفتر چلے جاؤ، وہ ضرور تمہاری مدد کر سگے۔“ بزرگ نے واپس مڑتے ہوئے مشورہ دیا اور میں ٹھکر یہ کہہ کر واپس ہولیا مجھے انجانائی سی تشویش اور اداسی نے گھیر لیا۔

میں نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو پانچ بج رہے تھے اور دفتر بند ہو چکا تھا، وہاں سے معلومات سوسوار سے پہلے نہیں مل سکتی تھیں موسم بہتر ہو رہا تھا بر فانی بارش کی پھوار بھی رک گئی اور بج بستر ہوا کے جھونکوں کی شدت بھی میرا من پہنچی کے فلیٹ کی تنہائی میں لوٹنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں نے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور اس علاقے تک جا پہنچا جہاں میں اپنے لندن کے گزشتہ قیام کے دوران رہتا تھا۔

میں نے عمارت کی مٹی منزل پر واقع اسٹور سے کچھ چاکلیٹس اور جوس کے ڈبے خریدے اور ساتوں منزل کے ایک فلیٹ پر دستک دی۔

یہ آئی ٹنیم کا فلیٹ تھا جہاں میں کبھی ایک خود مختار مہمان بن کر رہا کرتا تھا۔

آئی ٹنیم ایک ہندوستانی نژاد مسلم بیوہ خاتون تھیں اور یہاں اپنے معذور خاوند کے ساتھ رہتی تھیں فلیٹ کافی کشادہ تھا اور اس کا ایک کمرہ انہوں نے مجھے دے رکھا تھا میں انہیں اپنی رہائش اور کھانے کے عوض ایک مناسب رقم دیتا تھا ہم دونوں کا کام چل جاتا تھا، انہیں مالی معاونت مل جاتی اور مجھے کھانے پکانے اور کپڑے دھونے کے جھنجھٹ سے نجات مل جاتی، میرے ان سے تعلقات سکے ماں بیٹے جیسے تھے۔

آئی ٹنیم نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر حیرت اور خوشی سے ششدر رہ گئیں ان کے خاوند نے بھی وہیل چیئر دروازے تک لاکر میرا استقبال کیا۔

تین برس بعد ملے تھے دیر تک کپ شپ ہوتی رہی میری ترقی کا سن کر بہت خوش ہوئیں اور مزید کی دعا نہیں کرتی رہیں میں لوٹنے لگا تو انہوں نے مجھے اپنے کمرے سے خلوط کے کچھ لفافے دیے اور کہا کہ میرے نام کی یہ ڈاک میرے جانے کے بعد موصول ہوئی تھی میں نے ان کے ہاتھ سے لفافے پکڑے اور طویل عرصے تک سنبھالنے پر ان کا شکریہ ادا کر کے واپس ہولیا۔

اپنے فلیٹ تک پہنچنے کا کافی دیر ہو گئی تھی، میں نے ڈاک کے وہ لفافے بغیر پڑھے ہی ایک طرف رکھے اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلا دن اتوار تھا میں دیر تک سوتا رہا، چھٹی اور تنہائی نے اداسی میں اضافہ کیا تو میں پھر لندن کی سیر کو نکل پڑا۔ کوئی خاص کام تو تھا نہیں بس دیر تک بے مقصد گھومتا رہا یونیورسٹی کیسپس کی طرف بھی گیا اور اس کے سامنے پارک میں ایک بیچ پر بیٹھ کر کئی گھنٹے تک پرانی یادوں میں کھویا رہا جو زیادہ تر فریاء کے گرد ہی گھوم رہی تھیں۔

رات کی آمد ہوئی تو آوارہ گردی ترک کر کے واپس گھر کی راہ لی انجانی سی اداسی چھائی ہوئی تھی ٹی وی کے چینل بدل بدل کر دل بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک سے ڈاک کے وہ لفافے یاد آ گئے جو آئی ٹنیم نے دیے تھے ایک ایک کر کے انہیں کھولنا شروع کیا، کچھ میں اشتہارات وغیرہ تھے کچھ میں بینک اور کچھ کے معمول کے مطابق آنے والے اعداد و شمار کے گوشوارے۔

ایک پیلا لفافہ ان سب سے علیحدہ سا تھا اوپر لکھا ہوا تھا ”پیارے دوست ڈاکٹر شان کے نام فریاء کی طرف سے۔“ میں نے باقی کے لفافے ایک طرف پھینکے اور فریاء کا خط کھول کر آنکھوں کے سامنے کر لیا۔

پیارے دوست ڈاکٹر شان

مجھے امید ہے تم خیریت سے ہوں گے تم حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے تمہیں خط کیسے لکھ دیا تو جان لو کہ اس امید پر لکھ دیا ہے کہ اسے ایک دن تم ضرور پڑھ لو گے۔ میں اس خط میں بہت سی ایسی باتیں لکھنا چاہتی ہوں جو دراصل میں تم سے کہنا چاہتی تھی مگر کبھی کہہ نہ پائی، اس وقت شام رات میں ڈھل رہی ہے تم ابھی ابھی میرے فلیٹ سے کافی بی کر نکلے ہو میں ہمیشہ کی طرح آج بھی تم سے بہت ساری باتیں کرنے کی کوشش کی مگر نہ کہہ پائی، آج تو میں

تمہیں روکنا بھی چاہتی تھی بہت بہانے سوچے مگر ہر بہانے کو خود ہی مسترد کر دیا اور تمہیں نہ روک سکی میرے دل پر بوجھ بڑھ رہا ہے اسی لیے سوچا کہ جودل میں ہے لکھ دوں۔

میری تمہاری کہانی کا پہلا اور سب سے اہم سچ یہی ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں بہت محبت کرتی ہوں شاید اسی روز سے جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے میں نے تمہیں دیکھا تو یہ خواب بھی دیکھ لیا تم میری زندگی میں آ جاؤ گے اور اسے بدل سکو گے افسوس کہ وہ اک خواب ہی تھا۔

میں نے بہت سے بہانوں سے بہت بار تم سے محبت کی بات چھیڑ کر تمہارے دل میں ترنگ جگانے کی کوشش کی مگر ہر بار تمہاری میرا حوصلہ پست کر دیتی تھی۔

میں نے ایک دوست بن کر بہت لمبا عرصہ تمہارا اعتبار جیتنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی شاید میرے اعتماد کی کمی تھی شاید احساس کمتری تھا شاید میری کمتری ایک احساس سے زیادہ ایک حقیقت تھی۔ تم خوابوں کے غم میں رہنے والے خواب نگار کی کسی رانی کے متلاشی اور میں تمہارا لاچار اور بیمار۔ تمہیں بتاؤں کہ میں اس فلیٹ میں تنہا رہتی ہوں میری کوئی خالہ میرے ساتھ نہیں رہتیں، میرے علاوہ تم ہی ایسے اکلوتے انسان تھے جو اس فلیٹ میں بھی رہتی تھیں۔ تم میرے تھے جو دوں میں میں تمہارے دو ادا خانے سے لاتی تھی وہ کسی خالہ کے لیے نہیں، میرے لیے ہوتی تھیں میں تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر روتی تھی کہ تم میری لاچار سے نفرت کر کے کہیں مجھ سے دور نہ ہو جاؤ مجھے تم سے شدید محبت تھی اور ہے میں کسی طور بھی احتیاط سے قطع نظری کی روادار نہ تھی۔

میری محبت کی تسکین کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ تم صرف میرے دوست تھے، مجھ سے ملتے تھے میرے ساتھ کافی پی لیتے تھے، میرے ساتھ مسکرا لیتے تھے میں نے آج بھی تم سے بہت سے جھوٹ بولے تھے، مجھے جب سے تم نے اسے کینڈا جانے کے بارے میں بتایا تھا میں بہت ادا اس اور پریشان ہو گئی تھی، آج تو میرا صبر ہی جواب دے گیا تھا، مجھے کوئی فلو یا بخار نہیں تھا، میں صبح سے ہی رو رہی تھی تم نے میری سرخ آنکھیں دیکھ کر پوچھا تو مجھے فلو کے سوا کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں رو رہی ہوں اور یہ بھی کہ کیوں رو رہی ہوں، مگر مجھے یہ سب نامناسب سا لگا، مجھے علم تھا کہ تم میرے رونے پر نہ رو گے مگر پریشان ضرور ہو جاؤ گے میں نے خود کو تو روک لیا مگر آنکھوں کو نہ روک سکی وہ مسلسل بہہ رہی تھیں۔ جب تم کھڑکی میں کھڑے باہر دیکھے باتیں کر رہے تھے، میں تب بھی دوسری طرف منہ کیے کافی بناتے ہوئے روتی جا رہی تھی تم نے جب گھور یا، مورین، جینی اور سپانو کے طعنے دیے تو یہ سوچ کر میرا دل مزید پیچ پڑا کہ میں تمہیں کیوں نظر نہیں آتی، میں نے ایک لمبا عرصہ تمہیں متاثر کرنے کے لیے تمہاری پسند کے کپڑے پہنے، تمہاری پسند کی طرز پر زندگی گزار دی، ہر گفتگو میں تمہاری پسند کا خیال رکھا مگر تمہیں یہ سب نظر نہیں آیا۔ تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ محبت کا اظہار کرنے کے لیے بتانا ضروری نہیں ہوتا عمل خود ہی ظاہر کرتا ہے کہ مقصود کیا ہے، مگر یہ سب تمہیں مجھ میں کیوں نظر نہ آیا۔ یہ سوچ دھن میں آتے ہی آنسو ایک ریلے کی طرح ابلے اور میرے رخساروں پر سے پھسل کر کافی کے کپ میں جا کر گئے۔

میں کافی گرانے ہی لگی تھی کہ تم نے دھیان میری جانب کر دیا، مجھے علم ہے تمہیں کھانے پینے کی اشیاء ضائع کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا، میں نے آنسوؤں والا کپ اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔

مگر جانے کن سوچوں میں گھرے میرا دھیان ہی نہ رہا اور کپ تمہارے پاس چلا گیا تمہاری کافی میں ٹمک نہیں میرے آنسو تھے۔ تم بھی ہنستے ہنستے پی گئے اور میں تمہاری مسکراہٹ کی پیاسی تمہیں بتا بھی نہ سکی چلو آج کے لیے بس اتنا ہی، مجھے پتا ہے تمہیں لیے پیغام پڑھنا پسند نہیں، باقی کل کے خط میں لکھوں گی۔ یہ خط میں آنٹی نسیم کے پتے پر پہنچ رہی ہوں اور روز بھیجتی رہوں گی۔

جب تک تم لوٹ نہیں آتے یا میں مر نہیں جاتی روز تمہیں خط لکھوں گی روز تمہیں یاد کروں گی اس امید پر کہ تم بھی مجھے یاد کرتے رہو گی۔

تمہاری دوست، ٹریا
تمہاری ٹریا

خط پڑھتے پڑھتے میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں نے غفلت میں باقی سب لفافے کھول کر دیکھے مگر ٹریا کا کوئی اور خط نہ تھا۔

دوسری صبح میں سماجی مہبود کے سرکاری ادارے جا پہنچا اور ٹریا کا نام پتہ بتا کر معلومات ہارے استفسار کیا۔
جواب میں مجھے ٹریا کا جو پتہ دیا گیا وہ قبرستان کا تھا۔

میں دفتر سے نکل کر سیدھا قبرستان گیا اور ٹریا کی قبر پر پھول رکھ کر دیر تک خاموش کھڑا رہا شاید میں بھی اب اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا جواب صرف خاموش رہ کر ہی کی جاسکتی تھیں۔
ٹریا کی قبر پر جو تاریخ وفات رقم تھی، وہ اس دن کی تھی جس دن میں اس سے جدا ہو کر گینڈا پہنچا تھا۔
بہت عرصہ بیت گیا میں اب بھی اکیلا ہوں مگر اپنی سوچ کی بہت ساری تبدیلیوں کے ساتھ، مجھے اب محبت کی تلاش نہیں رہی۔

بس ہر شام میں نمکین کافی کی چسکیاں لیتے لیتے ٹریا کو یاد کرتے ہوئے گزارتا ہوں۔

☆.....☆/☆.....☆

مزہ..... میمونہ صدف

”کرٹل صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی بیوی ضرور صحت یاب ہوں گی۔“ ڈاکٹر انگریزی میں کرٹل حامد سے مخاطب ہوا۔

کرٹل حامد نے انسر دہ چہرے سے اثبات میں گردن ہلائی۔ حنا کو کوما میں گئے ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تھا۔ وہ بچہ جس کی پیدائش کے دوران حنا غلط انجکشن کے باعث کوما میں چلی گئی تھی، اب ڈبہ کے دودھ اور آبی کے سہارے پلنے لگا تھا۔ کرٹل حامد روز شام کو اسپتال کا چکر لگاتے پھر ایک دن کے بعد آنے لگے پھر آہستہ آہستہ یہ دورانیہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ پہلے پہلے وہ بچوں کو بھی کبھی کبھی اسپتال لایا کرتے تھے۔ اب یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ اس کے میکے میں تھا بھی کون ایک بھائی تھا جس کی بیوی کبھی کبھار اسے دیکھنے آیا کرتی تھی۔

کرٹل حامد کو کسی نے مشورہ دیا کہ اسے گھر لے جائیں شاید بہتری آئے۔ اس بات کو مانتے ہوئے وہ اسے گھر لے آئے۔ ایک الگ تھلک کمرے میں ایک نرس کی زیر نگرانی اسے رکھا گیا۔ اس کمرے میں کبھی کبھار اس کا کوئی بچہ آجاتا یا کبھی کرٹل صاحب لیکن کسی نے اس کو چھوئے کی کوشش نہ کی۔ بشیر جو اس گھر کا پرانا نوکر تھا وہ واحد شخص تھا جس نے اس کمرے میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ حنا کی ادھ کھلی آنکھیں شاید اس کی منتظر تھیں۔

”پاپا! آپ! آپ! ماما کو کسی اسپتال میں یا اولڈ ہوم میں کیوں نہیں چھوڑ آتے؟“ یہ اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو اب بیس سال کا ہو چکا تھا اور اپنا کاروبار کر رہا تھا۔ اسے تعلیم سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔

اس کی تجویز پر باقی بچوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کرٹل حامد بھی بیوی کی اس حالت سے نالاں تھے، بچوں

کی مانتے ہوئے پھر سے حنا کو اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔

ملنے جلنے سے قاصر، درد اور غم میں ڈوبی وہ تہا، نہ زندوں میں تھی اور نہ ہی مردوں میں۔ اس کے احساسات تو کام کر رہے تھے لیکن اس کا جسم نہیں۔ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا کہ بس سانس چل رہی ہیں۔ سرخ و سفید رنگت کی سرخی اب ختم ہو چکی تھی۔ چہرے پر اگر بھی تھی تو موت کی سفیدی۔ اس کے حسین بال جو کسی زمانے میں رشک کی علامت ہوا کرتے تھے اب کاٹ کر چھوٹے چھوٹے کر دیے گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک پر مردگی میں اور ہونٹ پھیکے پڑ چکے تھے شاید یہ ناامیدی کی نشانی تھی۔ اس کے تمام جسم میں بس ایک آنکھیں تھیں جو مکمل زندہ تھیں۔ گاہے بگاہے ان سے آنسو بہا کرتے تھے، احساسات اور جذبات کا اظہار صرف یہ آنسو ہی تھے۔

وہ خود، اپنے چہرے سے کبھی تک نہ اڑا سکتی تھی۔ بے بسی کے عالم میں سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ اسے دیکھنے اس کا حال پوچھنے تک کوئی نہ آتا۔ بس ایک بھابھی تھی جو بھی کبھار آتی آیا اور نرسوں کو کچھ پیسے تھماتی اور حنا کا خیال رکھنے کا کہتی۔

”حنا کو بھوک لگی ہے؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں تھے جب ایک کرخ آواز میں پوچھا گیا۔ وہ آنسو کی کھانے یا پینے کی طلب کے لیے نہیں تھے بلکہ اس تہائی اور دکھ کے تھے جس میں وہ تھی۔

”کھلاتی ہوں، کھلاتی ہوں۔ ایک تو یہ امیر لوگ بھی اپنا عذاب ہمارے سر تھوپ جاتے ہیں۔ آیا کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا، وہ چسکیاں لے کر چائے پی رہی تھی۔

وہ یہ بات اچھے سے جانتی تھی کہ یہ عورت کسی سے اس کی شکایت نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس سے جو چاہے سلوک کرتی۔ ایک تلخ جملہ بول کر وہ پھر سے چائے پینے میں مگن ہو گئی۔ حنا کی آنکھوں سے دو آنسو گرے اس کے گالوں کو تر کرتے ہوئے سر ہانے میں جذب ہو گئے۔

☆☆.....

”شبیر یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ سرخ و سفید چہرہ، لہلہا، خوش نما اور کالے بال۔ غرور اور جھنجھ، خوبصورت لباس زیب تن کئے وہ نوکر کے سر پر کھڑی غرار ہی تھی۔ شبیر جو اس گھر کا پرانا نوکر تھا، باورچی خانے سے باہر فرس پر بیٹھ کے کھانا کھا رہا تھا۔

”بیگم صاحبہ وہ.....“ نوکر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ لگا رہی ہے اور تم یہاں بیٹھ کر کھانا کیوں کھا رہے ہو؟“ وہ دھاڑی۔

”بیگم صاحبہ شام کے چار بج رہے تھے۔ مجھے بھوک لگی تھی تو.....“ شبیر کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

”ایک تو لفظ بیگم صاحبہ! تم مجھے میڈم نہیں کہہ سکتے؟“ حنا پھر سے چلائی۔

”جی جی میڈم۔“ شبیر نے مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق سر جھکا لیا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شبیر کو محسوس ہوا کہ حنا کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اس نے سالن کی

پلیٹ میں پڑا نوالہ اٹھایا اور منہ تک لے جانے لگا۔

”کوئی احساس نہیں تمہیں، نہ تہذیب ہے اور نہ میرے غصے کا کوئی اثر، جاہل انسان۔“ حنا نے آگے بڑھ

کر سالن کی پلیٹ کو پاؤں سے زوردار ٹھوکر لگائی۔ ٹھوکر کے زور سے سالن کی پلیٹ اڑتی ہوئی شبیر پر جا گری

سالن اس کے منہ، بالوں، کپڑوں اور فرش پر بکھر گیا۔ اس انہونی افتاد سے بکھرا کر اس کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔

صرف اسی پر موقوف نہیں۔ وہ آگے بڑھی اور شیر کو بھی ایک زوردار ٹھوکر لگائی وہ ایک جانب کولڑھکتے لڑھکتے سنبھلا۔ اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک ہاتھ زمین پر ٹکادیا۔

”دونکے کا انسان۔ میرے نکلڑوں پر پلنے والا مجھے جواب دے گا۔“ اس کے زہر خندہ الفاظ شیر کے کانوں سے ہوتے ہوئے دل میں اتر گئے۔ ٹھوکر اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی روح کو لگی تھی۔

اس نے پہلے اپنے جسم کو دیکھا جس پر جگہ جگہ سالن گر چکا تھا پھر فرش کو۔ اس کے کندھے پر دھرا سفید کپڑا جس پر سرخ رنگ کی دھاریاں تھیں جسے پنجابی میں پرنا کہا جاتا ہے وہ بھی سالن کے چھینٹوں سے داغدار ہو چکا تھا۔

شیر کے لیے یہ تمام واقعہ کسی زلزلہ سے کم نہ تھا۔

”اے کاش! اس عورت کے پاؤں اس قابل نہ رہیں کہ وہ رزق کو ٹھوکر مار سکے اور زبان اس قابل نہ رہے کہ ہر اگل سکے۔“ شیر کے دل سے بے اختیار آہ بھری اور سر جھکا لیا۔ وہ کرتا بھی تو کیا؟

”اب سر جھکا کر بیٹھ گئے ہو۔ ایک منٹ کے اندر اندر سب اٹھاؤ اور جاؤ یہاں سے۔“ حنا نے نخوت سے ناک چڑھایا۔ ایسے جیسے وہ کوئی غلیظ چیز ہو شیر نے اپنے کندھے سے پرنے کو اتارا اور اس سے فرش صاف کرنے لگا۔ فرش کو صاف کرنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے کی جانب بڑھ گیا۔ برتن دھو کر وہ ایک جانب بیٹھ کر رونے لگا۔

اس لیے نہیں کہ اس کی ہنک کی گئی تھی۔ اس لیے کہ تمام رزق ضائع ہو گیا تھا۔ اس کی بھوک کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس کی غربت کو طعنہ دیا گیا۔

حنا کے لیے یہ ایک معمولی واقعہ تھا ایک عام سی بات۔ شام تک یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔“ کرٹل حامد نے پیار سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

کرٹل حامد ایک اچھا انسان تھا۔ انسانیت کی پاسداری کرنے والا، خدا ترس اور محبت کرنے والا، نوکروں کے ساتھ بہت شفقت جیسے وہ اس کے اپنے ہی بچے اور بھائی ہوں۔

حنا ایک انتہائی خوبصورت عورت تھی اور کرٹل صاحب نے اسے محبت میں اپنے سر چڑھا رکھا تھا اس لئے گھر میں وہ سردار تھی، اس کی ہر بات اٹل، ہر فیصلہ پتھر پر لکیر سمجھا جاتا تھا۔

لیکن حنا صورت کے ساتھ ساتھ سیرت کے حساب سے بھی کرٹل صاحب سے بہت مختلف تھی، اس لئے وہ ایک مکمل جدید دور کی لبرل عورت تھی۔

کرٹل صاحب کو یہ باتیں انتہائی ناگوار گزرتی تھیں لیکن اس کی بے پناہ محبت میں سرشار کرٹل صاحب اسے دیکھتے ہی موم ہو جاتے تھے، حنا بھی جانتی تھی کہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار خوبصورتی ہے۔ جس کا جادو چلا کر وہ ہمیشہ کرٹل صاحب سے اپنی ہر بات منواتی تھی اور پھر رات کی رانی کو پذیرائی تو ملتی ہی ہے۔

”کرٹل صاحب جب تک یہ شیر جیسے نوکر اس گھر میں موجود ہیں تا تب تک پریشانی سے نہیں بچا جاسکتا۔“

شوہر کے پیار بھرے لہجے نے اسے دن کا واقعہ یاد کروا دیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ کرنل حامد کو علم تھا کہ شبیر ان کا وفادار نوکر ہے۔ وہ ایک عرصے سے ان کے ہاں کام کر رہا تھا۔

”جب میں پارٹی سے واپس آئی تو وہ باورچی خانے سے باہر فرش پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا، بدتہذیب۔“

حنانے کہا۔

”بیگم! چھوڑیں جانے دیں۔“ کرنل حامد بات کو ٹالنے کے انداز میں بولا۔

کرنل حامد کو اس کی خوبصورتی سے محبت تھی اور اسے اپنی حیثیت پر ناز تھا۔

چند ماہ بعد اللہ نے ان پر مہربانی کی اور انہیں اولاد کی دولت سے نوازا۔ حنا کو زچگی کے ایام میں اسپتال داخل کرایا گیا۔ جہاں کوئی غلط انجکشن لگنے کے باعث وہ مفلوج ہو گئی۔

☆☆☆

”ڈاکٹر ان کے ہوش میں آنے کے کیا امکانات ہیں؟“ کرنل حامد اپنی جواں سال بیوی کو جلد از جلد صحت

یاب دیکھنا چاہتا تھا۔

”ایک دن، ایک ماہ، ایک سال دس سال، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

وہ تمام باتیں سن رہی تھی، ایک امید کا پودا اس کے دل میں اگ چکا تھا شاید وہ چند دنوں تک ٹھیک ہو جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔

کھٹے دنوں میں، دن، ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اسپتال کے سفید بستر پر مریضوں کے لیے مختص دھاری دار سفید لباس میں ملبوس اس کو سولہ برس ہو چکے تھے۔ وہ ایک سانس لیتی لاش کی مانند تھی لیکن اس لاش کا دل و دماغ کام کرتا تھا۔ وہ ہر بات، ہر رویہ محسوس کر سکتی تھی لیکن نہ تو جواب دے سکتی تھی اور نہ ہی بول سکتی تھی۔ اب اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اپنے ماضی کو، حال کو سوچنے کا۔ وہ سوچتے سوچتے ماضی کی دھندلی راہداریوں پر چلنے لگتی۔ جہاں یارٹیاں تھیں، نمود و نمائش تھی، بے راہ روی تھی، اس کا تنا سب سراپا، لمبا قد جسے ہر لمحہ سراہا جاتا تھا۔ دین تو اس کیلئے محض ایک ریت تھی جس سے اس کے لبرل ازم ماحول اور جھوٹی حقیقت پسندی نے دور کر دیا تھا اور وہ تو کسی چیز سے محروم نہ تھی، نہ دولت سے اور نہ ہی خوبصورتی سے۔ اس نے ہمیشہ یہ سمجھا تھا کہ جو اس کے پاس تھا وہ اس کی کمائی ہے۔ اس نے تو کبھی اللہ کے احسان کو احسان جانا ہی نہ تھا۔

کرنل حامد دوسری شادی کر چکا تھا۔ وجہ جس کی پیدائش پر وہ اس حال میں پہنچی تھی وہ اب سترہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے آج تک اسے دیکھا تک نہ تھا۔ اب وہ ایک حوط شدہ لاش کی مانند سب کے لیے منحوس تھی۔ ایسی نحوست جس پر ترس کھانے کو بھی کوئی تیار نہ تھا۔ اس لاش کو کوئی اپنے گھر میں سجانے کو تیار تھا۔ نہ تو کرنل حامد اپنی زندگی میں اسے جگہ دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کے بھائی بھابھیاں۔ سب کو منحوس ہوتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ نحوست انہیں تباہ کرے گی۔ اس نحوست کو اسپتال کا عملہ بھی ایک مستقل عذاب سمجھتا تھا۔ ایسا عذاب جس کی وجہ سے ایک بستر مستقل طور پر ہر لمحہ مصروف تھا۔

آج میرے پاس سوائے سانس کے اور کچھ نہیں لیکن اتنی مشکل سانس وہ خود کلامی کیا کرتی کیونکہ اس کی آواز سننے سے سب قاصر تھے۔

”اللہ! میں نے تیرے کسی احسان کو نہیں مانا لیکن یہ آزمائش میرے لیے بہت مشکل ہے یا تو اس کو ختم کر یا پھر مجھے صحت یاب کر دے۔“ دعا نے اس کی آنکھوں کو بھگودیا تھا۔

”یہ کیسی سزا ہے میرے اللہ؟ جو ختم نہیں ہو پارہی۔“ وہ آنسو روک نہ پاتی تھی۔ آنکھیں بھیگنے لگیں اور تواتر سے آنسو بہنے لگے۔

”اب کیا چاہیے بیگم صاحبہ؟“ آیا نے اسے روتے دیکھا تو چلا کر بولی۔

”بیگم صاحبہ..... بیگم صاحبہ.....“ اس کے کانوں میں شبیر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس کے دماغ میں یہ لفظ ایک ہتھوڑے کی طرح بجنے لگا تھا۔

”شبیر..... شبیر میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں، مجھے معاف کر دو معاف کر دو مجھے..... خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، آج سترہ برس ہو گئے ہیں اس سزا کو سہتے ہوئے مجھے۔ حنا اپنی دانست میں چلائی لیکن اس کی زبان سے کوئی لفظ ادا نہ ہو پایا۔ چلانے کی کوشش میں اس کے منہ سے غوں غاں سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔

”کیا ہوا۔ اے بی بی۔ کیوں شور مچا رکھا ہے؟“ آیا اس کے پاس آ کر چلائی۔

”مجھے معافی مانگنا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس سزا کو ختم کرنا ہے۔“ اس نے جواب دیا لیکن جواب میں کوئی لفظ نہیں تھا اور آیا اس کے ماضی سے لاعلم تھی۔

”سوجاؤ شور مت مچاؤ۔“ آیا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں مرجانا چاہتی ہوں، مجھے مار دو وہ کہنا چاہتی تھی لیکن اب کے حلق سے غوں غاں کی آواز بھی نہ نکل پاتی تھی۔

وہ معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن قدرت اسے یہ موقع دینے کو تیار نہ تھی۔ وہ مرنا چاہتی تھی لیکن موت اسے گلے لگانے سے انکاری تھی۔

”پتہ نہیں کون سے کروت ہیں جن کی سزا بھگت رہی ہے یہ عورت۔ توبہ استغفار..... توبہ۔“ آیا نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس نے رزق کی توہین کی تھی۔ انسانیت کو پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی۔ اس کے پیچھے ایک غریب کی آہ لگی تھی۔ وہ آہ جس نے آسمان تک ہلادیا تھا۔

سزا..... سزا..... استغفار..... استغفار..... وہ یہ لفظ دہرانے لگی۔

ہوٹل..... عارف شیخ

آج میرے ساتھ ایک بڑا غیر مناسب واقعہ ہوا۔ میرا نام رحمت ہے اور آج میرا اسکول کا آخری دن تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ دوپہر میں باہر یعنی ہوٹل میں کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ ہم تینوں گھر سے زیادہ دور جا نہیں سکتے تھے اس لیے اسکول سے گھر جاتے ہوئے بازار کے نزدیک والے ایک ہوٹل پر ہم تینوں جا پہنچے۔ میرے دوست افضل نے کرسی سنبھالنے ہی کہا۔

”گوشت کا سالن آؤر کیا جائے۔“

”یار بریائی نہ کھائی جائے۔“ فرید بولا۔

”اتنے میسے نہیں ہیں۔“ میں نے دونوں کو یاد دلایا۔

”دوسالین مٹکوا لو اور گڑا را کرو۔“

”ہاں یار ابھی ہم لوگ کما تے نہیں ہیں۔“ فرید نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”لیکن جب میں کماؤں گا تو شہر کے ہر ہوٹل کا میٹ چپک کر وں گا۔“

”یعنی ساری کماؤں اسی میں لٹائے گا۔“ افضل نے کہا۔

”یار انسان کما تا کس لیے ہے؟“ فرید ہنس کر بولا۔

”کھانے پینے اور عیش کرنے کے لیے۔“ افضل نے جواب دیا۔

”اب جلدی آؤ کر دو اگر گھر دیر سے پہنچے تو جواب دہی ہو جائے گی۔“ میں نے خود کو شامل گھٹکوا کیا۔

افضل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ویٹر کو بلایا۔

”دیکھو بھئی ایک بھنا سا کھن لے آؤ اور ایک عدد دال لے لو۔ گرم روٹیوں کے ساتھ اس نے ویٹر کو آؤ دیا۔

”دال فرائی لا تا۔“ میں نے کہا۔

”اور ہاں روٹی ایک ساتھ مت لا تا۔ ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی اور سارا مزہ جاتا رہے گا۔“ فرید بولا۔

”ساتھ میں سلا دو وغیرہ بھی لیے آ تا۔“ افضل بولا۔

ہم تینوں اس وقت خود کو خود بخود محسوس کر رہے تھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم جوان ہو چکے ہیں اور اپنا فیصلہ خود

کر سکتے ہیں اس صورت حال سے طبیعت بڑی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

”بڑا رش ہے ہوٹل میں۔“ میں نے چاروں طرف دیکھا۔

”ہاں یار کوئی ٹیبل خالی نہیں ہے۔“ فرید نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

”دو پہر کا وقت ہے۔“ افضل بولا۔

”اسی لیے ہوٹل میں بھیڑ ہے۔“

”ہوٹل تو رش ہی رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہم اسکول سے گھر جاتے ہیں تو اسی ہوٹل کے سامنے گزرتے ہیں کیا تمہیں یاد ہے کہ ہوٹل خالی نظر آیا ہو۔“

”شاید تمہاری بات ہے۔“ افضل نے ہاں میں سر ہلایا۔

”ہوٹل میں گاؤں کا رش رہتا ہے۔“

”کیوں نا ہم تینوں مل کر ہوٹل کا کاروبار کریں۔“ فرید کا دماغ کاروباری انداز میں سوچ رہا تھا۔

لیکن میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اس لیے کہ ویٹر ہمارا آرڈر لے آیا تھا اور اب ہمیں گرما گرم کھانا کھانا تھا

ورنہ کھانا ہم نے زیادہ بات چیت نہیں کی شاید گھر جلدی پہنچ جانے کی وجہ سے ابھی ہمارا بچہ اختتام پذیر ہی ہوا تھا۔

کہ میرا دل اچانک اٹھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ میرے دادا ہوٹل میں داخل ہو چکے تھے اور ان سے اب بچا بھی نہیں

جاسکتا تھا اس لیے کہ انہوں نے بھی مجھے اور دوستوں کو دیکھ لیا تھا وہ سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔

میں بالکل ہی بھول گیا تھا کہ روز اندازہ نامزد پڑھ مسجد سے گھر اس راستے سے جاتے ہیں لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا

میرے دونوں دوست بھی حیران پریشانی کی حالت میں غرق تھے ہم تینوں اپنی اپنی جگہ جامد ہو چکے تھے۔

دادا بالکل پاس آ گئے۔ کھانا ختم ہو گیا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔ ہم تینوں نے بڑی مشکل سے سر کو ہاں میں ہلایا۔

دادا نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کھانے کا کتنا بلی ہوا ہے ویٹر کے بتانے پر دادا نے کھانے کا

معاوضہ ادا کر دیا اور اس کے بعد جو ہوا وہ بالکل خلاف توقع تھا۔ ایک زوردار چھڑ میرے منہ پر پڑا اور میں اپنی تھیلی سے

گال کی سکانی کرتا رہ گیا۔

میرے دوست کی حالت تو بالکل ایسی تھی کہ کانٹو تو جسم میں خون کی ایک بوند بھی نہ لگے۔ تم دونوں سیدھے گھر دوڑ جاؤ ورنہ اٹکا پھڑر سید کروں گا۔“

فرید اور افضل نے یہی غنیمت جانا اور وہ دوڑ گئے انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ہوٹل میں موجود ساری آنکھیں مجھے ہی دیکھ رہی تھیں کچھ تو مسکرا کر میرا مذاق بھی اڑا رہے تھے۔

”گھر چلو۔“ دادا کی آواز میرے کانوں تک آئی اور پھر دادا ہوٹل سے نکل گئے۔

میں لا چاری کے انداز میں کمزور قدموں کے ساتھ اپنے دادا کا تعاقب کر رہا تھا چند منٹ قبل ہی جس آزادی کو محسوس کر کے خوش ہو رہا تھا وہ ذرا سی دیر میں غلامی میں بدل چکی تھی ایک ہی سوال و ماغ میں گونج رہا تھا کہ اگر میرا جرم کیا ہے میں تو صرف کھانا کھا رہا تھا لیکن اس سوال کو زبان پر لانے کی ہمت نہیں تھی۔

ہم دونوں آگے پیچھے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ دادا کوئی اور بات کرے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں ماں کے پاس چلا آیا۔ اور پھر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا آنسوؤں کے ساتھ میں نے اپنی امی جان کو اپنی بے عزتی کی روئیدار سناؤالی امی ابھی حیران تھی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہیں اجازت لے کر جانا چاہئے تھا شاید یہ بات تمہارے دادا کو پسند نہیں آئی۔

شام تک میرا غم غلط ہو چکا تھا اور میں سب بھول کر دوستوں کے ہمراہ کرکٹ کھیل رہا تھا میرے ساتھ افضل اور فرید بھی تھے وہ بھی حالات نارمل دیکھ کر کافی خوش تھے اور دادا سے اس کے بعد سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔

رات میں ہم سب کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے لہذا کھانے پر دادا بھی آئے تھے اور ابو بھی آئے تھے لیکن ابو ہر بات سے لا علم تھے نہ تو میں نے اپنی بے عزتی کی بابت کوئی بات کی اور نہ ہی امی نے میری شکایت لگائی۔ دادا تو خود فیصلہ کرنے والوں میں سے تھے اس لیے انہیں ابو کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں بھی مطمئن تھا کہ سارا معاملہ ختم ہو گیا لیکن پھر اچانک میری چھوٹی بہن نے آ کر بتایا کہ مجھے دادا اپنے کمرے بلارہے ہیں جب مجھے معلوم ہوا کہ ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا ہے۔

میں کمزور اور ڈرے ہوئے دل کی ساتھ دادا کے سامنے پہنچا۔

”آپ نے مجھے بلایا ہے۔“

”بیٹہ جاؤ۔“ دادا کی آواز بے حد نرم تھی۔

میں ایک کرسی پر ایسے بیٹھ گیا جیسے موقع ملے ہی بھاگ جاؤں گا۔

”تم سوچ رہے ہو کہ کیا کھانا کھانا جرم ہے جتنا جتھڑا کھانا پڑ گیا۔“ دادا کی آواز میرے کانوں تک آئی۔ لیکن میں جواباً خاموش رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے خطانہ ہو جائے۔ کھانا کھانا کوئی جرم نہیں ہوتا۔ دادا بولے لیکن ہوٹل جا کر کھانا ٹھیک نہیں ہوتا۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن میں پھر بھی خاموش تھا۔

”پہلے زمانے میں ہوٹل نہیں سرائے کہے جاتے تھے اب انہیں ماڈرن کر کے ہوٹلوں کا نام دیا گیا ہے سرائے یا ہوٹل ان کے لیے بنائے جاتے تھے جو مسافر ہوتے تھے اور عارضی طور پر ٹھہراتے تھے۔ دادا کی آواز میری ساعت تک آ رہی تھی۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ ہوٹلوں میں کھانا وہ لوگ کھاتے ہیں جن کے گھر بار نہیں ہوتے۔ تمہیں شاید میری باتیں پرانے وقتوں کی محسوس ہوں گی لیکن سچ تو یہی ہے کہ ہوٹلوں میں کھانا وہ لوگ کھاتے ہیں جن کے گھر بار نہیں ہوتے یا وہ اپنے گھروں سے دور ہوتے ہیں۔ دادا کچھ دیر توقف کر کے دوبارہ بولے۔ اب تم کوئی سوال کر سکتے ہو۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے جانے کی اجازت دے دی لیکن میرے دماغ میں ایک سوال ضرور تھا کہ میرا تو سارا نہیں تو آدھا شہر ہوٹلوں میں ہی ہوتا ہے کوئی کھانا کھانا کوئی چائے پی رہا ہوتا۔ کیا یہ سارا شہر گھبراوا لائیں ہے۔ صبح سے رات گئے تک ہوٹل لوگوں سے بھرے ہیں کیا پورا شہر مسافر ہے شاید ایسا ہی اسی لیے میرا شہر گھر جیسا نہیں رہا اس کے رہنے والے بھی اس کے مسافر ہو گئے ہیں۔

☆.....☆/☆.....☆

وہ کچھ اور تھا..... ماہ دس طالب

میرا اس سے باقاعدہ اور انفرادی طور پر تعارف یونیورسٹی کے دوسرے سال میں ہوا تھا کہنے کو وہ میری ہوٹل اور کلاس میٹ بھی مگر اسوس کہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوب سیرت ہرگز نہ تھی اپنے آپ میں رہنے والی نہایت کم گو نہ خود کسی سے جلدی کلام کرتی نہ کسی کا بے تکلف ہونا اسے پسند تھا کوئی کلاس روم میں اس کے ساتھ بیٹھتا تو یو ہڑ بڑاتی جیسے سانپ دیکھ لیا ہوا کٹر بھی گراؤ نہ کہنے میں اپنے ہوٹل یا کلاس میٹس کے گروپ کو دیکھتی تو انداز میں فوراً ایسا کھچاؤ آجاتا جیسے اس نے اپنی بنگلوں میں خزانہ دپایا ہو اور اگر کسی کو خبر ہوئی تو وہ ہتھیا کر لے جایگا حالانکہ بڑھائی میں بھی وہ اوسط درجے کی تھی مگر محسوس ہوتا تھا کہ اسے اچھے اکیڈمک ریکارڈ بنانے میں کوئی دچکی ہے نہ سوشل سرکل بنانے میں۔

جبکہ مجھے سمیت میرے سارے گروپ کا یہ حال تھا کہ پیپرز کا سنتے ہی سارے مستی دہنگامے کے پروگرامز کینسل کر کے کتابوں کو گلے لگا لیتے اس کی شخصیت میرے لیے اتنی ہی غیر اہم تھی جتنی کہ گزشتہ حکومت کے لیے عوام اور اس کے مسائل۔

تو پھر میں اس کے اتنے قریب کیونکر ہو گئی کہ اپنے سارے دکھ کہنے کے لیے اسے میرے علاوہ کوئی نہ ملتا۔ اور میں جس کا اپنا حلقہ احباب مکمل تھا اور جس کی دوستیں ایسے رویے پر اس سے خفا ہو جاتیں مگر مجھے لاشعوری طور پر اس کی فکر ہونے لگی تھی اور ایسے میں اپنی سہیلیوں کی بھی پرواہ نہ کرتی۔ یہ کہانی لمبی تو ہے پر مختصر مختصر آپ کو سنانی بھی ہے۔

☆.....☆.....

”منہج کل تم نے ماہم کو دیکھا تھا۔“

میں اوون میں کھانا گرم کر رہی تھی جب زارا نے سراپسی انداز سے مجھے مخاطب کیا۔

”مطلب کہاں۔“

”وہ کاریڈور کے باہر دھیرے دھیرے چمک کاٹ رہی تھی اس کی آنکھوں سے خون ایسی لالی چھلک رہی تھی یوں جیسے کوئی خونخوار جانور ہو۔“ زارا نے خوف سے اپنی آنکھیں پھیلانیں۔

”ارے جاؤ کوئی لمبی ہی ہوگی مجھے بیوقوف مت بناؤ۔“

ہمارے ہوٹل میں بلایاں بہت تھیں بلکہ ہر رنگ اور حجم کی بھی سوسن فوراس کا مذاق سمجھ گئی (اور ویسے بھی وہ اتنی ذہین تھی نہ اس کی جس مزاح تیز تھی کہ میں فوراً سے پھنس جاتی)

”ہی ہی جو بیٹا ہوا اس پر دوبارہ محنت کرنے کی کیا ضرورت۔“ وہ بھی جل کر دوبدو بولی۔

”تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو دفع ہو جاؤ۔“

”جانی ہوں پر بات سنو نمبرہ لوگ مودی دیکھنے جا رہے ہیں تم بھی ریڈی ہو جاؤ۔“ کہہ کر وہ نہانے کی غرض سے

عسل خانے چلی گئی جبکہ مجھے ابھی لباس منتخب کرنا تھا۔

شام میں اور ارم آخر میں ایک ساتھ ہوٹل سے نکلے تھے گیٹ کے قریب جاسن کے پڑنے کے نیچے بیٹھے میں نے اس کو دیکھا وہ بند آنکھوں سے بچانے کس سے مخاطب تھی گاڑا نکل بھی وہاں موجود نہ تھے اور ہوٹل کا داخلی احاطہ اس وقت سناں تھا پھر جیسے ہی مجھے منیر انکل میں سے آتے دکھائی دیے اس نے بھی جھپٹکے سے اپنی آنکھیں کھولیں اور میری جانب دیکھا میں یکدم ڈری کیونکہ اس کی آنکھیں غیر معمولی حد تک سرخ تھیں۔
لیکن جلد ہی مووی دیکھنے کے جوش نے ہر غیر معمولی بات کو پس پشت ڈال دیا پھر دو گھنٹے تک مووی دیکھ کر میرے تو واقعی دماغ کی گھنٹیاں بچ گئیں۔

.....☆☆.....

دو ہفتوں بعد ڈیٹ شیٹ لگ گئی اور حسب معمول سب بھول بھال کر کتابوں میں سر دینے لگے اچھے پیرز ہو جانے کی خوشی اور گھر جانے کے جوش میں ہم سب فریڈ ڈیٹ ل کر ایک دوسرے کو ہی ڈیٹ دے ڈالی۔
مجھے تو یوں بھی اس بار ہمیشہ سے زیادہ جلدی تھی گھر جانے کی عمار (میرا خالہ زاد) کے ساتھ میرا نکاح جو ہونے والا تھا زارا لوگوں نے چھیڑ چھیڑ کر مجھے عاجز کر دیا تھا اوپر سے بار بار نکاح پر بلانے کی یاد دہانی (معلوم نہیں ماما اجازت دینگی بھی یا نہیں وہ اتنی گاڑھی دوستیوں کو زیادہ پسند نہ کرتی تھیں۔
”بہت ہوا تو رخصتی پر قریبی ترین دوست کو بلالینا۔“ ان کے نزدیک یہی کافی ہے)

.....☆☆.....

وہ رات کا دوسرا پہر تھا۔

پیار کی شدت نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا تھا اور بری قسمت کہ روم میں اس وقت پانی کی ایک بوتل بھی موجود نہ تھی بادل خواستہ اندھیرے میں زارا اور ارم کی ٹانگیں پکڑ کر مجھے میس (ہوٹل کا باورچی خانہ) کا رخ کرنا پڑا۔
چھینکروں کی آواز اور آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں فضا میں عجیب سی سرسزا نہیں پیدا کر رہی تھیں خشک ہوا سے نیم کے دیو قامت پڑی کی شاخیں جھول جھول جا رہی تھیں لمبے کاریڈور کے وسط میں سفید بڑے سیلیب کی روشنی بھی اس وقت ناکافی معلوم ہوتی تھی اور چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا..... گلاس بھر کر پانی پینے کے بعد میں نے جگ میں بھی پانی بھر لیا اور تیزی سے قدم اپنے کمرے کی جانب بڑھانے لگی لیکن جب قدرت آپ کو کچھ دکھانا چاہے تو ساری چیزیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

”یہ بلی کو اس وقت بھی چھین نہیں۔“ میں جی ہی جی میں بڑبڑاتی میرے کمرے سے اگلے کاریڈور کے سامنے کمرے کے باہری احاطے میں وہ تھپتا بڑی سی بلی پاشا بدلائی تھا جو یہاں سے وہاں چل قدمی کر رہا تھا روشنی انتہائی مدہم ہونے کے باعث میں وثوق سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

بلی کو خواخواہ غصے سے دیکھتے ہوئے میں جیسے ہی آگے بڑھی میرا رنگ فق سے اڑا اور جسم لرز کر رہ گیا بلب سے پھوٹی روشنی کی لکیر سیدھا اس کے وجود پر پڑی تھی وہ ماہم تھی بچوں کے بل زمین پر رکتی وہ ماہم تھی بھی بالوں کو جوڑے میں قید کیے خاک رنگ کی شلوار میں پہنے اپنے گھٹنے اور لاغر ہاتھ فرش پر جمائے وہ سر جھکا کر رینگ رہی تھی فضا میں اب اس کے بڑبڑانے کی آواز بھی نمایاں ہونے لگی تھی اف میں اس کے ہونے پر شاید بھی یقین نہ کرتی اپنے دیکھے کو بھی جھٹلا دیتی میں اس کو اپنا وہم سمجھ لیتی اگر جو اس سے مل نہ رہا اور فائقہ نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا ہوتا۔

میں نے اپنی چیخ کو کس طرح حلق میں دبایا یہ میں بھی نہیں جانتی جھپٹکتے جگ کو کانپتے ہاتھوں سے پکڑے میں کمرے میں بچتی اور جگ کو تقریباً سیلیب پر پھینک کر میں نے بستر پہ لیٹنے ہی خود کو جیسے کبل کے اندر دفن کر دیا میرا تنس غیر معمولی حد تک تیز ہو چکا تھا اور میں آنکھیں بند کر کے کچھ دیر قبل کا منظر اور نہرہ فائقہ کی چھیٹوں کے بعد کی باتوں

(جنہیں اب سے پہلے تک میں بے پرکی جھٹی رہی تھی) کو ذہن میں دہرانے لگی۔

”اے منہا تمہیں معلوم ہے ماہم پر سایہ ہے۔“

”ہائے اللہ تمہیں کس نے بتایا۔“ فائقہ کے لمحے کا لہجہ دیکھنے لائق تھا۔

”کل شام میں چائے بنانے کے لیے اٹھی تو گھر کی سے چاند کو دیکھ رہی تھی اور پتا نہیں کیا کیا بڑے جارہی تھی۔“

پھر اس کے بھی دودن بعد نمرہ میرے اوسان خطا کرنے کے لیے میرے سر پر سوار تھی۔

”یاریہ ماہم عجیب سی نہیں ہے کافی بلکہ مجھے تو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہے۔“

”کیوں بھی بتاؤ۔“ مجھے فطری طور پر تجسس ہوا تھا۔

”یاد رکھ رات کو میں تہجد کے لیے اٹھی تو کارڈور میں چکر لگا رہی تھی بال کھلے ہوئے تھے اور خود سے باتیں کر رہی

تھی اچانک اس کی مجھ پر نظر پڑی یار میں تو ڈر رہی تھی یہ نہیں کیسی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا میرا تو واپس کمرے

میں جا کر سردرد ہونا شروع ہو گیا۔“ اور میں نے خشکیاں نگاہوں سے نمرہ کو دیکھا جواب بھی ظہر کی نماز پڑھ کر میرے

کمرے میں آئی تھی۔ ایک جھرجھری لے کر میں حال میں واپس آئی۔

مجھے تین دن نہیں آ رہی تھی مگر میں زارا اور ارم کی طرح ہر شے سے بے خبر ہو کر سونا چاہتی تھی۔

.....☆☆.....

پھر اگلے ہی دن اتفاقاً میں نے اسے پتیل کے درخت کے نیچے نصب سنگی بیچ پر بیٹھ دیکھا اس کے ہاتھ میں پلاسٹک

انٹومی کی کتاب تھی۔

ویسے جب بھی وہ کلاس میں نہ ہوتی تو عمومی طور پر اسی بیڑ تلے بیٹھی نظر آتی۔

اور آج جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ پڑھ نہیں رہی تھی اس کے لب بل رہے تھے مگر اس کا مخاطب کون تھا

میں سمجھ نہ سکی میں دزدید نظروں سے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگی اور میرا دل دھک رہ گیا تھا یہ جان کر وہ اصل میں

اس بیڑ سے مجھ کو تنگ دیکھتی اس کی نظر ایک شاخ پر پڑی اور چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آرہے تھے۔ کیا وہ نفسیاتی تھی؟

میں زارا ارم کو بتانے کی غرض سے ڈیپارٹمنٹ کے اندر چلی گئی جہاں وہ مجھ سے پہلے میری منتظر تھیں یہ خبر سنانے

کے لیے کہ ایچ او ڈی تو کانفرنس کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہی ہیں سو چار چھٹیاں پھر سے قسمت پوڑی (بڈیا) کی

طرح ہمیں مل گئیں۔

اور زارا وغیرہ پھر سے مجھے یاد دہانی کرنا نہ بھولیں کہ میں اپنے نکاح کی تصاویر بھی لیتی آؤں میرے بے حد اصرار

پر امی چاروں کو بلانے کے لیے رضامند ہو گئی مگر صدمہ کہ نمرہ کو انہی دنوں شوخ پورہ اپنے کزن کی شادی کی تقریب

میں جانا تھا اور فائقہ کی بڑی بہن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی سو ظاہر ہے مصروفیت کے باعث وہ نہ آ سکی۔

.....☆☆.....

اس بار میں گھر گئی تو ماہم کے حوالے سے ساری بات امی کو بتائی پہلے تو وہ ڈر گئیں اور مجھے اس لڑکی سے دور رہنے کی

تاکید کی مگر جب میں نے انہیں بات کا دوسرا رخ دکھانا چاہا تو وہ تا صبر استغفار کرنے لگیں بلکہ مجھ سے بھی اس بات

پر اصرار کیا کہ میں ماہم سے بات کروں یعنی اس سے پوچھوں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے نفسیاتی، روحانی یا وہ کسی اور

ایثار میلٹی کا شکار ہے۔

مجھے امی کی بات درست لگی تھی کسی حد تک مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ خود پر چڑھا ایک خول نما میرے سامنے کیسے اتار دیتی۔

ایسا کیسے ممکن تھا مگر کبھی کبھی جو ہم سوچنا بھی نہیں چاہتے وہ ہو جاتا ہے اور پھر طوعاً کرہاً ہم اس کو قبول بھی کرتے ہیں

ایچ او ڈی اسلام آباد سے آچکی تھیں اور میں اپنے گھر سے۔

میں اپنے کمرے میں ٹولس دہرا رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی میرا خیال تھا کہ زارا ہوگی کیونکہ آج اسے پہنچنا تھا جبکہ فائدہ ارم اور نمرہ کوکل آتا تھا۔

مگر ایک بار پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ماہم کو میں نے دو سالوں میں پہلی بار اپنے کمرے کے باہر کھڑا دیکھا۔

”اندر آسکتی ہوں۔“ وہ شستہ انداز میں گویا ہوئی۔

”ہاں بالکل۔“ وہ منتظر تھی اور مجھے شرمندگی ہوئی۔

”میں جانتی ہوں کہ تم جان گئی ہو اور مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں مگر تمہیں دوسروں سے ڈسکس کرنے کی زحمت سے بچانے کے لیے ہی میں خود یہاں آئی ہوں۔“

”میری کہانی سنو گی۔“ مجھے وقت لگا اس کی بات سمجھنے میں اور ایک بار پھر مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ چاہنے کے باوجود میں تا حال اپنی دوستوں میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ڈسکس نہ کر سکی تھی مگر پھر بھی نجانے وہ کس اذیت سے گزرتی رہی تھی اتنے دنوں سے مجھے ڈر بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ اسی رات کی بابت تو خاص طور پر بات نہیں کر رہی جب میں نے اسے ریگتے دیکھا تھا۔

یہی تھا وہ اس بات سے بھی باخبر ہو گئی تھی کہ کلاس اور ہوٹل میں اب اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں ہونے لگی ہیں۔

میں نے اس روز اسے قریب سے دیکھا تھا وہ اچھی خاصی جاذبِ نظر تھی اس کے کمرے پر کچھ ادھر تک آتے پال گھنٹا جنگلی توہینیں مگر قدرے بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ سیاہ اور ملائم ضرورت سے مناسب قد لیے وہ ضرورت سے زیادہ دلی تھی۔

”ہاں اگر تم سنا نا چاہو تو۔“ بے اختیار میرے لبوں سے پھسلا تھا۔

اور اس دن میں نے جانا کہ وہ ہمچن سے ہوائی چیز کے حصار میں تھی۔

اس کا تعلق کھاتے پیتے مگر بوسیدہ رسم و رواج پر یقین رکھنے اور چلنے والے خاندان سے تھا۔

اس کی والدہ نے جب وہ آٹھ برس کی تھی اسے آبائی گھر میں لگے شیم کے پیڑ کے نیچے بٹھایا تھا اور وہیں سے کوئی باہری مخلوق اس پر سوار ہو گئی تھی اسے ہفتے میں دو دن لازماً دورے پڑتے تھے اور ان دنوں وہ اپنے آپ سے بالکل لاپرواہ ہو کر خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھی اس کے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں آتی تھیں ایسے میں اس کے بہن بھائی خوف زدہ رہنے لگے تھے علاج معالجے سے بھی کچھ خاص افادہ نہیں ہو پا رہا تھا لہذا کسی حیر بابا کے ہی کہنے پر اسے آبائی علاقہ سے دور تعلیم کی غرض سے شہر سے باہر بھیج دیا گیا۔

پہلے انٹر اس نے پرائیوٹ کالج سے کیا پھر گریجویشن کے لیے وہ اپنے والدین کی توجہ اور نظروں سے مزید دور ہو گئی یعنی یونیورسٹی میں آ گئی۔

اس کی کہانی میں کتنی سچائی اور کتنی کھٹائی تھی میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی کہانی میں کوئی نیا بن نہ تھا یہ بالکل ایسی ہی تھی جیسی مجھ سمیت آپ سب نے بھی اپنی وادی نانی پھپھو یا خالہ امی سے سن رکھی ہوگی اس کی والدین نے ڈاکٹری علاج پر صرف اور صرف روحانی علاج کو ترجیح دی مجھے تو یہ شیم حکیم خطرہ جان والا معاملہ محسوس ہوا تھا مگر مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا تھا اس سے پہلے تک جو ڈر اور ہچکچاہٹ میں اس سے محسوس کر رہی تھی اب دل چاہا تھا کہ اس سے پوچھوں وہ کیا ٹیل کرتی ہے کیا ویسا ہی جیسا بابا بھی کہتے ہیں یا اس کے برعکس کوئی بات اندر ہی اندر اسے بے چین کرتی ہے آپ کو شاید عجیب لگے مگر اس روز اس کے کمرے سے جانے کے بعد میرے دل میں جمعہ جاگی کہ میں اس کی سائیکا ٹرسٹ بن جاؤں۔

اس کے بقول بابا جی نے اسے چاند کی چودہ پندرہ تاریخ کو گھر سے باہر نہ نکلنے کی تنبیہ کی تھی مگر ہاسٹل میں ہونے کی وجہ سے وہ ان کے حکم کی پابندی نہ کر سکی۔

اور وہ بھی ہاسٹل میں رہتے ہوئے چاند کی پہلی سے لے کر آخری تاریخ تک وقت کی پرواہ کیے بغیر گھر سے باہر نکلتی تھی مگر اسے بھی دورے یا شاید ٹیکس نہیں ہوتے تھے لیکن شاید یہ اس کے اپنے ذہن کی اختراع بن چکی تھی کہ چاند کی مخصوص تاریخوں میں اسے ہوش و حواس سے بے گانہ ہونا ہی ہے۔ نادانستہ طور پر ہی کبھی گھر سے دیوانوں کی طرح درختوں کے سائے تلے بیٹھنا ہی ہے اور جمجھولی شاخوں سے لٹکتی روح سے بات کرتی ہی ہے وہ بلاشبہ اپنی اس حالت کی ذمہ دار نہ تھی مگر وہ اپنی ایسی حالت کی عادی ضرور ہو گئی تھی اور اسے اسی طرح رہنے سے سکون ملتا تھا۔

اور حیرت کی بات تھی کہ اس کی اس بے ترتیبی اور بے ضابطگی سے پر زندگی میں بھی ایک لڑکے کی گنجائش تھی۔

اور یہی تو وہ موڑ تھا جو اس کی کہانی کو دلچسپ بناتا تھا۔

ماہم کے بقول افضال ملک اس کے محلے کا لڑکا تھا وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی ماہم کی زبانی ہی مجھے معلوم ہوا وہ بھی اس کا دیوانہ ہے۔

مگر مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اگر کوئی چیز اس پر عاشق تھی تو وہ ماہم کو کسی اور مرد سے کیسے بات کر لینے دیتی تھی۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اکثر وہ دم کا ہوا پانی یا جلائے ہوئے سفوف پانی کے ساتھ لینا بھول جاتی ہے مگر اسے ان کے کھانے یا نہ لینے سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

مجھے وہ اپنا رمل گئی تھی مگر آسیب زدہ نہیں۔

مجھے وہ دوسروں اور تنہائی کے زہر کی ڈبی ہوئی لگتی تھی۔ جیسی اس نے پونی سے باہر کسی بالکل انجان لڑکے سے دوستی کر رکھی تھی نہ جانے وہ اس سے بات کب کرتی تھی کیونکہ میں نے اور دیگر لڑکیوں نے اسے بھی موبائل میں غرق تو نہیں پایا تھا۔

خیر مجھے اس سے بے حد ہمدردی ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا اسے کسی ماہر نفسیات کو دکھانے کا مگر اس نے مجھے واسطے دے کر منع کیا تھا کہ وہ کسی نفسیاتی طبیب کے پاس نہیں جانا چاہتی اگر میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں تو وہ اسی طرح کر سکتی ہوں کہ یونی فیلوز اور ہاسٹل میٹس کا دھیان اس پر سے ہٹاؤں اور خود بھی اسے آئندہ شامی نظروں نے نہ دیکھوں۔

اور میں نے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔

زارا وغیرہ میری عقل پر ماتم کرتی رہ گئیں کہ میں کیوں برائے مرض کے لیے سر درد کی دوا اٹھانا چاہ رہی ہوں۔

مگر میں انہیں زیادہ مداخلت نہ کرنے دیتی۔ یار اس کے گھر میں کوئی اس کی پرواہ کرنے والا نہیں اس کی روم میٹ بھی لا پرواہی ہے اگر میں اس کے کام آسکتی ہوں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات کیا ہوگی۔

☆☆☆☆

مگر میں نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی نیکی واقعی گلے پڑ جاتی ہے۔

اب میرا زیادہ تر وقت اس کے ساتھ ہی گزرنے لگا تھا۔

میری موجودگی میں اس کی طبیعت خراب نہیں ہوتی تھی بلکہ ان تین ہفتوں میں، میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ اب اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ رہنے لگی ہے اور وہ کھنٹی کھنٹی سی اور بھی بھی لال انگارے آنکھوں کا دورانیہ بھی قدرے کم ہو گیا ہے۔

”کیا دم کر کے پھونک رہی ہو منہجا۔ ماہم تو بڑی خوش اخلاق ہو گئی ہے جب سے تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔“ زارا نے داہنی آنکھ دبا لی۔

Google

”کچھ لوگوں کے قریب جا کر ان کی عادتوں کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے برے ہیں نہیں جتنا ہم نے ان کو سمجھ رکھا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”لو کر لوگل۔“ وہ جواباً میرا مذاق اڑانے لگیں بہر حال میں مطمئن تھی اور ماہم جیسے واقعی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ ویسے اس کا یا پلٹ پر میں بھی حیران تھی کہ میں نے ایسا خاص تو کچھ بھی نہیں کیا تو پھر ایک ایسا رمل فطرت والی لڑکی میں اتنی واضح تبدیلی کیسے۔

”یعنی اسے واقعی ہی تنہائی مارتی تھی۔“

میں نے خود ہی اپنی حیرت کا جواب دھونڈ لیا۔

پھر گرمیوں کی چٹھیاں آ گئیں اور سب ہو سلاٹس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔

عمار کا فون آیا تھا وہ مجھ سے شادی کی تاریخ کے بارے پوچھ رہے تھے انہیں شادی کی جلدی تھی اور مجھے اپنے گریجویٹیشن کی ان کو مشکل سے مزید بڑھنے سے کے لئے ٹالا (حالانکہ اس موضوع پر بار بار بحث چھڑتی تھی ابھی) فون بند کر کے میں جیسے ہی کاؤچ سے اٹھی مجھے یکدم زور کا چکر آیا ”شاید آج کھانے میں دیر ہو گئی اس لیے۔“ کہہ کر میں باورچی خانے میں چلی گئی۔

میں ماہم سے بھی رابطے میں تھی اس نے بتایا کہ اب وہ پیر بابا کہ پاس بھی زیادہ نہیں جاتی اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اب اس کے پاس آنے سے گھبراتے نہیں۔

مجھے سلی ہوئی کہ حالات بہتری کی طرف گامزن ہیں۔

اس دن خالہ لوگ آئے تھے میری عیدی لے کر کھانے پکانے سے فراغت کے بعد میں نے خالہ کا دیا ہوا سوٹ انہی کے کہنے پر پہن پر چیک کیا انہوں نے بے اختیار میری بلائیں لیں پھر واپسی کا قصد کرنے لگیں تو امی نے چائے کے لیے روک لیا۔

میں نے جھٹ پٹ کرک چائے کا کپ تیار کیا اور ان کے سامنے لے گئی مگر نجانے کیا ہوا انہیں چائے کی پیالی تھماتے ہوئے میرے ہاتھ جو لڑتا شروع ہوئے تو ان کے آگے بڑھ کر تھام لینے تک نہر کے اس روز میں نے بہت عجیب محسوس کیا ایسی بے اختیاری پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔

لیکن انسان کے اختیار میں تو ویسے بھی کچھ نہیں اور جو اختیارات ہیں بھی وہ امانت ہیں ملکیت نہیں اگر جو ہم سمجھ جائیں تو۔

اور پھر نجانے کیا ہونے لگا کہ مجھے بیٹھے بیٹھے چکر آنے لگتے

کبھی محسوس ہوتا جیسے کوئی میرے سر کے بال مچھ رہا ہو۔

☆☆☆.....

وہ ایک تنگ و تاریک جہاز اطراف گئے جنگلوں سے گھری سڑک تھی جس پر میں دوڑتی جا رہی تھی بھاگتے بھاگتے میں ایک سڑنگ کے قریب پہنچ گئی میں واپس جانا چاہتی تھی مگر واپسی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا میری سانسیں پھول رہی تھیں اور جسم پسینے میں تر تھا لاشعور کی طور پر قدم آگے کو بڑھتے گئے اور پھر کچھ لمحے گزر جانے کے بعد میں یکدم تنگی سڑنگ کے اندر دم مری روکھی ہوئی تھی اور مجھے ایک دیوار پر بڑا سا افضال نام لکھا نظر آیا۔

پھر اس نام پر سے ایک بڑا سایہ گزرتا میرے قریب بڑھنے لگا۔

وہ کون تھا کس کا سایہ تھا۔

اور افضال۔

مرغ کی بانگ سے میری آنکھ کھلی تھی میری پیشانی پسینے سے تر تھی اور دل کی دھڑکن تیز تھی۔

یہ کیا خواب تھا اپنے حواس بمشکل بحال کر کے میں وضو کے لئے غسل خانے چلی گئی۔
پھر اسی روز عمار کا خون آیا تو اس کے تشویش بھرے لہجے نے مجھے پریشان کر دیا۔
”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“
”جی..... ہاں کیا ہوا؟“

”نہیں تصویروں میں کافی کمزور لگ رہی ہو انٹی بھی بتا رہی تھی کہ پچھلے دنوں بخار رہا اور تم نے مجھے بھی نہیں بتایا۔“
لہجے میں عجیب سی دھونس تھی۔

نجانے اب آپ کو کس بات پر اعتراض ہے میری طبیعت کے ناساز ہونے پر یا آپ کو مطلع نہ کیے جانے پر جیسے
آپ کو بتا دینے سے میں نے چٹکیوں میں پھنسی ہو جانا تھا میں یہ صرف جی میں ہی کہہ سکی۔
اودھو آپ کے پریشان ہونے کے خیال سے ہی نہیں بتایا بلکی سی حرارت ہوئی تھی۔
اور جہاں تک بات ہے کمزوری کی تو آپ کو پتا ہی ہے رات گئے تک تھیمز لکھنا کوئی آسان کام تو نہیں۔“ آخری
فقرہ میں نے شرارتا کہا۔

اف یہ مردانہ نا اُبھی تا۔
پھر میں نے دانستہ طور پر گفتگو کا رخ سیاست کی طرف موڑ لیا۔

.....☆☆.....

”اچھا تو مس منہا اب آپ بتائیے ان تمام ہونے والے واقعات میں ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو
احساس دلایا کہ آپ کو ایک سائیکا ٹرسٹ کی ضرورت ہے۔“
میں خاموشی سے مسز معین کا چہرہ دیکھنے لگی چالیس کے پٹے میں داخل ہوتی جدید طرز کا قہری پٹس پہنے آنکھوں پر
کالے فریم کا چشمہ لگائے ادھ کھلے بال پشت پر پھیلائے اور آف وائٹ شیفون کا ڈو پیٹڈ راسا سر پر لگائے وہ جدید صبح
قطع کی خاتون لگتی تھی صبح چہرے پر متناسب بین نقش اسے بہت پروقار بنا رہے تھے ٹھنڈے کمرے کی تزئین و آرائش
بھی بہت شاندار تھی سفید پیٹنڈ اور سرمئی رنگ کا فرنیچر میرے سامنے کی دیوار پر قائد اور اقبال کی متاثر کن تصاویر
آویزاں تھیں جبکہ دائیں دیوار پر چاروں خلفائے راشدین کے کارنامے چیدہ چیدہ نکات کی صورت میں جملی حروف میں
فریم کے اندر کندہ تھے اس کی میز پر قرآن پاک اس کی تفسیر والی دو جلدیں تھیں جیسٹلر باکس کا ڈبہ، بیچ، ضروری فائلز
اور کھڑی موجود تھی۔

”مس منہا آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھے سب بتا چکی ہیں۔“
”سب کچھ؟“

انہوں نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تو میں چونکی اور اس کرشل ٹائم پٹس پر سے نظریں ہٹائیں جس کے اندر ذرہ ذرہ
اکھٹی ہوئی نیلی ریت چٹان کا سا اثر دے رہی تھی۔
مسز معین کا انداز ایسا تھا کہ میں اپنی جگہ چور بن گئی۔
اور یہاں معاملہ بھی تو میرے نسوانی وقار کا تھا کم از کم مجھے ایسے ہی محسوس ہوتا تھا مگر اپنے مسئلے کے حل کے لئے ان
کو آگاہ کرنا بھی ناگزیر تھا۔

”اس رات میں جلدی ہو گئی تھی نیند میں بے چینی تو میں ایک ہفتے سے محسوس کر رہی تھی مگر اس وقت ذہن یہ کھچاؤ
ضرورت سے زیادہ تھا مجھے اپنا دم سے تھما شاکھٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا کسی چیز کے چھن جانے کا خوف نجانے کیوں یکدم
حاوی ہونے لگا جس کو روکنے کے لیے میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی اور جب میں نیند سے جاگی تو میری آنکھوں
سے آنسو رواں تھے میں نے اٹھ کر خود کو سامنے لگے قد آدم آئینے میں دیکھا اور میں ٹھٹک گئی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے

دیکھ کر چہرے پر چھائی مردنی دیکھ کر اور خود کو لاغر محسوس کر کے۔

شاید خواب کا اثر ہے ایک گلاس پانی پی کر میں دوبارہ بستر پہ چلی گئی اس دن کے بعد سے میرے اندر ہڑپڑاپن آ گیا تھا نہ میں گھر والوں سے ٹھیک سے بات کرتی اور نہ عمار سے جیٹ کرنے کا جی چاہتا۔
یونہی بوجھل بے رنگ سے دن گزرتے گئے جب ایک دن ایپا نے مجھے ایک دن چاہا۔
”کیا ہو گیا ہے تم کو تمہاری ساس اندر بیٹی شادی کی باتیں کر رہی ہے اور تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ مجھے کونے میں لے جا کر کہتی ہے پکڑ کر مجھے ڈیٹے لگی۔

”کیا کہہ رہی ہو مجھے کوئی شادی نہیں کرنی۔“ نجائے کیسے چیخنے والے انداز میں بے ساختہ میں نے کہا۔
”شش سن لیں گی وہ۔“ اس نے تنبیہ کی مگر جب کہ ساس صاحبہ نے واقعی سن لیا تھا اگلے دن ہی عمار مجھ سے ٹھکرو کر رہے تھے ”تم نے امی سے کیا کہا کہ تمہیں شادی نہیں کرنی۔“
”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔“ میں نے فوراً تردید کی۔

”تو کیا امی جھوٹ بول رہی ہیں کیا تمہارے لیے سب مذاق ہے۔“
وہ نجائے کیوں اتنا جھڑک رہے تھے میری بات سمجھے بغیر۔
”اچھا سوری..... بابا میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے تھک کر کہا۔
”تو پھر سچاؤ اپنا مطلب۔“

”جب اب کے تھے ہوئے حواس بحال ہو گئے تب کبچے گا بات اللہ حافظ۔“ میں نے بھی کھٹ سے فون بند کر دیا۔

اور پھر اس دن کے بعد جیسے مجھے خوف آنے لگا خود سے یکدم میں اپنا موازنہ ماہم سے کرنے لگی کہیں بے خبری میں بھی نفسیاتی نہ ہو جاؤں۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور نئے سسٹر کا آغاز ہونے والا تھا۔
مگر میں نے سوچ لیا کہ مجھے کیسے خود کو اس ٹینشن سے نکالنا ہے چلتے چلتے لڑکھڑا جانا سوتے سوتے ڈر جانا خوشی میں رو پڑنا اور محفل میں بیزار ہو جانا یہ سب میرے اندر میرے لیے نیا اور ابتلازل تھا میں نے انٹرنیٹ پہ سائیکالوجسٹ کے بارے میں تحقیق کی تو تحشیہ من میں روحانی ماہر نفسیات کا ہاتھ بھی آنے لگا۔
”پھر کیا تھا چینیوں کے بعد پیپرز سے فراغت پا کر میں نے تفصیل سے آپ کے بیج پر جا کر یونیورسٹی اور ریٹیکو چیک کی اور آج یہاں موجود ہوں۔

اب کی بات میں نے من و عن ان کو ساری تفصیلات بتادی تھیں۔
یہ بھی کہ چھٹیوں کے بعد ہاسٹل آ کر میں نے سب سے پہلے جس کو دیکھنا چاہا وہ ماہم تھی پہلے سے بھی زیادہ مطمئن اور شاد اس نے مجھے بتایا تھا کہ افضال اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا ہے میں اپنے حال سے بے خبر اس کے بارے میں جان کر خوش ہوئی تھی۔

مسز معین نے ماہم کے بارے میں مجھ سے تمام معلومات لی تھی اور مجھے اگلے جمعہ کو آنے کا کہا تھا انہوں نے کچھ دھٹا ف بھی بتائے تھے جنہیں باقاعدہ اور باادب طریقے سے کرنے کی بھی تلقین کی۔
اور ایک ہفتے کے مبر آزمان انتظار کے بعد ایک بار پھر میں مسز معین کے کلینک میں گئی۔
ان کے پرفیشنل لہجے میں کئے گئے انکشافات مجھے اندر سے کھوکھلا کر گئے تھے۔
”ماہم نامی وہ لڑکی اپنے اور چھائے آسیب کو تم پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔
وہ افضال ملک جو آسیب کی طرح اس پر عاشق تھا۔

وہ جو اسے چاند کی مخصوص راتوں میں اس سے بات کرنے کے لئے بے چین رہتا تھا اسے چاند کی چاندنی میں نظر آتا تھا۔

اور جوں میں کسی بھی گھنے درخت کی شاخ پر بیٹھا اس کا منتظر ہوتا تھا۔
وہ عاشق مزاج آسیب جو کوئی اور نہیں انضال ہی ہے اب تمہارے پیچھے ہے۔
انہوں نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دی تھی اور دونوں ہاتھ آپس میں پیوست کیے دھیمے لہجے میں مجھے آگاہ کر رہی تھیں۔
”مگر وہ تو خود بھی اس سے محبت کرتی تھی۔“ میرا لہجہ کزور تھا۔

دیکھو کچھ باتیں ہیں جو تمہیں سمجھنی ہے گو کہ یہ تمہارے لئے مشکل ہو گا مگر تمہیں اس مسئلے سے نکالنے کے یہ باتیں ہی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔“ انہوں نے پانی کا گلاس میرے آگے کیا۔
”اس نے تمہیں بتایا کہ اس پر کسی چیز سے سایہ آگیا اس کے والدین اس طریقہ سے اس کا علاج نہ کروا سکے جس طرح کے توجہ طلب علاج کی مایہم کی حالت متقاضی تھی اپنے آپ کو جھنجھٹ سے بچانے اور دوسرے بچوں کو اس کے سائے سے متاثر ہونے سے بچانے کے لیے انہوں نے صرف ایک ناخواندہ سے پیر بابا پر ہی انکشاف کیا پھر سونے پر سہاگہ کر اسے اپنی نظروں سے مزید دور بھیج دیا جہاں وہ آسیب کے زیر اثر کیا کچھ کرنی پھرے انہیں کوئی پرواہ نہیں یقیناً اس کی بتائی گئی کہانی سچی ہو سکتی ہے اور تم نے جو اس کی کیفیات دیکھیں اور محسوس کی وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں۔
کیونکہ میں تمہیں سب سے حیران کن بات بتاؤں تو احساس کتری والدین کی عدم توجہ نے مایہم کو اتنا ضدی اور مستقم مزاج بنادیا کہ اس نے اس آسیمی روح کو اپنے اندر سے نکلنے نہیں دیا اس کا بچپن میں کوئی دوست نہیں رہا بھی وہ آج تک نہیں جان پائی کہ ہم جنس اور ہم عمر سے بے تکلف کیسے ہوا چاتا ہے لہذا وہ وظائف اور ادویہ جو اس پیر بابا نے اسے دی تھیں اور جو پرہیز اس نے بتائے وہ سب باطل آکر اس نے چھوڑ دیے انضال نامی آسیب اس پر حاوی ہو گیا اور اس کو مایہم نے اپنا دوست بنا لیا اپنی تنہائیوں کا سامھی۔

حالانکہ وہ چاہتی تو اس سب سے کافی حد تک چھٹکارا وہ عرصہ پہلے ہی پا چکی ہوتی لیکن پرابلم وہی کہ اس کو اس تکلیف سے نکالنے کے لئے اس کا اپنا کوئی مددگار نہ بنا اور یوں یہ آسیمی یا عوحانی کہہ لو سکتے سے زیادہ اب نفسیات کا مسئلہ بن گیا۔

مگر آخر کب تک۔
کب تک وہ اپنے ساتھ یہ تماشا بھی لگائے رکھتی جب دیکھدار ہوئی خصوصاً پونیورسٹی میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ اب ارد گرد کے لوگوں کے لیے وہ مذاق بن کر رہ گئی ہے لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے ہیں تو وہ اپنی حالت سے آپ ہی بیزار ہونے لگی۔

اسے پھر سے اذیت سے دوچار ہونا پڑا اور انضال ملک سے چڑھنے لگی وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی مگر کیسے۔
سارے اذکار اور پرہیز تو وہ بھول چکی تھی۔
پھر ایسے میں تم اسے نظر آئی اس نے تمہیں اپنی نظروں کے حصار میں رکھا اپنے عاشق کی توجہ تمہاری طرف منتقل کرائی اور خود آزاد ہو گئی اور جانتی ہو انسانوں کی طرح بدنیت روحوں کے بھی مختلف مزاج و انداز ہوا کرتے ہیں انضال ملک ایک رنگین مزاج آسیب ہے اور انفسوس کہ چند دن میں مایہم کو چھوڑ کر وہ تمہاری خوبصورتی کا دیوانہ ہو گیا۔
”اف۔“ میرا دماغ حقیقتاً مایوس ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی ہم جو دیکھتے ہیں ہمارا دماغ وہ سمجھ نہیں رہا ہوتا جب اس سے دیکھنے اور سمجھنے کا کلش ہوتا ہے تو حقیقت دھندلا جاتی ہے اور انسان نا اُسکی میں اپنے اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔

اسی لئے کہتے کہ کچھ چھڑے اسنے ہی پرانے ہوتے ہیں کہ ان میں ٹانگ نہ اڑانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

آخر میں وہ مسکراتے ہوئے ہلکے ہلکے انداز میں مجھے سمجھانے لگیں۔

لیکن اس تکلیف دہ واقعے سے تم نے بہت کچھ سیکھا تمہاری نیت صاف تھی ریوارڈ تو تمہیں اللہ کی بارگاہ سے ہی ملے گا۔

اب زیادہ پریشان نہیں ہونا بلکہ کس کرو اور خود کو کمزور مت بننے دو تمہیں ان شاء اللہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

وہ ماہر روحانی نفسیات تھی یعنی کلینکل سائیکولوجی کے علاوہ کچھ خاص روحانی علوم میں بھی ماہر تھیں وہ جس نے مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔

کہ کس طرح سے وہ خود غرض اور بیک وقت قابلِ رحم لڑکی مجھے نشانہ بنانے چلی تھی انہوں نے مجھے اس سے دور

رہنے کی خاص تاکید کی سوانہی سے مشورہ کر کے میں نے جلد ہی اپنے علاقے کے کیسپس میں مائیکریشن کروالی۔

میری شادی التوا میں بڑی گئی تھی اور زندگی کی ناؤ ہلکولے لئے گئی تھی۔

میرے جانے کا سن کر ماہم نے کسی افسوس یا خوشی کا اظہار نہیں کیا بس مجھ سے گلے لگی تھی اور میری گال پر بوسہ دیا۔

میرے دل کی دھڑکن پھر سے بھتر تپ ہوئی تھی۔

دوسری جانب عمار مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔

اور میں خود سے بزار۔

مگر میں نے اپنی تعلیم کو متاثر نہ ہونے دیا۔

مسز معین کے بتائے گئے اذکار سے مجھے دیر دیر سے مجھے دیر سے افاتہ ہو رہا تھا کچھ میں نے اپنے طور پر بھی اللہ کی قربت

حاصل کرنے کی کوشش کی۔

پھر جس دن میرے فاضل سسٹمز کا آخری سیمپر تھا تو دل کو دہلا دینے والی خبر مجھے ملی۔

ماہم کورات کے آخری پہر کی نے اس کے واش روم میں مردہ حالت میں دیکھا تھا۔

میں نے حساب لگایا کہ کل چاند کی چودھویں تھی۔

مجھے کچھ اندازہ ہو گیا کہ خود پر جبر کرنے کی صورت اس کے ذہن میں شدید کھنچاؤ پڑ گیا ہوگا۔

مگر مسز معین نے مجھے مزید تفصیل سے آگاہ کیا۔

”تم سے مایوس ہو کر افضال نامی آسیب نے پہلے سے زیادہ شدید وار کے تھے ماہم پر۔“

وہ جو پہلے خیال اور دوستی کا حاضر تھا دونوں کے بیچ اب وہ یکطرفہ (افضال کی جانب سے) نفرت اور انتقام میں بدل

گیا تھا جس کا نتیجہ ماہم کی موت کی صورت سامنے آیا۔

میرے چہرے کی رنگت زرد پڑنے لگی مجھے حقیقتاً افسوس ہوا تھا اس کے انجام کا سن کر۔

”مگر تم پریشان مت ہو مصلح! یہ اللہ کا تم پر خاص کرم رہا کہ تم نے وقت پر اپنی حالت کا اندازہ لگالیا اور کسی بھی قسم کی

سنگین صورتحال سے بچ گئی۔“

”اب یہ اتنا کی دیوار ختم کرو، عمار کو فون کرو اور اسے بتاؤ کہ تمہارا بی ایس مکمل ہو گیا ہے۔ انہوں نے میز پر دھرے

میرے ہاتھ کی پشت پر اپنا پر شفقت ہاتھ رکھا اور آخر میں شرارتیاد دہانی کرائی۔

وہ واقعی میری میچائیں میں تہہ دل سے ان کی مشکور ہوئی۔

مگر واپسی کے سفر کے دوران میری سوچوں کے دہانے ان سوالوں پر جا کر کھل رہے تھے کہ

کیا والدین کا ایسا رویہ قابلِ قبول ہے جو شہرت اور پیسے کے چکر میں اپنی اولاد سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں اور اچھے

مستقبل کے خواب دیکھتے دیکھتے ان کی بری قابلِ رحم صحت سے بھجوتے بھی کر لیتے ہیں۔

اور آخر میں ایک زندگی کے جان سے جانے کے کسی حد تک ذمہ دار بھی بن جاتے ہیں۔

ابن صفی کے کردار (عابی خان)

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہولی

اسرار احمد ناری المعروف ابن صفی برصغیر کے واحد ادیب ہیں، جن کے کرداروں نے سیکڑوں لوگوں کو ادیب بنادیا۔ پاکستان میں جتنا ان کے کرداروں پر لکھا گیا شاید ہی کسی ادیب کے کرداروں پر ہاتھ صاف کیا گیا ہو۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ایسا ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا مگر کسی نے اتنی اخلاقی جرأت اور ظرف کا مظاہرہ نہیں کیا کہ اپنی کتاب میں ہی ان کا شکریہ ادا کیا ہو۔ محترم ابن صفی کا ظرف ہے کہ انہوں نے اپنے کسی بھی نقال کی بھی مذمت نہ کی نہ کبھی ان پر کاپی رائٹ کے تحت مقدمہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نقال خود ہی اپنی موت آپ مر گئے۔ انہیں عوام میں کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ 1980ء میں ان کی رحلت کے بعد سے نہ صرف پاکستان بلکہ پڑوسی ملک بھارت میں ان پر بہت کچھ لکھا گیا بلکہ آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ حضرت علامہ اقبال اور غالب کے بعد محترم ابن صفی واحد ادیب ہیں جن پر لاتعداد اساتذہ اور طالب علموں نے مقالے لکھے۔ نئے افق جو محترم ابن صفی کا لگایا ہوا پودا ہے، کو یہ اعزاز حاصل ہے جو ان کے حوالے سے لکھی جانے والی ہر تحریر کو اپنے صفحات کی زینت بنانا فخر محسوس کرتا ہے۔ ہم دی گریٹ ابن صفی فینز کلب کے شکرگزار ہیں جنہوں نے ابن صفی صاحب پر لکھے جانے والے مضامین شائع کرنے کی اجازت دی۔

محترم عابی خان نے جس محنت شاقہ سے ابن صفی کے کرداروں پر لکھا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے آپ کو محسوس نہیں ہوگا کہ آپ ابن صفی کا کوئی ناول پڑھ رہے ہیں۔

فریدی اور حمید کا حلیہ

تقریباً دو گھنٹے بعد انسپکٹر فریدی بھی اپنے اسٹنٹ سارجنٹ حمید کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ انسپکٹر فریدی میں تیس سال کا ایک قوی ہیکل جوان تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی کے نیچے دو بڑی بڑی خواب آلود آنکھیں اس کی ذہانت اور تدبیر کی آئینہ دار تھیں۔ اس کے لباس کے رکھ رکھاؤ اور تازہ شیوے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک با اصول اور لائق مندا دی ہے۔ سارجنٹ حمید کے خدو خال میں قدرے زنانہ پن کی جھلک تھی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے جا ناز برداریوں اور اپنے حسن کی نمائش کا عادی ہے۔ اس نے کوئی بہت ہی تیز خوشبو والا سینٹ لگا رکھا تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ بلا کا ذہین تھا۔

اسی ذہانت کی بنا پر انسپکٹر فریدی کے تعلقات اس سے دوستانہ تھے۔ دونوں کی آپس کی گفتگو سے افسری یا ماتحتی کا پتہ لگانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

جاسوسی دنیا نمبر 1 دلیمر مجرم

”انور“ اور ”شیدہ“

انور اپنے فلیٹ کے ایک کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک آرام کرسی میں دھنسا ہوا تھا..... ایک ہیر

سامنے والی میز پر تھا اور دوسرا پھلی ہوئی ٹانگ پر، ٹانگی کی کرہ ڈھیلی ہو کر جھول گئی تھی۔ فلیٹ ہیٹ پیشانی پر بھی اور بکھرے ہوئے بال بھونڈوں پر لہرا رہے تھے۔ اس نے آج صبح بھی شیونیں کیا تھا اس لئے سرخ و سپید رخساروں پر ہلکی ہلکی ہنسی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

وہ ایک بے پروا اور اکھڑو جوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک وکیل کی حیثیت سے شروع کی تھی لیکن کچھ دن بعد سب کچھ چھوڑ کر اس راستے پر آ نکلا تھا۔ اسے دراصل کارناموں سے بھرا تھا۔ پچھلی زندگی قطعی ناخوشگوار گزری تھی اس لئے وہ ماضی کے دھندلوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے اور کہاں تھے بھی یا نہیں وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔

رشیدہ اسی اخبار کے دفتر میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ نہ جانے کیوں انور کے اس قدر قریب تھی۔ ان دونوں کے فلیٹ بھی برابر واقع تھے۔ صرف درمیان میں ایک دیوار تھی۔ رشیدہ بھی اس کی طرح دنیا میں تنہا تھی۔ اس نے اپنے متعلق اسے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انور نے بھی کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ان دونوں میں دو چیزیں مشترک تھیں۔ پہلی تو یہ کہ دونوں اس وسیع دنیا میں تنہا تھے، دوسری یہ کہ دونوں کا رونا ہے پسند کرتے تھے۔ دونوں دلیرتھے۔ دونوں کو پرانے سماں سے نفرت تھی۔ متوسط طبقے کی صاف ستھری لیکن گھناؤنی زندگی نا پسند تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے۔ رشیدہ نے کئی کارناموں میں انور کا ساتھ دیا تھا۔

انور کے کردار میں یہ عجیب و غریب بات تھی کہ وہ کسی کو معاف کرنا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا فلسفہ حیات انتقام تھا۔ اس کا قول تھا کہ زندگی کا انحصار صرف انتقام پر ہے۔ نظام فطرت کی اصل بنیاد انتقام ہی ہے، جسے دنیا والوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں۔

وہ بہت زیادہ دُور اندیش کا قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کا مقابلہ صرف حاضر دماغی سے کیا جاسکتا ہے۔ منطقی دلائل اور دُور اندیشی قطعی فضول چیزیں ہیں۔ دُور اندیشی غلط راستے پر بھی لے جاسکتی ہے کیونکہ دُور اندیشی کا تعلق مستقبل سے ہے اور مستقبل اندھیرے میں کم ہے۔ منطقی دلائل میں تفہیم کی بنیادی غلطی کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں لہذا جب بنیادی غلطی ہوگی تو اس کے لئے دلائل اور جواز کے لئے سارے مارنا دیوانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی نظریے کے تحت وہ ذہن کی ایسی تربیت کا حامی تھا جو انسان کو پیش آنے والے حادثات سے بجا طور پر نجات دلا سکے۔ اس تربیت کو اس نے حاضر دماغی کا نام دے رکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ شخص جو حاضر دماغ نہ ہو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ اس طرح زندہ رہتا ہے جیسے تپ دق کا مریض ناکارہ اور بے کار۔ اس کے خیال کے مطابق پوری دنیا عظیم الشان مقابلہ تھی جس میں انسان آگے بھی بڑھ سکتا ہے اور دوڑنے والوں کے پیروں تلے روندنا بھی جاسکتا ہے۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 13 ہیرے کی کان
جاسوسی دنیا ناول نمبر 14 تجوری کا گیت

”انور“..... خاندانی پس منظر

”ہونہہ.....!“ انور طغیہ انداز میں مسکرایا۔ ”تم میرے متعلق کیا جانتے ہو؟“ ”سنو کے“ البرو نو نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا تو سنو! تم نواب وجاہت علی خان کے لڑکے ہو۔“
انور بے اختیار اُچھل پڑا۔ وہ آنکھیں مچاڑ مچاڑ کر البرو نو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”تمہارے چچا شاہت علی خان نے تمہیں اپنے بھائی کی ناجائز اولاد ثابت کر کے ان کے ترکے سے محروم کر دیا حالانکہ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تمہاری

ماں ان کی بیوی تھی۔“
 ”تم کیسے جانتے ہو.....“ انور مضطربانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ ”بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ.....“ البر ونو ہاتھ اٹھا کر بولا۔
 ”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا یہ حادثہ تمہیں غلط راستوں پر نکال لے گیا۔ تمہاری نظروں میں یہ عظیم کائنات اور اس میں متحرک زندگی محض ایک ڈھکوسلا اور بے معنی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“
 ”مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔“ انور ہونٹ سکود کر بولا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 17 بھیا نک جزیرہ

”رشیدہ“..... خاندانی پس منظر

”اور رشیدہ کے متعلق سننے کے بعد تمہیں اپنے آپ پر یقین نہیں آئے گا۔“ البر ونو مسکرا کر بولا۔
 ”لیکن جس طرح میں نے تمہارے متعلق بتایا ہے اسی طرح رشیدہ کے متعلق بھی بتا سکتا ہوں۔“
 انور اسے استفہامی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ البر ونو نے رک کر سگریٹ سلگایا اور تین کش لینے کے بعد کہا۔
 ”رشیدہ ایک غیر معروف جزیرے کی شہزادی ہے۔“
 انور کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”اب تم مجھے پریوں کے دیس کی کہانی سناؤ گے اور مجھے اپنی نانی اماں یاد آ جائیں گی اور پھر کہانی کے اختتام پر کہہ دینا کہ اس کے بعد آکھ مل گئی۔“ انور نے پھر قہقہہ لگایا۔ البر ونو کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”سی نور، البر ونو کا بیان صحیح ہے۔“ ڈی گاریکا آہستہ سے بولا۔
 ”تم لوگ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”تم یہاں کوئی بہت ہی خوفناک جرم کرنا چاہتے ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی جرموں نے ہمیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہا تھا۔“
 ”بیٹھ جاؤ.....“ البر ونو تھکسا نہ لہجے میں بولا۔ انور غیر ارادی طور پر بیٹھ گیا۔
 ”تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔“ البر ونو نے کہا۔ ”اگر میں تمہیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تو کل رات ہی ہٹا دیتا۔ تم میری نظروں میں ایک طفل کتب سے زیادہ نہیں ہو۔“

”البر ونو ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ انور کا سر چکرانے لگا اور پھر دفعتاً اسے یاد آ گیا کہ رشیدہ اپنے کسی راز کو چھپانے کے لئے داراب کے قتل پر کمر بستہ ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی واقعہ نہ رہا ہو گا لیکن اگر سچ سچ وہ کسی ملک کی شہزادی تھی تو ایک معمولی عورت کی طرح کیوں زندگی بسر کر رہی تھی اور پھر سب سے حیرت انگیز بات یہ بھی کہ وہ سو فیصدی ہندوستانی معلوم ہوتی تھی۔ پھر وہ کسی غیر ملک کی شہزادی کیسے ہو سکتی ہے۔“
 ”کیا سوچنے لگے۔“ البر ونو اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

”میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ میرا دماغ بے کار ہوتا جا رہا ہے۔“ انور نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”سب کچھ سمجھ سکتے ہو بشرطیکہ دوسروں پر اعتماد کرنا سیکھو۔“ انور بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”تمہیں محض اس لئے حیرت ہے کہ تم اس جزیرے کے عجیب و غریب رسم و رواج سے واقف نہیں ہو۔“ البر ونو نے کہا۔ ”وہاں کے تاج و تخت کا حقدار پچھپن ہی سے وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے ملک میں رکھا جاتا ہے اور سن بلوغ کے پہنچنے پر پھرویں واپس چلا جاتا ہے اور حکمران کے مرنے کے بعد عثمان حکومت خود سنبھالتا ہے۔ اگر حکمران ولی عہد کی کم سن میں ہی مر جائے تو اس کا قریبی عزیز اس کے بالغ ہونے تک امور سلطنت انجام دیتا ہے اور رد و ملی یا رشیدہ اپنے

باپ کی پہلی اولاد ہونے کی حیثیت سے تخت کی حقدار تھی اس لئے اسے جزیرے سے ہٹایا گیا اسی دوران میں اس کا باپ حادثے کا شکار ہو کر مر گیا لہذا رشیدہ کا چچا عارضی طور پر حکومت کرنے لگا۔ رشیدہ کو سیکسکوم میں رکھا گیا تھا۔ ایک دن اچانک اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ڈی گاریکا اس کا اتالیق تھا۔ اسی نے کسی طرح پتہ لگالیا کہ رشیدہ کا چچا اسے ختم کر کے خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تخت کا مالک بننا چاہتا ہے لہذا اس نے دُوراندیشی سے کام لے کر یہ خبر مشہور کرادی کہ رشیدہ کو کسی نے مار ڈالا اور پھر اسے لے کر ادھر ادھر کی خاک چھانٹا رہا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ خیال آیا کہ رشیدہ صرف ہندوستان میں محفوظ رہ سکتی ہے لہذا تم یہ خود سوچ سکتے ہو کہ جس بچے کی پرورش ہندوستانی ماحول میں ہوئی ہو، وہ سو فیصد ہندوستانی ہی ہوگی۔ ڈی گاریکا ان اس کی پرورش بالکل ہندوستانی طریقے پر کروائی۔ رشیدہ اپنی اصلیت سے اچھی طرح واقف تھی لہذا فطری طور پر کسی ایک ایسے دی کی اسے تلاش ہوئی جو اس کی حفاظت کر سکے۔ اس کے لئے اس نے نہیں منتخب کیا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 17 بھیا تک جزیرہ

”قاسم“ اور ”مسز قاسم“

قاسم کا باپ خان بہادر عاصم شہر کے بہت بڑے سرمایہ داروں میں سے تھا اور قاسم اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔ خان ولا میں صرف قاسم اور اس کی بیوی رہتے تھے اور ان کی ازدواجی زندگی بڑی سچ گزر رہی تھی اور اس سچی کی بنیاد پہلے ہی دن سے پڑی تھی، وہ بھی قاسم کی حماقت کی بناء پر۔ وہ اپنے دوستوں میں گرائڈیل احمق کے نام سے مشہور تھا۔ لوگوں کا خیال تھا اس کے جسم کی نشوونما کے سلسلے میں بیماری عقل غذائی رہی تھی اور آخر میں جسم ہی جسم رہ گیا، عقل صاف ہو گئی۔

قاسم رضا ایسا تھا جو اپنے ذلیل و ذول کے لحاظ سے پوری پارٹی میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ بس وہ ایسا ہی تھا کہ اس کے ملنے والے ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اسے ایک مینار نما گنبد سمجھیں یا گنبد نما مینار۔ سارجنٹ حمید نے اس کے متعلق صرف ایک جملہ اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا کہ قاسم شاید عروج بن صق کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

بہر حال قاسم کی انتہائی درجہ لسانی اور چوڑائی دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ بقول حمید چونکہ اس کی کھوپڑی سطح سمندر سے بہت اونچی تھی اس لئے وہاں سال بھر برف بھی رہتی تھی۔

قاسم لڑنے بھڑنے میں سب سے آگے ہی رہتا تھا۔ وہ اپنے ذلیل و ذول کی مناسبت سے اتنا ہی طاقتور بھی تھا اور یہ بات محض سنی سنائی نہیں تھی۔ خود حمید کو بھی ایک بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ قاسم نے اس کی موجودگی میں ایک آدمی کو اس کی موٹر سائیکل سمیت سڑک کے داہنے کنارے سے اٹھا کر بائیں کنارے پر رکھ دیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں وہ حمید کا اتنا گرویدہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اسے غصہ بڑی جلدی آ جاتا تھا لیکن وہ حمید کی تلخ سے تلخ بات کا بھی برائیاں مانتا تھا۔ ویسے وہ اگر حمید پر اپنی ایک ٹانگ بھی رکھ دیتا تو اس کی پسیاں برابر ہو جاتیں۔

وہ اچانک خاموش ہو گیا کیونکہ اس کی بیوی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے ناشتے کی ٹرالی تھی۔ وہ حمید کو دیکھ کر بڑے دلاؤ ویز انداز میں مسکرائی۔ وہ حقیقتاً ایک پیاری سی گڑیا تھی۔ وہلی پتلی تازک اندام اور کافی خوب صورت بھی۔ قاسم اور اس کا جوڑ دراصل پہاڑ اور گہری کانپوند تھا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 33 برف کے بھوت

جاسوسی دنیا ناول نمبر 37 جنگل کی آگ

پراسرار ”جمیلہ“ کے کردار کی کچھ جھلکیاں

دفعتا اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ داہنی طرف کے لمحوۃ کرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک انتہائی حسین لڑکی شب خوامی کے لبادے میں لمبوس کھڑی انہیں غمناک انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر انیس یا بیس سے کسی طرح زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فریدی کھڑا ہو گیا۔

”میں تم لوگوں کے لئے مغنوم ہوں۔“ لڑکی نے لمبوس آواز میں کہا۔

”کوئی ایسی بات نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ہمارے دُغم معمولی ہیں۔ البتہ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔“

”تم میں سے فرقوں کا بیٹا اور سر کون ہے؟“ لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ فریدی اور حمید گھبرا کر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے تھیر آ میز لہجے میں کہا۔

”اوہ شاید تمہیں غموں نے بالکل کر دیا ہے۔ تم دونوں زخمی ہو لیکن گھبراؤ نہیں۔ زور فورس..... میرا زور فورس تمہارے لئے لڑ رہا ہے۔ وہ تمہارے دشمنوں کو شکست دے کر ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ مجھے دیکھو..... میں خود یہاں اسیر ہوں لیکن مجھے امید ہے ایک دن زور فورس مجھے اس قید سے رہائی دلانے گا۔ کئی دنوں سے میرے کچھ سپاہی یہاں آتے ہیں، وہ موقع کی تلاش میں ہیں۔ کب دن یہاں شب خون ضرور ماریں گے۔“

”مختصر یہ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

فریدی کی توجہ کامرکز زیادہ تر مبھلی لڑکی جیلہ بنی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حد درجہ چڑچڑی ہے ہونٹ سکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ابروؤں کے درمیان ایک ابھری ہوئی شکن تھی جو اس کے حیکمے مزاج کی غمازی کر رہی تھی۔ ابروؤں میں ایک خاص قسم کا تناؤ تھا جس کا خوش مزاجی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن فریدی سوچ میں پڑ گیا۔ پچھلی رات کو تو اس کے چہرے کے خطوط بڑے دل آویز معلوم ہو رہے تھے۔ اب اور حسین ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی نشہ انگیز تھر تھر اهٹ تھی۔ ماتھے پر وہ بد نما سلوٹ بھی نہیں تھی۔ ابروؤں میں عینے پن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

بارک میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بعد میں حمید نے دیکھا کہ وہ ایک مشعل کی روشنی تھی۔ جیلہ اپنے ہاتھوں میں مشعل اٹھائے اور بایاں ہاتھ سینے پر رکھے بتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ دونوں ڈانٹا کے بت کے قرب و جوار میں آگئی ہوئی ماسکی کی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ اس وقت جیلہ سچ بچ اب سے ہزاروں برس پہلے کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ٹخنوں تک لپٹا ہوا ڈھیلا لبادہ اس وقت جدید طرز کا سلپیگ گاؤں نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک سرکش سی لٹ چہرے کے سامنے لہرا رہی تھی اور مشعل کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح مہک رہا تھا۔

پانچ منٹ گزر گئے لیکن فریدی واپس نہ آیا۔ حمید اکتا کر برآمدے میں نکل جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اس بار کسی دوسری عورت نے اسے مخاطب کیا۔ وہ بوکھلا کر مڑا۔ صولت مرزا کی دوسری پراسرار لڑکی جیلہ ہستہا ہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے سارے جسم میں منسنی دوڑ گئی۔ جیلہ عادت کے مطابق اس وقت بھی اپنی تکیہ سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ”نف..... فرمائیے۔“ حمید ایک قدم پیچھے ہٹا ہوا بولا۔ ”جلے جاؤ..... تم دونوں یہاں سے جلے جاؤ۔“ وہ ڈرامائی انداز سے تیز قسم کی سرکوتی میں بولی۔ اس کی آنکھیں حد درجہ خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ ہونٹ بچنے ہوئے تھے اور ماتھے کی سلوٹیں اور زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ ”سچ..... جلے..... جائیں گے..... بب..... بیل..... بالکل جلے جائیں گے۔“ حمید پیچھے کھسکا ہوا بولا۔ وہ چند لمحے کھڑی اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی اور حمید بوکھلا کر برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اپنے

محمد حسین المعروف ”حکیم ارسلانوس“

ڈرائنگ روم میں اسے ایک قطعی غیر دلچسپ آدمی دکھائی دیا، جو ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھا ادبگہ رہا تھا۔ بھورے رنگ کی گھونگھریالی داڑھی اور سر پر بالوں کا ایک بے ہنگم سا گچھا تھا۔ وہ بھی کچھ اس قسم کا کہ بھوکا گائیں اسے خشک گھاس سمجھ کر بے خیالی میں اس پر ایک آدھ بار منہ ضرور مار سکتی تھیں۔ ان کی آہٹ پر وہ چونکا اور نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر پھر اونگھنے لگا۔

”آپ نے کیا نام بتایا تھا ان کا.....“ فریدی نے پوچھا۔ صولت مرزا ہنسنے لگا۔ ”نام تو محمد حسین ہے لیکن یہ خود کو حکیم ارسلانوس کہلاتے ہیں۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”یونانی علوم کے مطالعے نے ان کا دماغ الٹ دیا۔ خاص طور پر فلسفہ ان کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ تھیلو سے لے کر ارسطو تک شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو جس کے کارناموں کا انہوں نے عمیق مطالعہ نہ کیا ہو۔ کیوں نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا ہے۔“

فریدی کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔ بگل کی پے درپے آوازوں کے ساتھ ہی کسی بچے کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ دونوں گھبرا کر برآمدے میں نکل آئے۔ ارسلانوس جاوید کو اپنی گرفت میں جکڑ کر اس کے کان سے بگل لگائے پھونکوں پر پھونکیں مار رہا تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے اسے چھڑایا اور صولت مرزا نے جاوید کو بھرپور چائنا سید کیا۔ وہ روتا ہوا اندر بھاگ گیا۔

”آپ بھی بچوں کے ساتھ بیٹے بن جاتے ہیں۔“ صولت مرزا کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔
میں بولا۔ ”آپ کے گال پر۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر نواب صاحب نے بچے کو مارا ہے۔“
”غصہ تو مجھ پآ یا تھا۔“ ارسلانوس بولا۔ ”لہذا وہ چھڑ دراصل میرے ہی گال پر پڑا ہے۔“
صولت مرزا اندر چلا گیا۔ ارسلانوس کے گرد فریدی کے دوست اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے خصوصاً سارا جنٹ حمید ارسلانوس کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں صاحب کیا میں تمہارے ہوں۔“ ارسلانوس انہیں مخاطب کر کے بولا۔
”جی ہاں۔“ حمید بخیدگی سے بولا۔ ”اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس تمہارے کے پیچے کون وصول کرے گا۔“
”کیا بکواس ہے۔“ ارسلانوس بھنا کر بولا۔ ”قسم ہے اللہ کی..... اگر اس قبے کے ہوتے تو ناطقہ بند کر دیتا۔“
”حمید کیا یہودی ہے۔“ فریدی نے اسے ڈانٹا۔ پھر حکیم ارسلانوس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”حکیم صاحب میں آپ کے رتبے سے واقف ہوں۔ ملک میں کوئی آپ کی ٹکر کا نہیں۔ میں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔“
”واللہ تم مومن ہو۔“ ارسلانوس پر جوش انداز میں اس کا شانہ ٹھیکتا ہوا بولا۔
”اور میرے لئے کیا ارشاد ہوتا ہے جناب۔“ حمید اگے بڑھ کر بولا۔

”ذجال.....“
”تو بس ایمان لے آئیے مجھ پر۔“ حمید نے بخیدگی سے کہا۔ ”ورنہ آ رہے سے چروا کرو بارہ زندہ کر دوں گا۔“
”قسم ہے اللہ کی بھیجا بھڑا دوں گا۔“ ارسلانوس اس کی طرف لپکا لیکن فریدی بیچ میں آ گیا۔ ”جانے بھی دیجئے حکیم صاحب..... بچوں کو معاف کر دیتے ہیں۔“

فریدی اور حمید ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس میں ایک کافی بلند صدر دروازہ تھا اور دروازے

کے اوپر بنے ہوئے سائبان میں ابا بیلوں کے کھولے لٹک رہے تھے جن میں شور مچائی ہوئی ابا بیلیں کھس رہی تھیں۔ شام کی ہلکی نیلگوں سیاہی میں یہ عمارت کچھ پراسراری معلوم ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی باہر نکلا جو غائب ارسلانوس کا نوکر تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ چندھیائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ حمید کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چمکاؤ ڈھالے میں ہنکادی مچی ہو۔

اس نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اندر گھستے ہی ابا بیلوں کی بیٹ کی بدبو نے ان کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ تاکوں پر رومال رکھے دائیں سرے گزر کر صحن میں نکل آئے۔ صحن کا کافی وسیع تھا اور صحن کے گرد بنے ہوئے چبوتروں پر چاروں طرف بڑے بڑے کا یک رکھے ہوئے تھے، جن سے کبوتروں کی غوغاؤں غوغاؤں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کچھ کبوتر ابھی تک اوپر ہی بیٹھے اٹکھ رہے تھے اور کچھ اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے خانوں میں کھس رہے تھے۔ کچھ دیواروں پر تھے جنہیں ایک نوکر طرح طرح کی آوازیں نکال کر پیچھے بلارہا تھا۔ فریدی اور حمید کے ساتھ والے نوکر نے داہنی طرف کے والان کی سمت اشارہ کیا، جس کے اندر دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ارسلانوس ان کے غیر مقدم کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے ہلکے نارنجی رنگ کا فٹنوں تک لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ تیروں پر بڑے بالوں والی لومڑیوں کی کھال کے جوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے بڑے بڑے بالوں کے ڈھیر میں اپنے پیر گاڑ رکھے ہوں۔ اس وقت اس کے سر کے بالوں کا گلدستہ اوپر اٹھے ہونے کی بجائے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

”آؤ دیارہ!..... میں تو سمجھا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔“ حکیم ارسلانوس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ یا آپ کیوں سمجھتے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”بھئی بات یہ ہے کہ میرے پاس دکھاوے کا شاٹھ باٹھ نہیں ہے۔“

”تو آپ مجھے اتنا تنگ نظر سمجھتے ہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں نہیں..... تمہارا باپ بھی بڑا عالی ظرف تھا۔“ ارسلانوس نے کہا اور حمید کو گھورنے لگا۔

”یہ میرے عزیز ترین دوست مسٹر حمید ہیں۔“

”عزیز ترین! بھلا تم جیسے سنجیدہ آدمیوں کے ساتھ نالائقوں کا کیا کام.....“ حمید نے بھنا کر فریدی کا شانہ دیوچ

ایا۔

پھر چند لمحوں بعد وہ دروازہ کلباڑی کی ضربوں سے مل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اسے بھی توڑ گرایا اور ساتھ ہی اندر سے ایک فائر ہوا اور فریدی کا سامنی جیج کر پیچھے لڑھک گیا۔ بقیہ لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ فائرول کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

”ارسلانوس ریو اور پھینک دو۔“ فریدی نے جیج کر کہا۔

”نہیں..... ہرگز نہیں..... تخت میرا..... میرا ہے..... میرے جیسے جی کوئی نہیں لے سکتا۔“

وہ برابر فائر کرتا رہا اور ادھر سے بھی فائر ہوتے رہے۔ دفعتاً اندر جیج سنا دی۔

”ہو..... آف..... بانخ..... میرا ہے..... یہ میرا ہے..... کوئی نہیں لے سکتا۔“

”بانخ..... خانہ..... میرا بانخ.....!“

اندر سے گولی چلتی بند ہوئی تھی۔

فریدی نے اندر نارنج کی روشنی ڈالی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تخت عقب روشنی میں دمک رہا تھا اور اس میں جڑے ہوئے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ارسلانوس نے اسے اس طرح دیوچ رکھا تھا جیسے وہ انتہائی محبت سے کسی بچے کو پیار کر رہا ہو اور اس کے خون کی بوندیں تخت سے زمین پر رس رہی تھیں۔

گوئی اس کے سینے میں لگی ہوئی تھی۔

”میرا..... ہائے.....!“ وہ ایک بار پھر تڑپا اور زمین پر آ رہا۔ اس کا منہ پھیل گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے نکل پڑی تھیں۔

ارسلانوس کی لاش اٹھوائی گئی۔ نہ جانے کیوں اس کی موت کے بعد حید کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی موت کو وہ کافی عرصے تک نہ بھلا سکے گا۔ اس کے خیال کے مطابق ارسلانوس برا آدمی نہیں تھا۔ اسے اس بے پناہ دولت نے پاگل بنا دیا تھا۔

وہ ارسلانوس کی موت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ارسلانوس کی موت جسے شاید وہ کبھی نہ بھلا سکے۔ اس نے اس سے پہلے بھی سیکڑوں موتیں دیکھی تھیں مگر خود اس کی گولی کا نشانہ بنے تھے لیکن وہ کسی کی موت سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 21 شاہی نقارہ

ماہر علم الاجسام ”پروفیسر درانی“ اور اس کی بھولی بھالی بیٹی ”عامرہ درانی“

فریدی فی الحال کوئی اور کیس لینا نہیں چاہتا تھا لیکن اس عورت نے ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ کر دیا تھا کہ وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ یہ پروفیسر درانی کی شخصیت تھی۔ تعلیم یافتہ حلقوں میں اس کا نام بہت عزت سے لیا جاتا تھا لیکن دو چار ہی ایسے خوش قسمت رہے ہوں گے جنہوں نے اس کو دیکھا بھی ہو۔ وہ اپنی کوئی سے شاذ و نادر ہی نکلتا تھا اور وہ بھی بند گاڑی میں۔ اس سلسلے میں اس کے لئے کئی باتیں مشہور تھیں۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ اتنا بد صورت اور بے ہنگم ہے کہ پبلک کے سامنے آتے ہوئے شرماتا ہے۔ کچھ کا یہ خیال تھا کہ اسے دن میں کچھ بھائی ہی نہیں دیتا۔ زیادہ ذہین لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ایسا عجیب و غریب رو بہ اختیار کر کے اپنی شہرت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال وہ ہر اس شخص کے لئے متحہ تھا جو اس کے متعلق تھوڑا بہت بھی علم رکھتا تھا۔ ویسے سارے ملک میں اس کی ٹکر کا ایک بھی ماہر علم الاجسام نہیں تھا۔

انور چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر ابداری میں داخل ہو گیا۔ آخری سرے پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے اپنی پشت پر ایک سریلی آواز سنائی دی۔

”ٹھہر جائے۔“

انور چونک کر مڑا۔

اس سے کچھ فاصلے پر ایک دہلی پتلی اور خوب صورت سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی خوفزدہ ہرنی کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ چہرے پر ایک غم آلود اضطراب طاری تھا۔ انور دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

انور دروازے کو دھکا دے کر بے دھڑک اندر چلا گیا۔ ایک بڑی میز کے پیچھے اسے ایک عجیب الخلقت آدمی یا جانور کا سر دکھائی دیا۔ چہرے پر ڈاڑھی بھی سی اور اس ڈاڑھی کی موجودگی میں وہ سر کی اتارنے بھیسے کا سر معلوم ہو رہا تھا۔

”گڈ ایوننگ پروفیسر.....!“ انور قد رے جھک کر بولا۔

”انگریز کے بیٹے ہو؟“ ایک چٹکھاؤ سنائی دی۔

”احماء السلام علیکم.....!“

”وعلیکم السلام..... تم جھوٹے ہو..... میں نے پہلے کبھی تمہیں نہیں دیکھا..... بیٹھ جاؤ۔“

اس نے بڑی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ انور بیٹھ گیا۔

پروفیسر درانی ایک چکر کھانے والی کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ سر کی نسبت اس کا جسم بھی کافی پھیلاؤ رکھتا ہے۔

فریدی کافی دیر تک گھنٹی بجاتا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت سی بھولی بھالی لڑکی دکھائی دی، جس کے ایک ہاتھ میں کنگھا اور دونوں ہاتھ تیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

”پروفیسر کو باہر بھیج دیجئے۔“ فریدی اپنی فلت سیٹ اتارتا ہوا نرم لہجے میں بولا۔

”باہر.....!“ لڑکی اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”وہ کسی باہر نہیں آتے، تم لوگ چپ چاپ چلے جاؤ۔ آج مجھے پہلی بار موحل ہے کہ میں اپنے ڈیڑی کے بال سنوار سکوں۔“

”آپ ان سے کہئے کہ پولیس گھر کی تلاشی لیتا چاہتی ہے۔“

”وہ میری نہیں سنیں گے۔ آپ لوگ جا بیئے۔“

”جب پھر ہمیں مجبوراً..... زبردستی گھر میں گھسنا پڑے گا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ سوری دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر فیس کر بولی۔

”چلو میں تمہیں ڈیڑی سے ملاؤں..... اب وہ سب سے مل سکیں گے..... میرے ڈیڑی بہت اچھے آدمی ہیں.....“

آئیے۔“

”سیکرٹری کہاں ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔ ”پہنچیں۔“

وہ اس کے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔ پوری عمارت سنسان پڑی تھی۔ انہیں ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ کسی ویران مقبرے میں چل رہے ہوں۔ ان کے قدموں کی آوازیں اونچی چوٹ والے کمروں میں بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ لڑکی انہیں پروفیسر کے کمرے کے کمرے میں لگائی۔

اور جبران میں سے کئی اپنی پچھلی نذر روک سکے۔ پروفیسر نے چٹک پر چٹ پڑا تھا لیکن اس کی گردن کئی ہوتی تھی۔ خون بستر پر جم کر سیاہی ناک ہو چکا تھا۔ اس کے بال تفل سے پیچھے ہوئے تھے اور انہیں بڑے سلیقے سے سنوارا گیا تھا۔ شاید ڈاکوئی میں بھی گھسنا کیا گیا تھا۔

فریدی تھما میز نظر دوں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو! میرے ڈیڑی کہتے اچھے لگتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی اور حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا کلا گھونٹ رہا ہو۔ وہ سب کے سب پتے بے کھرے رہے۔

”میں سوچا کرتی تھی کہ ڈیڑی کے سر میں تیل ڈالوں، ان کے بال سنواروں، گھنٹوں ان کا سر سہلاؤں لیکن وہ مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بڑے غراب ہیں ڈیڑی۔“ اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے ڈیڑی سے روٹھ گئی ہو، پھر

فس کر بولی۔ ”مگر..... آج ڈیڑی نے کچھ نہیں کہا۔ میں ایک گھنٹے سے ان کا سر دبا رہی تھی۔ دیکھو۔ دیکھو.....

انہوں نے آج جنہیں بھی کچھ نہیں کہا۔ درندہ ملنے والوں کو مار بیٹھتے تھے۔ میرے ڈیڑی اچھے ہو گئے ہیں۔“ اس

نے بچوں کی طرح تالی بجائی اور جبکہ کر مردہ پروفیسر کی پیدائشی چوم لی۔

جنہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ رو پڑیں گے، چپ چاپ کمرے سے نکل گئے۔ ان میں حمید بھی تھا۔ وہ ایک

دوسرے خالی کمرے میں جا کر بے تحاشہ رونے لگا۔

اس کے ذہن کی تہ جانے کوئی گمراہ اچانک کھل گئی تھی۔

”یہ تمہارے ڈیڑی ہیں۔“ فریدی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

اس کے ذہن کی تہ جانے کوئی گمراہ اچانک کھل گئی تھی۔

”یہ تمہارے ڈیڑی ہیں۔“ فریدی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

اس کے ذہن کی تہ جانے کوئی گمراہ اچانک کھل گئی تھی۔

اس کے ذہن کی تہ جانے کوئی گمراہ اچانک کھل گئی تھی۔

اس کے ذہن کی تہ جانے کوئی گمراہ اچانک کھل گئی تھی۔

”ہاں..... ہاں..... تمہیں یقین کیوں نہیں آتا..... میں سمجھ گئی.....“ وہ بچوں کی طرح ہنس کر بولی۔ ”انہوں نے تمہیں مارا نہیں..... اس لئے تم انہیں ڈیڑی نہیں سمجھتے..... ڈیڑی اچھے ہو گئے..... اب وہ کسی سے جھگڑا نہیں کریں گے..... کسی کو نہیں ماریں گے..... میں ڈیڑی سے ڈرتی ہوں..... مگر انہوں نے مجھے کبھی نہیں مارا..... دیکھو دیکھو! آج ڈیڑی کے بال کتنے اچھے لگ رہے ہیں..... میرے ڈیڑی.....“ اس نے پھر لاش کی پیشانی چوم لی۔

”بی بی ہوش میں آؤ..... جلد لیٹ چکیا پاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں بے ہوش کب ہوں..... تمیز سے بات کرو..... کیا تم نہیں جانتے کہ میں عامرہ درانی ہوں.....“ اس نے کہا اور پروفیسر کے سر ہانے بیٹھ کر اس کی ڈاڑھی میں کنگھا کرنے لگی۔

فریدی باہر نکل آیا۔ وہ حمید کو تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اسے کمرے میں روتے دیکھا۔

”حمید!“ فریدی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے جلدی سے اُسو پونچھ ڈالے۔

”اس لڑکی کو گھر لے جاؤ..... مسز چوہدری کو فون کر کے بلا لیں۔“

حمید کی آنکھیں پھر جھپکیں۔

”مرد کے پہلو میں پتھر کا جگر ہونا چاہئے۔“ فریدی نے کہا اور پھر اسی کمرے میں چلا آیا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 25 خوفناک ہنگامہ

”دوسرا قتل“ کا عجیب و غریب کردار ”صغیر شاہد (ایک بٹا دو)“

ایک کار کیا وٹھ میں داخل ہوئی، حمید سمجھا شاید فریدی آ گیا۔ وہ نصیر کی طرف دھیان دیئے بغیر مڑا۔ کار فریدی کی نہیں تھی۔

ایک وجہ اور کافی تندرست جوان آدمی کا رے اتر رہا تھا۔ صورت حمید کے لئے بالکل نئی تھی۔ حمید نے نکواری ٹوک زمین پر ٹیک دی۔ دوسرا لمحہ یقیناً چوٹ کا دینے والا تھا۔ نہ صرف حمید بلکہ سارے نوکر حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک ہی شکل و صورت کے دو آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا لباس بھی یکساں تھا، قد میں بھی کوئی واضح فرق نظر نہیں آیا۔ پھر وہ دونوں ان کی طرف بڑھے، دونوں کے ہتھ برابر اٹھ رہے تھے۔ ان کی چال میں بھی اختلاف نہیں تھا۔

”آداب عرض.....!“ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ آواز میں فرق رہا بھی ہوتا ایسے موقع پر اس طرف دھیان دینے کا ہوش کسے رہتا ہے۔

”فرمائیے.....!“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”انپکٹر فریدی صاحب سے ملتا ہے۔“ دونوں نے بیک وقت کہا۔

”وہ اس وقت موجود نہیں۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ اس بار بھی وہ ایک ساتھ ہی بولے۔

حمید ایک لحظہ انہیں گھورتا رہا، پھر بولا۔

”آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“

”مذعاسکرے۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

”اسم شریف۔“

”صغیر شاہد۔“ دونوں نے کہا۔

”اور آپ کا؟“ حمید دوسرے سے مخاطب ہوا۔

”صغیر شاہد۔“ دونوں نے دہرایا۔

”یعنی آپ دونوں کا.....!“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”دو.....!“ دونوں متحیر ہو کر بولے۔ ”دو کون؟ میں تنہا ہوں! منجانب یہاں کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر فریدی

صاحب نے بھی دو ہی کہا تب تو مصیبت آ جائے گی۔“

اندر آ کر اس نے سارے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان سے آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں لوٹ آیا۔

دونوں ہم شکل ایک ہی انداز سے خاموش بیٹھے تھے۔

”نہیں آئے فریدی صاحب؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ حمید نے کہا۔ اس کے چہرے پر شرارت اور بے چینی کے طے جلاؤ نظر آرہے تھے۔

دفتر دونوں طرف کے دروازوں سے چار چار نوکر بڑا مدھونے اور ان دونوں پر ٹوٹ پڑے۔ تھوری جلد و جھد کے

بعد وہ ست بڑ گئے۔ ایک ایک کو چار چار نے پکڑ رکھا تھا۔

”اس بد میزبانی کا مطلب.....“ دونوں رک رک کر بولے۔

”ابھی بتا ہوں۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پھر ان دونوں کو الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔

”اب کیا خیال ہے۔“ حمید نے ایک کمرے کے باہر سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”آدھا صغیر شاہد۔“ اندر سے آواز آئی۔ ”صغیر شاہد ایک بٹا دو۔“

دونوں کمرے کے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اور یہ بات ناممکن تھی کہ ایک کی آواز دوسرے تک پہنچ سکے۔ حمید

نے دوسرے کمرے کے پاس آ کر بھی وہی سوال دوہرایا، لیکن جواب من و عن تھا، جو پہلے آدی سے ملا تھا۔

”اگر میں آدھے صغیر شاہد کو کوئی مار دوں تو.....“ حمید نے پوچھا۔

”دوسرا آدھا خود بخود مر جائے گا۔“ جواب ملا۔

حمید دوسرے کمرے کی طرف بڑھا لیکن انہی وہ درمیان ہی میں تھا کہ اس نے دو چیخیں سنیں۔ یہ دونوں انہی کمروں

سے بلند ہوئی تھیں۔ حمید نے جھپٹ کر دروازہ کھولا۔ ایک صغیر شاہد کمرے کے فرش پر چاروں خانے چٹ پڑا تھا۔ اس

کے دانت بیٹھ گئے تھے اور غشی کی ساری علامات موجود تھیں، پھر وہ بھاگ کر دوسرے کمرے کی طرف آیا۔ یہاں بھی

وہی حال تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر بے ہوش پڑے تھے۔ حمید نے انہیں اٹھوا کر پھر یکجا کر دیا اور وہ اس طرح ہوش

میں آ گئے جیسے بجلی کا کرنٹ لگتے ہی کوئی شیشن چل پڑے۔ وہ چند لمحے سراسیمگی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر اس

طرح اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے انہیں کچھ دیر قبل کی کوئی بات یاد نہ ہو۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 26 دہر اقل

”بے گناہ مجرم“ کا بے گناہ مجرم ”پرویز“

وہ تین سال سے پرویز کے ساتھ تھا اور اس عرصے میں اس نے اسے ایک بار بھی ہتھ تو کیا، مسکراتے ہوئے بھی

نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا آقا دنیا کا عجیب ترین آدمی تھا۔ دنیا کا عجیب ترین جوان، جوانمائی خوب

صورت ہونے کے باوجود بھی اپنی شخصیت کو خاک میں ملا رہا تھا۔ جو دولت مند ہونے کے باوجود بھی دولت کی طرف

سے قطعی بے رواد تھا۔ رانو نے آج تک اس کے کسی دوست کو نہیں دیکھا تھا، اس سے کبھی کوئی ملنے کے لئے نہیں آیا تھا

اور نہ وہ خود ہی کہیں باہر جاتا تھا۔ اس کا وقت یا تو اس عمارت کے کمروں میں گزرتا یا پھر پائیں باغ میں۔

رانو کو اس کی ہر عادت غیر معمولی معلوم ہوتی تھی اور ہر مشغلہ انتہائی خوفناک، وہ اکثر اوقات پائیں باغ میں جال لگا کر ننھے ننھے پرندے پکڑتا۔ پھر ان میں سے نروں کو اڑاتا لیکن مادہ پرندوں کو ایسی ایسی اذیتیں دے کر مارتا کہ رانو کے رونکنے کھڑے ہو جاتے۔ وہ ان کے پر نوج کر نہیں ایسی جگہ ڈال دیتا جہاں چوئیاں بکثرت ہوتیں۔ پھر وہ گوشت کے ان کوٹھڑوں کی اذیت اتنی محویت سے دیکھتا جیسے اس کی روح نور کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو۔

تیلیوں کو پکڑ کر ان کے پر گوند سے چکا دیتا اور پھر ان کے ننھے ننھے پروں کو ایک ایک کر کے بلڈے سے کاٹتا۔ درختوں پر دوڑتی گھبرایوں پر چاقو سے نشانہ لگاتا اور نوکیلے پھل والے چاقو ان کے جسموں سے گزر کر شاخوں میں پیوست ہو جاتے اور وہ اسی طرح پھنسی ہوئی پٹیر پھڑائی اور گر بناک آوازیں نکالتی رہتیں۔

رانو بھی اس سے نفرت کرتا اور بھی اسے اس پر رحم آنے لگتا۔ رحم اس وقت آتا جب وہ اسے یونہی بلا وجہ بچوں کی طرح چھوٹ چھوٹ کر روٹے دیکھتا۔

اس کمرے کے دروازے میں ایک بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا، جس کے کھلنے اور بند ہونے کا انحصار ہندسوں کی ترتیب پر تھا اور وہ ترتیب پرویز کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم تھی۔ دروازے کے سارے رخنے بند کر دیئے گئے تھے، اس لئے باہر سے اندر کا حال دیکھنا ناممکن تھا۔

پرویز کا معمول تھا کہ وہ ہر رات کھانا کھانے کے بعد اس کمرے میں ضرور جاتا تھا۔ سارے نوکر لڑنے لگتے تھے۔ کمرے کے اندر سے ”شراب شراب“ کی آوازیں آتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کسی پر کوڑے برسا رہا ہو۔ پھر کسی عورت کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد پرویز باہر نکل کر کمرے کو قفل کر دیتا۔ اس کے چہرے پر ایسی بھیمت طاری ہوتی کہ نوکر اس سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

جاسوی دُنیا ناول نمبر 28 بے گناہ مجرم

ایک طاقتور ولن ”جابر“

”وہ ایک بہت بھیاںک آدمی ہے۔ ایک خطرناک بوڑھا جو ہمیشہ اپنا چہرہ نقاب سے چھپائے رہتا ہے اور شاید صرف میں ہی یہ جانتی ہوں کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے اتفاقاً بے نقاب دیکھ لیا تھا..... آف میرے خدا کتنا بھیاںک چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر ناک کی جگہ پر ایک بڑا غار ہے..... اس غار سے اس کا طلق تک دکھائی دیتا ہے۔“

”تعلیم کا غلط استعمال اور انسانی خواہشات کا اعتدال سے آگے بڑھنا کسی حد تک انسان کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال جابر کی گزشتہ زندگی کے واقعات ہیں۔ مجرموں کے کنبہ میں کھڑا ہوا یہ بیبت ناک اور بھیاںک شخص آکسفورڈ یونیورسٹی، لندن کا فلسفہ میں ڈگری یافتہ ہے اور جرمنی کے زیورچ کانگرس شعبہ سائنس کا ایم اے ہے۔ اچھے خاصے عرصے تک یہ پروفیسر بھی رہا ہے۔ اس کی ماں جرمن خاتون تھی اور باپ ہندوستانی۔ اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ حالات کی بد قسمتی کہ اس نے بچپن میں اپنے ہندوستانی ساتھیوں کے ہاتھوں کافی ذلت اٹھائی اور اس وقت سے اس کے دل میں ہندوستانیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ زمانہ شباب میں یہ لندن پہنچا، وہاں سے فلسفہ کی علمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ جرمنی گیا۔ وہاں سائنس کے تجربات اور نازیت کی بڑھتی ہوئی طاقت نے اس کا دماغ دوسرے راستوں پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر گوٹلو کے حکم جاسوسی میں رہ کر اپنا ہمیشہ بدلنے لگا واز تبدیل کرنے کا طریقہ سیکھا اور اس سلسلے میں خود بھی اس نے کچھ ایجادات کیں۔ لڑائی کے زمانے میں ایک تباہ کن گیس بناتے وقت اس کی ناک پر کچھ بمب آ گئی اور وہ گل گئی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”فریدی صاحب! کیا کانٹو اور آپ کی دانست میں محفوظ جگہ پر رکھی ہوئی کتابیں میں نے حاصل کر لی ہیں۔ کتابیں سمندر میں ڈوب گئیں لیکن نسخہ میرے پاس ہے۔ میں جو چاہتا ہوں، اسے حاصل کر لیتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے چہرے سے مصنوعی ناک اٹھائی۔

دہشت اور خوف سے غزال اور سیدہ کی چٹخیں نکل گئیں۔ بھیا تک چہرہ اور بھیا تک ہو گیا۔ جابر نے قہقہہ لگایا۔ اپنی ناک کے اندر سے اس نے کانڈکی بڑیا نکالی۔ ”یہ ہے وہ نسخہ فریدی صاحب..... میں اعضاء جسمانی کی ساخت کا ماہر ہوں۔ یہ ناک بڑی کارآمد ہے۔“ فریدی نسخہ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ ”مگر ٹھہریئے..... اس میں زہر ہے..... سونا حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ زہر ہی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اس نے وہ پڑیا منہ کے اندر رکھ لی۔ آدھا کینڈ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ تھوڑا کرگرا اور ناک اس کے ہاتھ سے فوراً پھوٹ گئی۔“

تھوری دیر کا ہنگامہ سکوت میں بدل گیا۔ جابر کی لاش سے شدت کی بو پھیل رہی تھی اور عجیب طرح کا نیلا پانی اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

کمرے میں گہرا سناٹا بالکورے لے رہا تھا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 7 خطرناک بوڑھا
جاسوسی دنیا ناول نمبر 8 فریدی اور لیونارڈ

”مسٹر کیو“..... ”ڈاکٹر نارنگ“

ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور ترین آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ دو ہرے بدن کا ایک لمبا ترنکا آدمی تھا۔ عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں رہی ہوگی لیکن صحت مند ہونے کی بنا پر یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں پر قدم رکھا چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اور دوران گفتگو اپنی نظریں مخاطب کے چہرے سے ہٹائے رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کو کبھی کسی سے کرخت آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا گیا۔ جھاڑیاں سنسان پڑی تھیں، البتہ لاش میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں چند لمبے ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر راجن کی طرف لوٹ آئے، جو بیٹھا ہوا چکا تھا۔ انہوں نے کار کا پچھلا حصہ کھول کر پیٹرول کے تین کنسترنکالے اور انہیں لاش پر خالی کرنے لگے۔

”نہ جانے کون تھا؟“ ناگر کے ساتھ والے نے کہا۔

”مسٹر کیو (Q) کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“

”مسٹر کیو؟“ دوسرا کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”آخر یہ مسٹر کیو ہے کون؟“

”کام کرو کام۔“ ناگر نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھی چھناک بھریسیہ نہ اتر جائے۔“

”یار میں تنگ آ گیا ہوں..... اس کام سے۔“ دوسرا بولا۔

”معلوم ہوتا ہے..... سچ بچ..... موت منڈلا رہی ہے تمہارے سر پر۔“

پیٹرول ڈال دینے کے بعد وہ لاش سے دور ہٹ گئے، پھر ناگر نے ایک دیاسلائی سلاک لاش کی طرف اچھال دی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں آگ ہی آگ تھی۔ واپسی پر انہیں کار میں ایک پرچہ ملا، جس پر تحریر تھا ”اپنے کام سے کام رکھو اور حکم کی تعمیل کرو مسٹر کیو کے بارے میں کچھ کہنا موت کو دعوت دینا ہے۔“

نارنگ قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے ٹھہرے میں بیٹھا تھا لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست نظر آ رہا تھا۔ چہرہ سرخ اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک نظر آ رہی تھی۔ جب وہ اپنا بیان دینے کے

لے کھڑا ہوا تو عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ پھر حلف دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کسی سوہوم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ ہی کہوں گا۔ البتہ میں جتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں کیونکہ خون ریزی ہی میرا مذہب ہے۔ لوگ میرے جرائم کا مقصد جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔ میں کہتا ہوں جو مقصد کی مذہب کا ہوسکا ہے، وہی میری خون ریزی کا بھی تھا۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے جبکہ میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں، لہٰذا میں اس لئے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرامی قرار دیا تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کی پچاسی کا منظر بھی عجیب تھا۔ جن لوگوں نے اسے اس وقت دیکھا، ان کا بیان ہے کہ وہ گوشت پوست کا آدمی تو ہی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا استحلال کی جگہ شگفتگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”پوچھنے سے کیا فائدہ، جبکہ پوری ہی نہ کی جاسکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موجود ہیں، انہیں بڑی بے دردی سے قتل کر دوں۔ آخری خواہش پوچھنے کا دھکوسٹ بھی عجیب ہے۔ اچھا خیر چلو..... اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حرامی نہیں ہے۔“ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کھڑا اس جتنے کو دیکھتا رہا، جسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک زہریلا سا تھقبہ لگایا اور بلا ٹکان پچاسی کے تختے پر چڑھ گیا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 29 لاشوں کا آبشار

جبر الہی شاستری

اسے دیکھا ایک عجیب وضع کا انگریز دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر پر بنارس کے چنڈو کی سی زرد رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ جبر الہی شاستری اس کا ساتھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر تنگ بھی لگا رکھا تھا اور چہرے پر وہی سی مصیبت تھی جیسی کوئم بدھ کے چھٹوں میں پائی جاتی ہے۔

اگر وہ حقیقتاً جبر الہی شاستری ہی تھا تو اس پر کسی قسم کا شبہ کرنا کہاں تک درست ہوگا۔ حمید نے اب تک صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ شہر کے حکیم باغہ طبقوں میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جس نے اس مشرق پرست انگریز کے حلق پکڑنا سنا ہو۔ وہ مسکرت کا بہت بڑا عالم اور خوش کاما تھا۔ ہمدونگے پر اس کی گہری نظر تھی۔ مسکرت اور ہمدونگے میں دیر سوجھ کر نے والے طلباء اس سے مدد لیا کرتے تھے۔ اس پر شبہ کرتے ہوئے چچکاہٹ کی وجہ اور بھی تھی..... اور وہ وجہ یہ تھی کہ وزیراعظم اس کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ حمید بڑی اطمینان میں پڑ گیا تھا۔

”جبر الہی شاستری آپ کیسی رائے رکھتے ہیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”وہ ہمیشہ میرے لئے پراسرار رہا ہے مگر اتنا نہیں کہ میں اسے کسی قسم کے جرائم سے متعلق سمجھوں۔“

”وہ ہے کیا بلا.....“

”اسے شرعی علوم خصوصاً مسکرت اور فلسفے سے مشق ہے۔ انگلستان کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ محض اکتاب علم کے شوق میں اس نے اپنا خاندانی اعزاز اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ کر مشرق کی راہ لی ورنہ وہ اس وقت لاہور ڈاکٹر جبر الہی شاستری ہوتا۔“

”اوہو..... تو کیا وہ لاہور ٹیکسن جبر الہی شاستری ہے۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”قطعاً۔“

تھوڑی دیر بعد جبر الہی شاستری میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر سفید سوٹ تھا اور سر پر وہی بناری وضع کی پگڑی تھی اور ماتھے پر تنگ بھی موجود تھا۔ جبر الہی شاستری کا چہرہ عجیب تھا۔ حمید کا نپ اٹھا۔ اس کے چہرے کے خدو خال اور آنکھوں میں ہم

آہٹکی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں چہرے سے بالکل بے لطف نظر آتی تھیں۔ خدوخال میں جیسے پن کی بجائے نرمی تھی لیکن آنکھیں..... ان میں تو کچھ نہیں تھا خالی خالی سی..... ویران آنکھیں..... جن میں چمک نہیں تھی لیکن پھر بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ شیشے کی ہیں اور ان کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک لحظے کے لئے وہ آنکھیں ان کے چہروں پر زکریاں اور پھر ہٹ کر بخود ان پر جم گئیں۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 37 جنگل کی آگ

اندھیرے کا شہنشاہ ”لوزانا“

اس وقت رات بھی تھی اور شاید دو بجے ہوں گے۔ شہر کی سب سے بارونق سڑک مکمل ویران تھی اور ایک اندھا فقیر فٹ پاتھ پر ایک عمارت کی دیوار سے ٹک لگائے بیٹھا اوگھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک روٹر انس کا اس کے قریب ہی آ کر رک گئی۔ اندھا چونک پڑا۔ چار آدمی با آہستگی کار سے اترے۔ وہ بے قدموں اندھے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن اندھا بھی اب بیٹھا نہیں رہا تھا۔ اس حال میں دیکھنے والے اسے اندھا نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ نہ صرف کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس پوزیشن میں تھا جیسے اسے کسی کے حملے کا انتظار ہو۔

”اس قسم کا کوئی آدمی کسی تنہا نہیں رہ سکتا، کیا وہ اندھا نہیں ہے۔“

”ہے تو..... لیکن آنکھ والوں سے بہتر وہ اپنی جانی بوجھی جگہوں پر کارٹیک ڈرائیو کر سکتا ہے۔“

”بے بی! وہ سوفیصد اندھا ہے لیکن اس کی کھال سانپ کی کھال سے بھی زیادہ حساس ہے۔ تم بے قدموں اس سے تیس گز کے فاصلے پر جاؤ..... اسے تمہاری موجودگی کا احساس ہوگا بلکہ وہ تمہاری جنس تک سے واقف ہوگا۔ وہ آواز پر نشانہ لگاتا ہے۔“

”تب میں اسے آدمی کے بجائے غیبی روح کہوں گی۔“

”لوزانا چند ماہ پیشتر کیپ ٹاؤن میں تھا۔“

”لوزانا کون؟“

”لوزانا..... وہ اندھا جنوبی افریقہ میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ حقیقتاً کہاں کا باشندہ ہے، یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ لیکن افریقہ کے ڈائے گا گا قبیلہ کا ایک دیوتا لوزانا کہلاتا ہے، جس کے معنی ہیں اندھیرے کا مالک۔“

طویل القامت اندھا لوزانا اپنی عجیب و غریب تفریح میں مشغول تھا۔ میز پر بہت سے چاقو بھرے ہوئے تھے اور کمرے کے ایک گوشے میں ایک آدمی بڑا سا تھیلا اٹھائے کھڑا تھا۔

”چلو.....“ اندھے نے کہا۔

گوشے میں کھڑے ہوئے آدمی نے تھیلے سے ایک موٹا سا چوہا نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ چوہے کے ایک پیر سے ننھا سا ہتھکڑ بندھا ہوا تھا۔ لوزانا نے میز سے چاقو اٹھایا اور چوہے نے آدھا کر دیا۔ چوہے کی طرح لوزانا کا جسم چھیدا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ چوہا چاقو سمیت اُچھلنے لگا۔

”کیوں.....؟“ لوزانا اس آدمی کی طرف مڑ کر بولا۔

”لوزانا..... سورج ہے عظیم لوزانا۔“ آدمی کا نپٹا ہوا بولا۔

”دوسرا.....!“ لوزانا نے کہا۔ اس نے دوسرا چوہا چھوڑا۔ لوزانا نے پھر چاقو پھینکا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ وہ ہتھکڑوں کی آواز پر نشانہ لگاتا تھا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 39 اندھیرے کا شہنشاہ سنگ ہی

یہ لیپٹن لوہر کا میر شکاری سنگ ہی تھا۔ ڈبلا پتلا اور پلے جسم کا آدمی۔ سلا دو غلے سم کا چینی تھا۔ اس کا باپ چینی تھا اور ماں منگول اور اکثر سنگ ہی بڑے فخر یہ انداز میں کہا کرتا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں سے اس کی پیدائش کے بعد بھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ خود کو اس انداز سے ”حرامی“ کہتا تھا جیسے وہ کسی شہنشاہ کا عطا کردہ کوئی بہت بڑا اعزاز ہو۔ بظاہر اس کا ڈبلا پتلا اور پلے جسم بالکل بے جان نظر آتا تھا لیکن اس کی شیطانی گرفت سے کچھ وہی لوگ واقف تھے جنہیں اس سے کم از کم ایک بار ہی لپٹ پڑنے کا موقع ملا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سنگ ہی ایک ہڈیوں دار جو تک ہے۔

”اس کا نام کیا ہے۔ میں نے شاید اسے پہلے پہل دیکھا ہے۔“

”سنگ ہی..... ایک جلاوطنی دوغلا چینی ہے اول نمبر کا سازشی اور مکار۔ موجودہ چینی حکومت کے خلاف اس نے ایک سازش کی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اسے جلاوطنی نصیب ہوئی۔“

”یہ لڑکا صورت ہی سے بے وقوف معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ چشمہ نہ لگائے تو شاید کچھ عقل مند معلوم ہو سکے۔“

”سنگ ہی دنیا میں صرف ایک ہی قسم کے آدمیوں سے ڈرتا ہے۔“

لوہر اسے گھورنے لگا۔ سنگ ہی چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔ ”صرف اُن آدمیوں سے، جن کے چہروں پر حماقت برتی ہے۔“

وہ فریدی سے کچھ دور کے فاصلے پر رُک گیا۔ فریدی نے جھلا کر فائر کیا۔ سنگ ہی بڑی پھرتی سے وار بچا گیا اور پھر ٹامی گن سے گولیاں اُٹنے لگیں لیکن سنگ ہی اسی جگہ کھڑے کھڑے اچھل کود کر اس طرح گولیاں خالی دے رہا تھا جیسے کوئی بندر کچھ شریچوں کے پتھر اڑے خود کو بچا رہا ہو۔

سنگ ہی پاگلوں کی طرح بڑے بڑے پتھروں کو پھلاتا ہوا نشیب میں بھاگ رہا تھا۔

ایک بیک ایک طرف سے اس نے ٹھوکر کھائی اور پھر منہ کے بل زمین پر گرنے کی بجائے کئی فٹ اوپر اچھل گیا۔ اس کی دونوں پنڈلیاں فریدی کی فولادی گرفت میں تھیں اور اس کا جسم جھول رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے کسی سانپ کے سر کی طرح دھڑسبت اوپر اٹھتا چلا گیا۔ سنگ ہی کو اس کے جاننے والے محض اسی صلاحیت کی بنا پر جو تک سے تشبیہ دیتے تھے۔ اپنے جسم کو حیرت انگیز طور پر توڑنے مروڑنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 42 نلی لکیر
جاسوسی دنیا ناول نمبر 45 خونی بگولے



ذوق آگہی

سبا گل

شب قدر کی فضیلت

حضرت سیدنا مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق کی عمریں دکھائی گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی عمر سب سے چھوٹی پائیں تو ممکن ہوئے کہ میرے امتی اپنی کم عمری کی وجہ سے پہلے کی امتوں کے جتنے نیک اعمال نہیں کر سکیں گے چنانچہ اللہ پاک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر عطا فرمائی جو دیگر امتوں کے ہزار مہینوں سے بہتر ہے (تفسیر الکبیر)

عمر رفاقت..... واہ کینٹ

فرا سوچیے

آگ آپ کے پاس جتنا ہو۔

آپ کے گھر میں برتن نہ ہوں۔

آپ کے جسم پر کپڑے نہ ہوں۔

صفائی دانے لے سرنہ ہوں

آپ کے بال بڑھے ہوئے ہیں

جو لوگ یہ کام کرتے ہیں انہیں بھی عزت کی ضرورت

ہے انہیں عزت دیجیے۔

رباںش بٹ..... حسن ابدال

دعا کا مکمل

اے نور اے سب سے پاکیزہ اے سب پہلوں سے
بہلے اور اے سب بچھلوں سے پیچھے یا اللہ وہ میرے سب
گناہ بخش دے جو ناموس میں بنا لگا رہے ہیں اے میرے
اللہ میرے وہ گناہ بخش دے جو نزل ملا کا باعث بنتے ہیں
اے اللہ میرے وہ سب گناہ بخش دے جو نعمتوں کو نال
دیتے ہیں اے اللہ میرے وہ سب گناہ بخش دے جو
دعاؤں کو درج قبولیت تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں اے
اللہ میرے وہ سب گناہ معاف فرما جو امید کو پورا نہیں
ہوئے دیتے اے اللہ میرے وہ سب گناہ بخش دے جن
سے بلائیں نازل ہوئی ہے میرے اللہ میرے وہ سب گناہ

معاف فرما جو سرزد ہوئے ہیں جو نہیں نے کیے ہیں اور اس
خطا کو معاف فرما جو مجھ سے ہوئی ہے۔

شجاعت حسین..... تحصیل تلہ منگ

ذات باری تعالیٰ

جب انسان ہر طرف سے ناامید و یاس ہو جاتا ہے
جب ہر طرف سے شہو کر لیتی ہے تو تب وہ ایک ہی ذات کی
طرف رجوع کرتا ہے وہی ذات جو بے شک ہمیں پیدا
کرنے والی پالنے پوسنے والی ہے وہ ذات جو ہمیں بن
مانگے دینے کو تیار کر ہم ڈاڑھ بکھر دے، شہو کر کھانے سے
پہلے کیوں نہیں اس ذات کو پکارتے، اور شہو کریں کھانے
کے بعد کیوں پکارتے بے شک اللہ بڑا بے نیاز ہے پھر بھی
ہمیں عطا کرتا ہے۔

افراجٹ..... مٹن آباد

بیوی کیسی ہو؟

☆ بیوی اتنی کم عمر نہ ہو کہ اس کی سہیلیاں آپ کو انکل
کہنے لگیں۔

☆ اتنی گندی نہ ہو کہ ٹی وی والے پیچھے بھاگتے
بھریں۔

☆ اتنی کالی بھی نہ ہو کہ بسنے والے رشتے داری
جوڑنے لگیں۔

☆ قدر کی چھوٹی نہیں ہو کہ بیس کنڈ بکٹر کہے کہ بیوی کو کو
میں لے لیں۔

☆ اتنی لمبی بھی نہ ہو کہ کوئی آکر پرچم لگا جائے۔

☆ اتنی خوش شکل بھی نہ ہو کہ لوگ کہیں پہلوئے حور
میں لنگور۔

☆ اتنی خوش اخلاق بھی نہ ہو کہ محلے والے بے تکلف
ہوئے لگیں۔

☆ پس افضل شاہین..... بہادر نگر

احتساب اور خود احتسابی

قاہدا عظم کھانا بہت کم کھاتے تھے دبلے پلے، بوڑھے
اور بیمار تھے مرض الموت میں جسائی کمزوری بہت بڑھ گئی
زیارت میں قیام کے دنوں میں ان کے معاذ ڈاکٹر الہی
بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خور کی کی وجہ سے ان کی
حالات زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے ان کی رائے بھی
کہ لاہور میں جو دو باورچی کچور تھلا برادرز کے نام سے

اگلے ہی روز دل کے ہاتھوں مجبور میں ہمسائی کے گھر پہنچا وہ مجھے دیکھ کر چپ سادے خاموشی سے اپنی جگہ ساکت سی ہو گئی جیسے مجھ پر شکوہ کناں ہو۔ اسے دیکھتے ہی میں بڑبڑ کر رہ گیا اس پر صدیوں کی سی دیرانی چھائی گئی اور صورت روہانی ہو رہی تھی میرا دل بھرا آیا میں نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اب آ جاؤ میری جان تجھ بن میرا دل بہت ادا اس ہے اس نے نگاہ بھر کر مجھے دیکھا میں نے آگے بڑھ کر اسے قہام لیا اور پھر اپنی بانہوں کے حصار میں بھرتے ہوئے بوسہ ثبت کر دیا۔

وہ سنتی ہوئی میرے ہاتھوں میں سما گئی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ میرے رشتے میرے دوست مجھے اپنے سے بھی جدا نہ کرنا رو نہ میں بکھر کر کچی کرچی ہو جاؤں گا مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔

میں نے فرط جذبات سے ایک بار پھر اسے بھیج کر اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے ہونٹ پکیا سے گئے۔ اب کبھی تمہیں اپنے سے جدا ہرگز نہیں کروں گا اے میری ”پیاری کتاب“

ایم حسن نظامی..... قولہ شریف

مرد کی خوب صورتی

مرد کی خوب صورتی کیا ہوتی ہے؟

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو روٹی، کپڑا اور پناہ دے کر احسان نہیں کرتا بلکہ مشکور نظر آتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو وحشت کے گھوڑے پر سوار ہو کر عورت کی انا کی دجیاں نہیں اڑاتا۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو بانگے بنا عورت کو محبت دیتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو شخص نفسانی خواہشات کا آلہ نہیں سمجھتا۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو موتیا کا پھول سمجھتا ہے موتیا کا پھول گرم سانس کی گرمی نہیں سہہ سکتا، وہ عورت کو اپنے مزاج کی پیش سے جلا کر رکھ کر دیتا

مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائد اعظم کو مرغوب ہے پور تھلا کے باورچی بھائیوں کی تلاش شروع ہوئی وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے لائل پور سے زیارت پہنچے کھانا پکایا اس روز قائد اعظم نے چند تھقے شوق سے کھائے کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا اور کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی وجہ بتائی گئی تو قائد اعظم ناخوش ہوئے اپنی چپک بک منگائی باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا اس رقم کا چیک کاغذ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرانی باورچی رخصت کیے اور کہا ”یہ حکومت اور ریاست کا کام نہیں کہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا سرکاری خرچ پر فراہم کرے۔“

ایس حبیب خان..... کراچی

افسانچہ

اس روز وہ مجھے شہر کے معروف بک اسٹال پر ملی اس کے گلابی لیوں کی مدھر مسکان نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہم نے ایک دوسرے سے اپنا مختصر تعارف کرایا دھیرے دھیرے بے لنگھی کے کبھی پردے داہوتے چلے گئے میں نے اسے اپنے گھر چلنے پر بمشکل راضی کیا اور وہ میرے ساتھ ہوئی میں نے اس سے بہت سی باتیں کیں اس قدر پیار و محبت بھری باتیں جن میں وفا و ناس کی چاشنی الفت کے تذکرے اور محبت کی خوشبو جی بسی تھی۔

وہ ہر بات چپک چپک کر خوب صورتی سے بتا رہی تھی میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اس نے مجھے معاشی، معاشرتی، سماجی اور اصلاحی بہت سی کہانیاں بھی سنائیں جنہیں سن کر میں دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے محفوظ ہوتا رہا وہ نرم و شیریں لب کشائی کرتی رہی اور میں اس کی من موہنی سن کے نہال خانوں میں اتارتا ہوا داد و دیتا رہا۔

اسی اثنا میں میری ہمسائی ہمارے گھر آن وارو ہوئی اس نے جو جہی اس گلاب سے کھنکھنے کو ایک نظر دیکھا بس اسی کی دیوانی ہوئی چلی گئی اس کی ہمتیں اور اصلاحی باتیں سننے ہوئے ہمسائی اس پر دل پارشیسی اور اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے پر ریفند ہو گئیں جسے میں ٹھکانہ سا کا شاید اور وہ اس کے ساتھ چل دی میرا کمرہ سونا سا ہو گیا شب بھر مجھے اس کی کمی کا احساس شدت سے رہا۔

ہے۔

(بشری رحمان کے ناول ”خو بصورت“ سے اقتباس)
ارم کمال..... فیصل آباد

کوراکاغذ

کاغذ کے ایک سفید ورق نے کہا میں بے داغ بنایا گیا ہوں اور ہمیشہ بے داغ ہی رہوں گا اور میں جل کر سفید راگھ میں تبدیل ہونا زیادہ پسند کروں گا بجائے اس کے کہ سیاہی مجھے چھوئے اور داغ میرے قریب آئے۔ جو کچھ سفید کاغذ نے کہا دوات نے سنا اور اپنے تاریک دل میں ہنس دی لیکن اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کی، رنگ برنگ پینسلوں نے بھی سنا وہ بھی اس کے نزدیک نہ پہنچ سکیں اور کاغذ کا سفید ورق اسی طرح بے داغ رہا، بے داغ اور صاف لیکن ”کورا“۔ (خلیل جبران)

دعا شامی..... فیصل آباد

اسٹوڈنٹ

صاحب اب تو اسٹوڈنٹ کو پہچانا مشکل ہو گیا ہے ہم نے ایک صاحب سے پوچھا ”کیا آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟“ تو انہوں نے جواب دیا ”نہیں جناب یہ تو جلدی میں مجھے اوپر لانا، بند کرنا یا ڈنکھل رہا۔“

البتہ اب کوئی اسٹوڈنٹ یہ کہے کہ اس پر کوئی کیس درج نہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پابندی سے کان نہیں جاتا ہوگا آج کل دنیا میں دو طرح کے طالب علم مشہور ہیں ایک وہ جو قابلیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ہیں، جب ہمیں پتا چلا کہ طلبہ نے طالبان کے نام سے کابل پر قبضہ کر لیا ہے تو ہم یہ سمجھتے کہ امتحان ملتوی کر دانا چاہتے ہیں لیکن انہوں نے طالب علموں والا ایک ہی کام کیا وہ یہ کہ لڑکیوں کے کان بند کر دیے۔

(لوک جھونک، ڈاکٹر یونس بٹ)

مرسلہ: نورین ظفر..... لودھراں

حضرت ابراہیم بن ادھم

حضرت ابراہیم بن ادھم ایک بار جنگل سے تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک سپاہی کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے سوال کیا ”تم غلام ہو؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“ اس نے کہا ”مجھے آبادی کا پتا دو۔“ آپ نے قبرستان کی

طرف اشارہ کیا وہاں ہے۔ سپاہی کو بڑا غصہ آیا اور حضرت ابراہیم بن ادھم کے سر پر اس قدر زور سے ڈنکا مارا کہ سر سے خون بہنے لگا۔ وہ غلام سپاہی آپ کو پکڑ کر شہر لے گیا لوگوں نے یہ ماجرا دیکھ کر بہت ملامت کی اور کہا بے وقوف تو نہیں جانتا کہ یہ زمانے کے مشہور بزرگ ابراہیم بن ادھم ہیں۔

سپاہی یہ سن کر بہت نادم ہوا گھوڑے سے اتر کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور کہا خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں لیکن یہ جواب دیں کہ آپ نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا تھا جب کہ میں نے آبادی کا پوچھا تھا۔ آپ نے فرمایا شہروں کی آبادی تو ایک دن ویران ہو جائے گی مگر اصل آبادی تو قبرستان کی ہے جہاں ایک دن سب کو جانا ہے۔ سپاہی نے پوچھا جب میں نے آپ کے سر پر ڈنکا مارا اس وقت بھی آپ کی زبان پر دعا کے کلمات تھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ دعا سے دلوں کو ثواب ملتا ہے اس لیے میں نے تمہیں اپنے ساتھ ثواب میں شریک کر لیا۔

مہرین آصف بٹ..... کشمیر

بغض و کینہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہر ہفتے میں دو دن دوشنبہ اور پنجشنبہ کو لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو بندہ مومن کی معافی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ سوائے ان دو آدمیوں کے جو ایک دوسرے سے کینہ رکھتے ہوں پس ان کے بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ ان دونوں کو چھوڑے رکھو یعنی ان کی معافی نہ لکھو جب تک کہ یہ آپس کے اس کینہ اور باہمی دشمنی سے باز نہ آئیں اور دلوں کو صاف نہ کر لیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔

”تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح راز دارانہ طریقے سے کسی کے عیب معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا کرو اور نہ آپس میں حسد کرو نہ بغض و کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو۔ بلکہ اے اللہ کے بندو، اللہ کے حکم کے مطابق بھائی بھائی بن کر رہو۔“

بلی شاہد..... مکش اقبال

اقوال زوید

□ حکومت اور عورت کی محبت کا چھوڑنا مبر سے زیادہ
کڑوا ہے۔

حضرت سفیان ثوری
□ اگر خود برا ہے لیکن دوسروں کی برائی نہیں کرتا تو یہ
بھی نیکی ہے۔

خواجہ غلام الدین اولیا
□ جب تک کسی شخص سے بات چیت نہ ہو اسے حقیر نہ
سمجھو۔

حضرت علی
□ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

الہیرونی
□ جاہلوں کی محبت سے پرہیز رکھو، ایسا نہ ہو کہ وہ
تمہیں اپنے جیسا بنادیں۔

حضرت لقمان
نبیلہ چوہدری..... رائے ونڈ

تلخ مگر حقیقت

☆ اولاد کی وفا کا پتا بڑھاپے میں چلتا ہے۔

☆ بہن کی وفا کا پتا اس کی جوانی میں چلتا ہے۔

☆ بھائی کی وفا کا پتا بیوی کی بیماری میں چلتا ہے۔

☆ بیوی کی وفا کا پتا شوہر کی غربت میں چلتا ہے۔

☆ ان سب رشتوں کو اپنے تجربات کی کسوٹی پر پرکھو

اور سوچو کہ کون کس کے ساتھ کتنا مخلص ہے، یہ ہے تو

”تلخ مگر حقیقت بھی ہے۔“

گفتہ خانہ..... محلواں

انمول موتی

☆ خیرات دیا کریں تاکہ آپ کے بچہ کبھی بھیک
نہ مانگیں۔

☆ آسمان کا آخری اور بہترین تحفہ ماں ہے۔

☆ مبر سب سے بڑی دعا ہے۔

☆ مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔

☆ دولت ہوگی تو خوشامدی بہت مل جائیں گے۔

☆ صدقہ مصیبت اور بلا کو نال دیتا ہے۔

☆ وعدہ کو وفا کرنا سب سے بہترین امانت ہے۔

☆ ہمیشہ نماز کو وقت پر ادا کریں۔

☆ ناکامی کا میاں بی کی طرف ہٹتی بیڑی ہے۔

☆ حسد حاسد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہادرنگر

جنت میں اے جانے والے چار عمل

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں
کہ رسول کریم ﷺ نے دریافت کیا۔

”تم میں سے کس نے آج روزہ رکھا ہے؟“

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا میں نے آج روزہ رکھا

ہے۔ ”آپؐ نے پھر دریافت کیا۔

”تم میں سے کس نے آج کسی کا جنازہ پڑھا ہے؟“

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا ”آج میں نے جنازہ پڑھا

ہے۔“

آپؐ نے پھر دریافت کیا۔

”تم میں سے آج کس نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا

ہے؟“

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا ”آج میں نے مسکین کو کھانا

کھلایا ہے۔“

آپؐ نے پھر دریافت کیا۔

”تم میں سے کس نے آج کسی مریض کی عیادت کی

ہے؟“

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا۔

”آج میں نے مریض کی عیادت کی ہے۔“ تو آپؐ

نے فرمایا

”جس شخص میں بھی یہ کام جمع ہوں گے وہ جنت میں

جائے گا۔“ سبحان اللہ

ریاض چوہان..... فیصل آباد



خوشیا ہونے سبب نوشیں قبل

غزل

یوں تو نہیں کہ پہلے سہارے بنائے تھے
دریا بنا کے اُس نے کنارے بنائے تھے
کوزے بنانے والے کو غلت عجیب تھی
پورے نہیں بنائے تھے سارے بنائے تھے
اب عشرت و نشاط کا سامان حوں تو حوں
ہم نے تو دیپ خوف کے مارے بنائے تھے
دی سے اسی نے پیاس بجھانے کو آگ بھی
پانی سے جسم جس نے ہمارے بنائے تھے
پھر یوں حوا کہ اس کی زباں کاٹ دی گئی
وہ جس نے مشکو کے اشلے بنائے تھے
صحرا پہ بادلوں کا مزر کھل نہیں سکا
قطرے بنائے تھے کہ شرارے بنائے تھے
شاهد خفا تھا کاتب تقدیر اس لئے
ہم نے زمیں پہ اپنے ستارے بنائے تھے
شاہد کی.....

غزل

تو کیا یہ آخری خواہش ہے؟ اچھا؟ بھول جاؤں؟
جہاں بھی، جو بھی ہے تجربے علاوہ، بھول جاؤں؟
تو کیا یہ دوسرا ہی عشق اصلی عشق سمجھوں؟
تو پہلا تجربے کی ذیل میں تھا؟ بھول جاؤں؟
تو کیا اتنا ہی آساں ہے کسی کو بھول جانا؟
کہ بس باتوں ہی باتوں میں بھلا تا بھول جاؤں
کبھی کہتا ہوں اُس کو یاد رکھنا ٹھیک ہو گا
مگر پھر سوچتا ہوں فائدہ کیا، بھول جاؤں!
تو کیا یہ دسترس ایک روز حاصل ہو گی مجھ کو؟
کہ پر ملی دھیان میں رکھوں اُسے یا بھول جاؤں
یہ کوئی نل تھوڑی ہے کہ بات آئی گئی ہو
میں اور اپنا نظر انداز ہونا بھول جاؤں؟
ہیں اتنی جزئیات اس سانچے کی، پوچھیے مت!
میں کیا کیا یاد رکھوں اور کیا کیا بھول جاؤں

کوئی کب تک کسی کی بے وفائی یاد رکھے؟
بہت ممکن ہے میں بھی رفتہ رفتہ بھول جاؤں!
تو کیا یہ کہہ کے خود کو مطمئن کر لو گے جواد؟
کہ وہ ہے بھی اسی لائق، لہذا بھول جاؤں
جواد.....

غزل

نجانے کون سا منظر صدائیں دیتا ہے
میں پہلی دھوپ، وہ نیلی ہوا میں دیتا ہے
کسی کے چہرے پہ گردِ ملال دیکھتی ہوں
خدا کبھی نہ کبھی تو سزائیں دیتا ہے
خیال یار نے آنکھیں ہماری غم رکھیں
جمال یار پلٹ کے جھانک دیتا ہے
ترے مزار سے ویرے! مہک سی آئی ہے
ٹو مجھ سے دور بھی رہ کر دعائیں دیتا ہے
ٹو جس مقام پہ بیٹھی ہے رابعہ بصری
فقط یہ نام ہی تجھ کو ضایاں دیتا ہے
غبارِ غم ہے، شبِ ہجر اور میں کسی
فراقی یار بھی کہا کیا ادا میں دیتا ہے
سفر کی دھول، محسن، آبلے، شکستہ بدن
یہ شعر یوں نہیں ہوتا، بلا میں دیتا ہے
رابعہ بصری.....

غزل

کبھی پیالے میں جھانکتی ہے، کبھی صفحے کھنگالتی ہے
میں سرائے میں ایک بندھیا، سعید فالس نکالتی ہے
غلامِ گردن کا یہ تعفن، جنابِ چربی کی مشطوں سے
اذانِ مغرب سے تخت پئے تک یہی نخواست اجالتی ہے
کسی نے عطر کا بل بنا کر فلک پہ اپنی نگاہ ڈالی
درختِ ندریں گزرتے ہیں، فضا ستارے اچھالتی ہے
زمین، پگھلی ہوئی حرارت کا ایک اندھا کنواں
کرخست سینے سے زندگی کے ہزار سوتے نکالتی ہے
رسولِ زادے! سپاہیوں کی ہر ایک چوکی کا دھیان
رکھنا

امام باڑے میں ایک دکھیا یاز گئے میں ڈالتی ہے
ردائی کے عمارے میں، اٹھاو خیمے، کا شور اٹھا
مگر معصوم کی چشم حیرت فقط مناظر سنبھالتی ہے
بتا دیتے کو جا رہے ہو، مرے لئے بھی دعا کرو گے
دعا جو رستی کی گانٹھ کھولے، دعا جو مشکل کو نکالتی ہے
کہیں سے ایندھن کا رزق اترا، کسی توازن کا حکم پایا
تری مشیت، مرا ستارہ، کمال رحمت سے پالتی ہے
احمد جہانگیر.....

شاید کوئی قلمس چہرہ خواب کی لوسے روشن ہو
شاید جاگتی سوتی آنکھیں خواب کے سحر میں ڈوبی ہوں
شاید شہر کے موڑ پر کوئی
ایسا دیوانہ ل جائے جو خوابوں کے سحر میں کھوپا
اب تک ویسا سوچ رہا ہوں جیسا میں نے سوچا تھا
خوش فکر سے خوش چہرہ لوگو
سکھ دے زمر میں تلنے والو
اونچی اونچی دیواروں کے زعمانوں میں رہنے والو
رستم کے لمبوس پہن کر کیا اس خواب کو بھول گئے ہو
جو ہم سب نے دیکھا تھا

کلام: غلام جیلانی اصغر
انتخاب: ایم جے قریشی..... ذریعہ اسامیل خان
نظم

اس کو
جب پلٹ کر دیکھا تو
اس کی نیلگوں آنکھوں میں
نظر آئی
زعمی اپنی
چوہدری قبر جاں..... سلطان
غزل

چاہت کا احسان دلا نہیں کیسے
وہ تھا ہے تو پھر مٹا نہیں کیسے
غلوں کی کوئی قدر نہیں رہی
مخ حسن کی آج جلا نہیں کیسے
کسی کے چمچز جانے سے آج
دل سے دوریاں مٹا نہیں کیسے
سوچا تھا کچھ حالات بدلیں گے
پھر پرانی رگدور اپنائیں گے
لوگ کہتے بے وفا ہیں یہاں جاوید
روشنی نہ ہوئی دل جلا نہیں گئے
محمد اسلم جاوید..... قیصل آباد
نظم

جو میری آنکھوں میں چڑھتا تھا
وہ دریا ب نہیں ہوگا
جو ساری رات میں کرتا تھا

غزل
تجھے اپنا بنانے کی کوشش کروں
جان تک میں گنوانے کی کوشش کروں
دیکھتی بھی رہوں چاہتی بھی رہوں
اپنی دھڑکن بنانے کی کوشش کروں
تیری آنکھوں کی جھیلیں میں بہتی رہوں
پھر وہیں ڈوب جانے کی کوشش کروں
تیری آنکھوں کی برسات اچھی لگے
ان کو یونہی دلانے کی کوشش کروں
کاش آجائے چاہت اسی سال وہ
اچے گھر کو سجانے کی کوشش کروں

شاعرہ: رفعت ناز چاہت
انتخاب: پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر
غزل

گھر اور آئین کا ایک نقشہ سب کے ذہن پر بھرا تھا
جاگ رہی تھی ساری آنکھیں خواب سہانا دیکھا تھا
بے گھر بن گئے مگر تھے لیکن سرتو اوپر چار کتے تھے
خوابوں کے دیوانہ رہتے لیکن گھر تو رکھتے تھے
خون کے سارے رنگ جلا کر خوابوں کیوان بنایا
اس کی دیواروں پر ہم نے صدیوں کے وہ خواب
سجائے
جن خوابوں کو کتے کتے کتنی چلیں بیت گئیں
اک دن خواب کے سارے پیکر مرمیں تعمیر ہوئے
تھے

غیروں کی تدبیر کے قیدی خود اپنی تقدیر ہوئے تھے
لیکن خواب ابھی زندہ ہیں
اب میں ان کو ہاتھ میں لے کر کھلی گئی ہوا ہوں

وہ گریہ اب نہیں ہوگا

محمد رفیقان رومان..... چکوال

غزل

سوکھے چوں کو ہوا دی اس نے
آگ میرے ہی نشین کو لگا دی اس نے
میں تھا صدیوں سے تمنائی اس کا
اسی بات کی سزا دی اس نے
ہر پل لبوں پر کہانی رہی وفا کی
پل بھر میں اوقات بتا دی اس نے
جانے کیوں تھا دل اس کا دیوانہ
میری ہر خواہش خاک میں ملا دی اس نے
آج غیر کے سنگ دیکھا تو احساس ہوا
دل لگانے کی سزا دی اس نے
میں عمر بھر فدا ہوتا رہا اس پر
جانے کیسے وفا بھلا اس نے
توڑ دیا اس نے ہر تعلق حسن
عمر بھر کی جفا دی اس نے

ایم حسن نظامی..... قولہ شریف

غزل

رفاق توں کے سفر میں عناد ڈرتا ہوں
کہ ناگزیر ہے دنگا فساد ڈرتا ہوں
یہ راہزنی یہ ڈمکتی یہ چور بازاری
گرے گا کون یہاں اسداد ڈرتا ہوں
یہاں تو پھول کی خوشبو بھی زہر قاتل ہے
یہاں تو مردہ بھی ہے زندہ باد ڈرتا ہوں
نہ توڑ پائیں گے ظلم و جفا کے ہاتھوں کو
یہ قوم چھوڑ چکی ہے جہاد ڈرتا ہوں
یہاں اکیس گے یقیناً اتفاق کے پودے
پڑی ہے فرقہ پرستی کی کھاد ڈرتا ہوں
ہر ایک چہرہ یہاں ہے نقاب کے پیچھے
شرافتوں کا ہے رخ پر ضاد ڈرتا ہوں
جو جھوٹ بات کو جج کی دکان پر بیچیں
قر علی ہے یہاں ان کو داد ڈرتا ہوں

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم

غزل

تمہارے ہجر سے تھا کس قدر لگاؤ ہمیں
جلا رہے ہیں وہی ہجر کے الاؤ ہمیں
سخن ہیں شیریں اگر ہم تو ممکنات ہمیں
اگر ہیں حرف غلط شوق سے مٹاؤ ہمیں
غبارِ راہ اگر ہم ہیں تو اڑا دو ہمیں
اگر ہیں راہ کا پتھر چلو ہٹاؤ ہمیں
ابھی مٹانی ہے ہم نے یہ تیرگی شب کی
نمودِ صبح سے پہلے تو مت بجھاؤ ہمیں
تری تلاش میں پیروں میں پڑ گئے جھالے
حصن سے غور ہیں درپیش ہے پڑاؤ ہمیں
کیا ہے ترک تعلق اگرچہ ہم نے ابھی
عجب نہیں ہے کہ اک روز بھول جاؤ ہمیں
کوئی ہمیں جو ستائے نہیں قبول ہمیں
یہ حق تمہیں ہی دیا ہے سو آزماؤ ہمیں
بھنگ رہے ہیں نہیں ہے سراغ منزل کا
کوئی تو کوچہ جانان کی رہ دکھاؤ ہمیں
ہر امتحان میں ہم سرخرو ہوئے ہیں فہیم
ہے یہ وفا کا تقاضہ گلے لگاؤ ہمیں

محمد فہیم..... یو کے

مجھے ڈر لگتا ہے

مجھے ڈر لگتا ہے ملالہ کی جرات بے کراں سے
مجھے ڈر لگتا ہے عاصم کی بے باک زباں سے
میں ڈرتا ہوں بے نظیر کی لکارِ شعلہ بیاں سے
کہ اک دن یہی کمزور و ناتواں

بلند و حوصلہ جوان

میرے باغ کی بالی بن کر

میرے بچوں کی لعل

اور گھوٹالی بن کر

چن کو گشتِ آراستہ کر دیتی

اور میں میں کہاں جاؤں گا

کے دکھ کے آنسو کا مقدر بتا کر بہلاؤں گا

کے غیرت کی سیلی چادر کہہ کر اپنا رعب

جماؤں گا

مجھے ڈر لگتا ہے

میں کہاں جاؤں گا

مجھے ڈر لگتا ہے

سرور غزالی..... جرمنی

غزل

دنیا دی رسوں سے
ملاؤنی باتوں سے
آزاد کر دینا

جذبے جب سرد پڑ جائیں
چاہتیں بے صوت مر جائیں
تو تحصیل کے رستے پر
پر سکون قدموں سے
واپس پلٹ جانا
ہمارا ساتھ چھوڑ دینا
احساس کی مٹی سے
تغیر پہنوں کے محلات
سمار کر دینا
جذبے جب سرد پڑ جائیں
کوئی نجواری اوڑھ لیتا
تعلق جبراً نہیں بیٹھے
ہمارا ساتھ چھوڑ دینا

رہے گی پونہی انا سر بلند ، شہزادے
میں جانتی تھی مرے خود پسند شہزادے
میں سومات نہیں ہوں کہ زیر ہو جاؤں
کجا یہ تیر کمان و کند شہزادے
تری رعایا بڑی دیر سے عذاب میں ہے
تجھے خبر ہی نہیں درد مند شہزادے
جو ہو سکے تو مجھے درد سے رہائی دے
میں شہر عشق میں کب سے ہوں بند شہزادے
کنیز حکم پہ قربان ، ملنے آجانی
مگر رکاوٹیں حائل ہیں چند شہزادے
اس اعتماد کے قابل نہیں مصاحب خاص
ہر ایک شخص ہے یاں زہر خند ، شہزادے
کول جو سیہ.....

حمیرا انصاف..... رحیم یار خان

نظم

تم نے کہا تھا
پہلی بارش کے پڑتے ہی
لوٹ آؤ گے
ہم اور تم مل کر بیگیں گے
دیکھو جاناں
کتنی پھواریں بیت چکی ہیں
سادن پھر سے لوٹ آیا ہے
برسوں پہلے کیا تھا تم نے
مجھ سے عہد
بھادؤنا
اب تو لوٹ کے آؤنا

نشان حیدر
زمیں ہے میری یہ نیلگوں آسمان میرا
محبوبوں سے بھرا ہوا سب جہان میرا
ہیں عزم و جرات جلال حیدر میرا حوالہ
میں حیدری ہوں نشان حیدر نشان میرا
راؤ تہذیب حسین تہذیب

فیصلہ

اپنی زیست کے صفحات سے
ہمارے وجود کا صفحہ
تار تار کر دینا
اپنی دھڑکن
سوچ سے
بوسیدہ محبت کے بوجھ سے
ہمارا خیال کھرچ دینا
ہمارا نام مٹا دینا
جذبے جب سرد پڑ جائیں
ارمان دل سے اتر جائیں
تورشتے کو
مناقت کے دھاگوں سے

فیاض اسحاق..... سلا نوالی



مرثیہ

ساجد حیدر

قسط نمبر 16

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد
دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور ٹھنڈے واس کے کھلونے بنے
بد معاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر..... وہ کسی کامرید ہو گیا.....!
شاہی محلے کا نمازی بد معاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی



”چلو آگے بڑھو۔“

وہ ادھر عریض پلٹ کر رہائشی عمارت کی طرف بڑھ گیا اور وہ دونوں حیران پریشان اس کے پیچھے چل پڑیں۔ دو افراد ان کے ساتھ ساتھ تھے دو دروازوں اور ایک طویل کوریڈور سے گزرنے کے بعد وہ ایک ایسے ہال میں کمرے تک پہنچ گئیں جس کی جگہ دو دروازے اور شان و شوکت دیکھتے ہی ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا چھت انتہائی بلند تھی جس کے عین وسط میں ایک جہازی سائز کانٹینر ترین فائوس روشن تھا۔ کمرے کے آخری حصے سے جتنی سائز کی سیڑھیاں اوپر ہی جیسے کی طرف جانی تھیں جو اوپر جا کر دو درویش اختیار کر گئی تھیں سیڑھیوں کے دونوں طرف سنہرے رنگ کی لٹکارے ماری ریلنگ تھی جس پر سونے کا گمان ہوتا تھا فرش سے لے کر سیڑھیوں کے آخری زینے تک انتہائی قیمتی اور دیر قایلین بچھا ہوا تھا ترتیب اور سلیقے سے لگائے گئے صوفے اتنے بیش قیمت اور دیدہ زیب تھے کہ حسن آرا تو کیا جہاں دیدہ زہمت بیگم نے بھی اپنی اب تک کی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ دیواروں پر مختلف پینٹنگز آویزاں تھیں اور کئی ایک سونے یا سونے جیسے پینٹل اور رنگ مرمر کے عجیب و غریب مجسمے جا بجا ایستادہ تھے ان نظارے سے ان دونوں کے دلوں پر ایک جیت سی آئی تھی۔

”ادھر بیٹھ جاؤ دونوں۔“ اسی ادھر عمر نے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود سامنے کے رخ موجود سیڑھی کی طرف بڑھ گیا جبکہ ان کے ساتھ ساتھ آنے والے باقی دونوں افراد خاموشی سے واپس پلٹ گئے وہاں پھیلی ہوئی ٹھنڈک تیار ہی تھی کہ کم از کم دوائے سی آن ہیں۔ ”اماں کچھ سمجھ آرہی ہے نہیں؟“ حسن آرا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا نہ زہمت بیگم بھی اس کے برابر ہی صوفے میں گھس گئی تھی۔

”آ ابھی رہی ہے اور نہیں بھی جو نہیں آ رہی وہ کچھ دیر میں آ جائے گی۔“ زہمت بیگم حیرانہ سے انداز میں وہاں موجود ایک ایک چیز کو نیک رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اماں کہ یہ میرا صاحب کا گھر ہے۔“ حسن آرا کی قیاس آرائی پر زہمت بیگم نے چونک کر اس کی

ویگن کے شیشوں کے سامنے پردے کھینچے ہوئے تھے وہ دونوں باہر دیکھ سکنے سے قاصر تھیں ان آٹھ افراد میں سے دو ان کے سامنے والی نشست پر پتھر کے مجسموں کی طرح خاموش اور ساکت بیٹھے تھے باقی دوسری دو گاڑیوں میں ان کی ویگن کے آگے پیچھے موجود تھے۔

زہمت بیگم نے ایک بار حسن آرا سے بات کرنی چاہی تو سامنے بیٹھے ایک شخص نے اسے ڈپٹ کر چپ رہنے پر مجبور کر دیا اس کے بعد تقریباً آدھے گھنٹے تک بالکل خاموشی سے یہ سفر جاری رہا پھر کئی گھنٹے کے گیسٹ سے اندر داخل ہو کر گاڑی رک گئی دروازے کھلے پہلے وہ دونوں گرائنڈیل نیچے اترے پھر ان دونوں کو بھی اتار لیا گیا۔

تینوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک وسیع و عریض پورچ میں کھڑی تھیں تھوڑے فاصلے پر پانچ چھ مزید چھپائی کاریں ایک قطار میں موجود تھیں ان میں سے اوہل اور پیکارڈ کی تو حسن آرا کو بخوبی شناخت تھی باقی بھی اپنی اپنی جگہ سرخیز تھیں اور یہ کئی گھنٹے نہیں بلکہ ایک پرکشہ محل دکھائی دیتی تھی نصف رات گزر چکی تھی اس کے باوجود یہاں ایک پچھلی سی تھی ساری لائیں آن تھیں کئی ایک لوگ موجود تھے تقریباً سبھی کی حرکات و سکنات پیشہ ور ملازمین والی تھیں ان کے جسموں پر الگ الگ دو طرح کی وردیاں تھیں زیادہ تعداد ایسے متعدد افراد کی تھی جو یہاں کے محافظ محسوس ہو رہے تھے ان کے کسرتی اور ٹھوس جسموں پر سیاہ چست لباس تھے اور پیروں میں بھاری جوتے کچھ کے پاس تو باقاعدہ اسلحہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

زہمت بیگم اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے بے اختیار تھوک نکل کر رہ گئی اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ سب لوگ کون ہیں اور وہ اس وقت کہاں موجود ہے یہی وجہ تھی کہ اس کے سانس خشک ہو رہے تھے۔

رہائشی حصے کی طرف سے ایک خشک مزاج سا ادھر عمر شخص تیزی سے ان کی طرف آیا تھا۔

”ادھر..... اس طرف لے کر آؤ ان کو۔“

اس کے مخاطب کرنے پر انہیں لانے والا ایک شخص ان سے مخاطب ہوا۔

طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف پہلو بدلتے ہوئے ناصحانہ انداز میں بولی۔

”دیکھ حسن آرا میر صاحب کے بھوت کو سر سے اتار پھینک اور خیر کے کلمے پڑھ یہاں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے ہرگز مت نکالنا کہ جو ہمارے لیے مصیبت کا باعث بنے اگر ان لوگوں نے ہمیں کاٹ کر یہیں دفن کر دیا تو کبھی کسی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہم دونوں کا انجام کیا ہوا بھی؟“

حسن آرا خاموش رہی اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی یہ احساس اس کے رویں روئیں پر ایک انوکھی سرشاری طاری کیے جا رہا تھا کہ وہ اس وقت میر صاحب کے ہاں بیٹھی ہے اس مندر اس معبد میں موجود ہے جہاں میر صاحب کے روپ میں ایک دیوتا گھومتا پھرتا ہے جہاں اس دنیا کا سب سے خوب صورت اور پیارا انسان رہتا ہے۔

اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب اس کی نظر زینوں سے اترنے آغا جی پر پڑی، ابھی پرسوں ہی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کی اور آج شام ہی میر صاحب نے اسے بتایا تھا کہ آغا جی ان کے بڑے بھائی ہیں وہ بے اختیار ان کے احترام میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ آج بھی ویسے ہی چلپے میں تھے جسم پر بہترین تراش کا سفید شلوار سوٹ اور آنکھوں پر سنہرے فریم کا پیش قیست چشمہ، البتہ آج ان کے چہرے اور آنکھوں کی سرمہری پہلے سے زیادہ گہری تھی وہ پروقار انداز میں چلتے ہوئے ان کے سامنے آ پہنچے۔

”آداب حضور، مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہونہ ہو یہ عالی شان محل حضور والا ہی کا ہوگا۔“ نزہت بیگم فوراً خوشامدانہ انداز میں گویا ہوئی ”لیکن حضور کو ایسی زحمت فرمانے کی کیا ضرورت تھی آدمی زبان سے حکم فرما دیتے کینہیں سر کے بل حاضر ہو جاتیں۔“

”ہمارا خیال ہے آپ جان چکی ہیں کہ ہم کون ہیں؟“ آغا جی نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا اور ساتھ ہی ہاتھ سے ان دونوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں جھکتی ہوئی واپس بیٹھ گئیں

جاگ رہے ہوں یا شاید سو رہے ہوں، پتا نہیں انہیں اس وقت ان کی یہاں موجودی کا علم بھی تھا یا نہیں۔“

آغا جی خاموش رہے انہوں نے ایک نظر حسن آرا کے چہرے پر ڈالی اور چائے کے کپ کی طرف متوجہ ہو گئے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نزہت بیگم ایک بار پھر بولی۔

”حضور ہمیں آپ ہی بتادیں کہ ہم نمائے کیا کریں آپ جیسے کہیں گے ہم ویسے ہی کریں گے جو کہیں گے وہی کریں گے بس ہمیں واپس جانے دیں۔ آپ کے لوگ جس طرح ہمیں لائے ہیں محلے میں بڑی بدنامی ہو جانی ہے ہماری آغا جی نے فوراً بھجویں اچکا کر نزہت بیگم کی طرف دیکھا۔

”بدنامی..... پہلے تو شاید پورے شہر میں آپ کی نیک نامی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں ہے نا؟“ ان کے لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔

”ہم ٹھہرے دو کوڑی کے لوگ دو کوڑی کی عزت والے لیکن حضور ہمارے لیے تو یہی سوالا لکھ ہے فن کار لوگ ہیں قدر دانی سے زیادہ رسوائی کی خاک سرمہ میں آتی ہے صرف اپنی برادری اپنے محلے والے ہی ہیں آپس میں ایک دوسرے کی کچھ عزت قدر کر لیتے ہیں ایک دوسرے کا دل رکھ لیتے ہیں بس اور کیا۔“

”فن کار تو آپ واقعی ہیں آپ کی فن کاری کو ہم دیانت داری سے تسلیم کرتے ہیں جب میرا ارشد اللہ جیسے شخص آپ کی فن کاری کے سحر میں دیوانے ہوئے پھر رہے ہیں تو یقینی طور پر آپ اپنے فن میں طاق ہوں گی اور.....!“ آغا جی نے ایک ذرا توقف سے کام لیتے ہوئے نظر حسن آرا کے چہرے پر ڈالی آپ کی تربیت ہے یا جو بھی آپ کی بجائی آپ سے بھی زیادہ زور کی فنکارہ ہیں۔“ حسن آرا ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی..... بہت شکریہ۔“ آغا جی کی پیشانی پر تناؤ سمٹ آیا۔

”یہ ہم آپ کی تعریف نہیں کر رہے۔“
”پھر بھی شکریہ۔“ اس کی متانت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا آغا جی کے چہرے پر بد مزگی کے تاثرات ابھرائے۔
”دیگر لوازمات کے ساتھ ملا تھم یقیناً آپ کی اس

چرب زبانی کا بھی پورا پورا اثر ہے جو میرا ارشد اللہ کے دماغ کو چڑھ چکا ہے آپ کی بدولت زندگی میں پہلی بار پرسوں رات ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ اختلاف برتا بحث کی بددلیلی کی حد تک آپ کا جادویوں ان کے سر چڑھ کر بول رہا ہے کہ وہ خاندان تک سے کٹ کر جی لینے کو تیار ہیں یعنی حد ہی ہو گئی۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کہا اور حسن آرا کی طرف خشکیں نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ہماری آج تک کی خاندانی روایات میں یہ سب پہلی بار ہو رہا ہے خاندان سے کٹ کر جینے کا مطلب جانی ہیں آپ اور وہ بھی پھر ہمارے یہاں مگر نہیں آپ بھلا یہ کیسے جان سمجھ سکتی ہیں آپ کو تو ٹھیک سے خاندان کے معنی بھی معلوم نہیں ہوں گے۔“

مزید کسی کے کچھ بولنے سے پہلے بغلی دروازہ کھلا دروازے میں اسی ادوجمر شخص کی صورت دکھائی دی جوان دونوں کو اس کمرے تک لایا تھا۔ اس نے آنکھوں سے آغا جی کو کوئی اشارہ کیا اور گردن خم کرتے ہوئے دروازے ہی سے واپس چلا گیا آغا جی بھی فوراً اٹھے اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

نزہت بیگم تو کسی اور پریشانی کا شکار تھیں حسن آرا کے دل پر آغا جی کی باتوں سے ایک بوجھ سا اڑا تھا جس بات کی اسے اب تک فکر رہی تھی جو اندیشے اس کا خون پیٹے رہتے تھے اور جس حوالے سے میر صاحب اسے پختہ انداز میں یقین دلا چکے تھے کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا وہی سب شروع ہو چکا تھا اسے لے کر میر صاحب کے گھر خاندان میں بد مزگی اور کشیدگی پیدا ہو نا شروع ہو چکی تھی۔

آغا جی کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی لیکن اس بار وہ اکیلے نہیں تھے سب سے پہلے کمرے میں میر ظفر اللہ داخل ہوئے انہوں نے سیاہ شیر والی زیب تن کر رکھی تھی سر پر جتان کپ تھی مٹی مگر سفید واڑھی موٹی موٹی غصے سے بھری آنکھیں ستواں ناک اور گھنی بھجویں جن میں ہلکی سی سرمئی رنگ کی جھلک باقی تھی۔

اندروں داخل ہوتے ہی وہ سیدھے ان دونوں ہی کی طرف آئے ان کے عقب میں آغا جی اور پھر وہ ادوجمر عمر تھا حسن آرا اور نزہت بیگم بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئیں نزہت

بیگم نے سلام کرنا چاہا لیکن میر ظفر اللہ کے تاثرات دیکھنے کے بعد اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکل پایا ایک ایک اسے محسوس ہوا کہ اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا ہے حسن آرا تھی جس نے حوصلہ جمع کرتے ہوئے سلام میں پہل کی۔
”السلام علیکم۔“

”حسن آرا؟“ انہوں نے سلام کا جواب دینے کی بجائے سوال داغا وہ ان دونوں کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔

”جی۔“ حسن آرا نے چادر کچھ مزید اچھے سے اوڑھتے ہوئے نظریں جھکا لیں پر ظفر اللہ دو قدم پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے دونوں بازو انہوں نے صوفے کی پشت پر پھیلا دیے تھے نزہت بیگم اور حسن آرا خاموش کھڑی رہیں انہیں بیٹھ جانے کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا تھا ان کے دامن ہاتھ کچھ فاصلے پر آجاتی ایک صوفے پر بیٹھ گئے ادھر عمر حفصہ ان کے قریب ہی مودب کھڑا رہا۔
پھر میر ظفر اللہ کی گونج دار آواز ابھری۔

”تم میرا ارشد اللہ کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہو؟“
”جی نہیں میر صاحب خود سے نہیں یہ عزت و سعادت بخشا چاہتے ہیں۔“

”تمہارے کوٹھے کا نمبر کیا ہے؟“ اس بار وہ نزہت بیگم سے مخاطب ہوئے۔

”تین سو سترہ حضور ہماری آبائی جنم بھوی ہے آخری شہنشاہ ہند سے بھی پہلے سے ہمارے جد امجد یہاں آباد تھے۔“ نزہت بیگم فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

”حضور غریب قرن کار لوگ ہیں ہم دو وقت کی روٹی کے لیے ہڈیاں کھساتے گزر جاتی ہے اور اس دو وقت کی روٹی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے بھی نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے ہنکارا سا بھرا اور حسن آرا سے مخاطب ہوئے۔

”اور حسن آرا تمہیں دو وقت کی روٹی سے سوا کیا چاہیے۔“ حسن آرا نے ایک نظر ان کے کرخت چہرے پر ڈالی اور سر کوئی میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔

”نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”میرا ارشد اللہ بھی نہیں۔“ اس کے دل پر ایک ضرب سی پڑی زبان حلق میں بل کھا کر رہ گئی۔

”ہم تیرہ بخت لوگ آپ کی خوش نودی کے سوا اور کچھ بھی چاہنے کی جرات نہیں کر سکتے حضور ہم پیچھے ذاتوں کے لائق کوئی بھی حکم ہو سر تسلیم خم ہے۔“ وہ بولی نہیں، کراہی تھی۔ میر ظفر اللہ چند لمحے سر دنگا ہوں سے اس کی صورت کا جائزہ لیتے رہے پھر رخ پھیر کر انہوں نے مودب کھڑے اس ادھر عمر حفصہ کی طرف دیکھا۔

”خادم حسین۔“ خادم حسین جیسے ان کی آنکھ کا تاثر سمجھ گیا۔

”جی..... بہتر۔“ اس نے فوراً گردن کو قدرے خم کیا اور مستحی سے پلٹ کر بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا میر ظفر اللہ نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔

”دیکھو بانی جی جس کھیل کی تم لوگوں نے شروعات کی ہے وہ نظر انداز کر دیے جانے والا نہیں پھر بھی..... ہم گنجائش نکالتے ہوئے پہلی اور آخری بار تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے معقول ترین رویے کے ساتھ تم لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ میرا ارشد اللہ سے جو کچھ اور جتنا بھی حاصل کرنا چاہ رہے تھے وہ ہم سے کہو ہم جو نہیں گھنٹوں میں تمہاری ڈیمانڈ پوری کر دیں گے اس بات کا خیال رکھنا کہ آج کے بعد میرا ارشد اللہ کو تمہارا دروازہ کھلا نہیں ملنا چاہیے اور اگر تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے تو جو نہیں گھنٹے کے اندر اندر تیاری کرو اور اس شہر سے کہیں دور چلے جاؤ صوبہ ہی چھوڑ دو حیدر آباد جا بسو یا کراچی وگرنہ تیسری صورت میں۔“

انہوں نے نزہت بیگم کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے اسے تنبیہ کے انداز میں جنبش دی اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر بخونگی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے غصے اور قہر کو ضبط کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں نزہت بیگم دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے لپکتے ہوئے بولی۔

”حضور ہمیں کچھ نہیں چاہیے میر صاحب سے بھی ہمیں کوئی لالچ نہیں وہ..... وہ خود ہی ضد پڑا ہے ہوئے ہیں ہم کوڑیوں کھوں کے لوگوں کی اتنی ہمت اور اوقات نہیں کہ میر صاحب کی ناراضگی کا بوجھ سہا سکیں باقی آپ کا حکم سر

”ہے اور ہم اس احساس سے چمکارہ پانا چاہتے ہیں
تلافی کرنا چاہتے ہیں۔“

”یعنی ہمیں درست اطلاع ملی تھی آپ سچ میں اپنا ذہنی
توازن گنوا بیٹھے ہیں۔“ میر ظفر اللہ کے چہرے پر شدید
ناگواری کے تاثرات ابھرا آئے۔

”دامن پر گلے کی وجہ کو اتارنے کے لیے کچھ سے
غسل نہیں کیا جاتا بر خوردار آپ اپنے منہ پر تو کالک مل
چکے اب باقی سارے خاندان کے منہ پر بھی سیاہی
پھیرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

دھبہ صرف ہمارے دامن ہی پر نہیں لگا ہاری وجہ سے
حسن آرا کا اجلا دامن، بھی داغ دار ہوا ہے۔“

”اجلا دامن۔“ میر ظفر اللہ نے یوں ان کی طرف
دیکھا جیسے سچ میں ان کی ذہنی حالت کے متعلق مشکوک
ہو گئے ہوں۔

”کوٹھے پر بیٹھی ایک طوائف اور اجلا دامن میر ارشد
اللہ آپ کہیں سچ میں تو پاگل نہیں ہو چکے؟“

”ہم جو کہہ رہے ہیں پوری ذمہ داری سے کہہ رہے
ہیں ان کی عصمت اور دو شیرازی کے ہم خود گواہ ہیں۔“ میر
ارشد اللہ نے نظروں کے ساتھ ساتھ سر بھی قدرے جھکا لیا
میر ظفر اللہ کے چہرے پر غیض کے تاثرات ابھرے لیکن
وہ ضبط کر گئے کمرے میں چند لمحے کے لیے گہری خاموشی
چھا گئی نہت بیگم کا اعصابی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اس کے
براہر ہی حسن آرا نظریں نیچی کیے چپ چاپ کھڑی تھی اس
کے دل و دماغ میں بخمبھ سے ڈوب ابھر رہے تھے اسے
محسوس ہو رہا تھا کہ باپ بیٹے کے درمیان کا یہ تناؤ مزید
کشیدگی اور خرابی کی طرف بڑھے گا بے چینی خون کی جدت
سے دل میں پارے کی مانند چمکنے لگی تھی لیکن اس میں جرأت
نہیں تھی کہ ان دونوں ہستیوں کے درمیان کسی بھی طرح
سے کسی بھی طرح کی مداخلت کرتی۔

”میر ارشد اللہ آپ یہ سب فوراً اپنے دماغ سے کھرچ
کر نکال پھینکیں یہ سبھی لوگوں کے لیے بہتر رہے گا۔“
انہوں نے ایک نگاہ ناگوار نہت بیگم اور حسن آرا پر ڈالی
اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”ہم آئندہ کبھی بھی نہ تو تم لوگوں کی غلطی دیکھنا پسندیں

آکھوں پر آپ جیسے کہیں گے ویسے ہی ہوگا بس اتنا احسان
کیجیے کہ ہمیں شہر بدر مت کیجیے۔ ہمیں یہیں جینے دیں
ہم..... ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔“ نہت بیگم
جیسی خراٹ اور لاچکی عورت ان لحوں پر ظفر اللہ کی پیش
دیتی آنکھوں کے سامنے گھبراہٹ کا شکار تھی اسے محسوس ہوا
تھا کہ اگر یہاں اس نے اپنی لاچکی فطرت کا ڈرہ بھر بھی
اظهار کیا تو اس کا سیدھا ساما مطلب یہی ہے گا کہ ان لوگوں
نے واقعی لاچ کے تحت میر ارشد اللہ کو پھانسنے کا کھیل رچایا
تھا اس صورت نتیجہ وہی ہوتا جو کسی خونخوار اور غصے میں آئے
ہوئے مگر چھ کو چھیڑنے کا ہو سکتا ہے۔

”بس پھر آئندہ اپنی دلیز پر دھیان رکھنا ورنہ بلد و زر
پھر جائے گا اور تم دونوں ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہو جاؤ گی۔“
اچانک بغلی دروازہ زور کی آواز سے کھلا آغا جی اور ان
کے والد ظفر اللہ نے چونک کر اس طرف دیکھا نہت بیگم
اور حسن آرا کی گردنیں بھی بلا ارادہ اس طرف کو گھومیں
آنے والے میر ارشد اللہ تھے ان کی آنکھوں میں خون کی
سی سرخی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے حسن آرا کا دل بے
طرح سے دھڑک اٹھا۔

اندرا داخل ہوتے ہی ان کی نظر ایک ساتھ حسن آرا
نہت بیگم اور پھر اپنے والد میر ظفر اللہ پر پڑی باپ پر نظر
پڑنے ہی وہ ٹھنک گئے چہرے پر ایک لمحے میں کئی رنگ
آ کر گزر گئے بہر حال انہوں نے نورانی خود کو سنبھال لیا۔
”السلام علیکم بابا سائیں۔“ قریب پہنچتے ہی انہوں نے
مودب انداز میں میر ظفر اللہ کو سلام کیا پھر ایک نظر حسن آرا
کی طرف دیکھا جو نظریں جھکائے کسی مجرم کی طرح خاموش
کھڑی تھی۔

”آپ انہیں پہچانتے ہوں گے؟“ میر ظفر اللہ نے
ان کی طرف دیکھتے ہوئے پھیر لیجے میں سوال کیا میر ارشد
اللہ کا چہرہ بشر اور جسم پر موجود جسک آلود گاؤں غمازی کر رہا
تھا کہ وہ سوتے میں سے اٹھ کرائے ہیں۔

”جی۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے
ہوئے نظریں جھکا کر بنیدگی سے اعتراف کیا۔

”آپ کو اپنے اس اعتراف پر شرمندگی کا کوئی احساس
ہے یا نہیں۔“

کریں گے اور نہ ہی کوئی نیا قصہ سننا گوارا کریں گے۔“
 انہوں نے نہزت بیگم کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اور آپ..... آپ دوبارہ بھی ان غلیظ رستوں کی
 طرف نہیں جائیں گے۔“ اس بار وہ میر ارشد اللہ سے
 مخاطب تھے وہ اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وہاں سے جانے
 کے لیے آگے بڑھے تھے کہ میر ارشد اللہ کی سنجیدہ اور مستحکم
 آواز نے ان کے قدم پکڑ لیے۔
 ”ہم کسی قسم کے ذہنی طور کا شکار نہیں ہیں بابا سائیں
 ہمارا فیصلہ ہماری غیرت کا تقاضہ ہے۔“

”غیرت۔“ میر ظفر اللہ بھنائے ہوئے انداز میں
 پلٹے۔

”کون سی غیرت، غیرت ہوتی تو آج یہ تماشا کیوں
 کھڑا ہوتا؟ آپ کے دو معصوم بچے ہیں خدا نے بہترین
 شریک حیات سے نوازا ہے اپنی حیثیت خاندان اور اپنا
 سلسلہ نسب دیکھیں اس سب کے باوجود طوائف نگری کو
 جاتے ہوئے غیرت آپ کے پاؤں کی بیڑی نہیں بنی تو
 ابھی آپ کس غیرت کی بات کر رہے ہیں اور کس منہ سے
 کر رہے ہیں؟“ میر ظفر اللہ بھڑک اٹھے تھے نہزت بیگم
 وہل کر رہ گئی اسے یہ خیال شدت سے ستانے لگا تھا کہ
 ”بیلیوں کی لڑائی میں ڈوڈو خٹواہ کچلے جاتے ہیں۔“

آغا جی بدستور آٹھ دس قدم پیچھے پڑے صوفے پر
 ڈھیلے ڈھالے انداز میں خاموش بیٹھے یہ سب دیکھ کر رہے
 تھے اپنے دونوں ہاتھ انہوں نے سینے پر باندھ رکھے تھے
 چہرے پر گھبر سنجیدگی اور آنکھوں میں سکون سیٹھ بیٹھے وہ
 بہت گہرے اور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

سیم حلیم کرتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوئی تمہاری وہ
 غلطی تمہاروں کے کسی سلسلے کی بنیاد پر ثابت نہ ہو ان لیے
 ہم نے یہ طے کیا کہ ہم اپنی اس غلطی کو سدھاریں گے حسن
 آراء سے نکاح کریں گے۔“ میر ارشد اللہ بولے تھے۔
 ”اور، یہ سیم جو پہلے سے آپ کے نکاح میں بیٹھی ہیں
 انہیں کیا جواز دیں گے؟“

”انہیں جواز سے پہلے ہم حقیقت بتا چکے ہیں سچ سچ
 انہیں ہمارے فیصلے پر نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کوئی
 اختلاف۔“

”انہیں نہ ہوگا مگر ہمیں اعتراض ہے ہم آپ کو ایسی کسی
 واہیات حرکت کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔“

”ہم حسن آرا کو زبان دے چکے ہیں۔“
 ”کاٹ کر پھینک دیں ایسی فضول زبان کو۔“
 ”آپ کے حکم پر ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس سے
 ہمارے فیصلے اور ارادے کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میر
 صاحب کا انداز مودب اور دھیمہ تھا لیکن لہجہ انتہائی مضبوط
 اور اٹل میر ظفر اللہ ان کے بالکل سامنے کھڑے ہوئے
 تھے۔

”اپنے ارادے اور فیصلے یہیں ختم کر دیں ورنہ ہم
 اپنے ہاتھوں سے آپ کو گولی تو مار دیں گے لیکن اپنے شجرہ
 نسب میں کسی طوائف یا طوائف سے چلنے والی نسل کا ذکر کرنا
 برداشت نہیں کریں گے مجھے آپ۔“ انہوں نے میر
 صاحب کو کندھوں سے پکڑ کر جھجھوڑ ڈالا تھا۔

”آپ گولی مارنے کا حق رکھتے ہیں بابا سائیں ہماری
 سات جائیں آپ پر قربان لیکن اپنی ذات کی خلوتوں سے
 آشا ہو جانے والی عورت سے بھلا ہم کیسے لالچ ہو کر جی
 سکتے ہیں کیسے اسے یونہی سانج کی اس وحشت زدہ بھیڑ میں
 تنہا چھوڑ سکتے ہیں ایک ذرا خود ہمارے اندر کی حالت کو
 محسوس کر کے دیکھیے۔“ میر ارشد اللہ نے پہلی بار سر اٹھاتے
 ہوئے براہ راست باپ کی آنکھوں میں جھانک کر کرب
 سے کہا کرب تھا احساس خطا کا اضطراب کا سرزد ہو چکنے
 والے گناہ کی احساساتی بازگشت کا وہ بول رہے تھے یا شاید
 کراہ رہے تھے۔

”بھٹو غلطی جو گناہ ہم سے سرزد ہوا وہ ہماری اپنی غلطیوں
 میں بھی قابل معافی نہیں ہے وہ ہو گزرا اتفاق تھا حادثہ کوئی
 لغزش تھی یا مقصد تھا ہو گزرا خود کوئی کو ہم نے خود کو مذہب پاتھا
 ہمارے اس گناہ کی پاداش میں آپ ہمارے بیٹے میں گولی
 اتار دیں گے تو ہمیں اپنے اندر کی اذیت سے قدرتی طور پر
 نجات مل جائے گی آپ نے ہمیں سزا دینی ہے تو ہمارے
 گز رہے ہوئے گناہ کی دیکھ جو ہم اب کرنا چاہ رہے ہیں
 وہ کوئی گناہ نہیں ہے خدا نے کم یزل بھی ہمیں اس کا حق اور
 اختیار دیتا ہے کوئی شرعی عکدہ بھی نہیں اٹھتا بلکہ ہمارے اس
 عمل کو تو ایک طرح کی نیکی کہا جائے گا۔“

”جو نیکی بڑی برائیوں اور خرابیوں کا باعث بنتی ہو اس سے احتراز کیا جاتا ہے طوائف کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کی ولدیت ہمیشہ مشکوک رہتی ہے آپ کی ادھر سے چلنے والی نسل کو لوگ میرا رشد اللہ کی بجائے ایک طوائف کی اولاد کہیں گے اور ہم ہم کس کس کو سمجھاتے پھریں گے شہاب الدین کو کیا جواب دیں گے نہیں ہرگز نہیں آپ یہ خاک نہیں اڑائیں گے۔“ میر ظفر اللہ ٹہلتے ہوئے صوفے کی عقبی طرف جا کھڑے ہوئے تھے۔

”ہم کوئی جھوٹا اقرار نہیں کریں گے بابا سائیں چاہے آپ ہمیں کوئی ہی کیوں نہ ماریں۔“ میر ظفر اللہ دونوں ہاتھ صوفے کی پشت پر لگا کر قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولے۔

”میرا رشد اللہ ہمارے ضبط کا امتحان مت لیں ہم جو کہہ چکے وہ حرف آخر ہے آپ آئندہ بھی ان گلیوں کی طرف نہیں جائیں گے اور دوسرا ہمیں یہ بھی بتادیں کہ ادھر کارستا آپ کو دکھایا کس نے کون آپ کو وہاں تک لے کر گیا تھا؟“ ان کے سوال پر میر صاحب نے نظریں جھکا لیں وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولے تھے البتہ اس بار پہلی دفعہ غا جی نے لب کھولے۔

”نواب اسفند یار خان اور نواب سکندر خان جو کیزی۔“ ان کی گونج دارا داز پر میر ظفر اللہ یوں جھکا کھا کر ان کی طرف پلٹے جیسے صوفے میں سے کرنٹ لگا ہوا۔

”اسفند یار اور سکندر خان۔“ وہ غصے اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دونوں خبیثوں کے جاگیردار حاکم علی کے ساتھ کسی نوعیت کے مراسم ہیں پھر بھی آپ نے ان کے ساتھ معاملات رکھے ہوئے ہیں ان کے ساتھ بازار حسن تک چلے گئے کوٹھے کے زینے چڑھ گئے آپ آپ کو ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ حاکم علی ان دونوں خبیثوں کے ذریعے یوں ہمارے ساتھ اپنی دشمنی چکار رہا ہے ہمارے خلاف چال چل رہا ہے۔“

”ہمارا ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاملہ نہیں چل رہا بس اسی روز ساتھ رہا وہ بھی اس روز ہم ٹھیک سے اپنے حواسوں میں نہیں تھے تو اسی لیے۔“

”حواسوں میں تو آپ آج بھی نہیں ہیں۔“ میر ظفر اللہ نے زہر خند سے کہا پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولے۔

”حاکم علی اوجھے اور گھٹیا، جھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔“ پھر انہوں نے ایک ذرا توقف سے کام لیتے ہوئے بھویں اچکا کر میر صاحب کی طرف دیکھا ”حاکم علی کے بیٹے کے ساتھ بھی آپ کا کوئی تنازع بننا ہے۔“

”اس نے ان لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا اور تو اور پیٹرول چھڑک کر ان دونوں کو زندہ جلانے والا تھا اگر ہم بردقت نہ کچھ پاتے تو شاید وہ اپنے اس سفاک اور بے رحم مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔“

نزہت بیگم اور حسن آرا دونوں جانتی تھیں کہ یہ جو بدری اکبر علی کا ذکر ہو رہا ہے میر ظفر اللہ نے ایک انتہائی ناگوار نظر ان دونوں پر ڈالی ان کی نگاہوں میں کچھ ایسی چیز تھی کہ نزہت بیگم کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک جھرجھری سی کھلبلا کر رہ گئی کمرے میں پھیلی خوش گوار خندنگ کے باد جو اسے اپنی پیشانی پر پینے کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے ان لوگوں کو اب ہم دیکھ لیں گے آپ جائیں جا کر آرام کریں اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اسے اچھی طرح اپنے دماغ میں نقش کر لیں بٹھالیں اپنے ذہن میں؟“

”بابا سائیں۔“ انہوں نے میر ظفر اللہ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں گہری ناراضگی اور غصے کے تاثرات رقم تھے۔

”ہمیں دیکھو اور محسوس کیے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ ہمارا مسئلہ نہیں سمجھ پائے اگر بات مزید زندہ رہنے کی ہے تو ہم حسن آرا کو اہٹانے بغیر سکون سے نہیں جی سکیں گے ہماری سائنس سائنس ہمارے لیے اذیت کا باعث بنی رہے گی ہمیشہ ہم۔۔۔۔۔!“

”جو کہنا ہے سیدھے صاف کہیں واضح کاف الفاظ میں۔“ میر ظفر اللہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے ان کے تاثرات کچھ مزید بگڑ گئے تھے۔ کمرے کی خشک فضا میں چند لمحوں کے لیے ایک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی حسن آرا کا دل مٹی میں جکڑ گیا۔

اکتوبر ۱۹۷۳

سانس لیتا جیتا جاگتا گناہ ہو، رنج و غم کا ایک بے کراں ساگر
اس کے سینے میں گردشیں لینے لگا۔

میر ظفر اللہ اس کے بعد وہاں رکھے نہیں تھے۔

☆☆☆

کمرے سے نکلے ہی اس نے بہ عجلت دروازے کی
باہر سے کنڈی لگائی اور چپتے کی سی پھرتی سے بیڑھیوں کی
طرف دوڑ پڑا پانچ فائر ہوئے تھے انداز دو طرفہ فائرنگ کا
ساتھ یا تو کسی تیسرے کی طرف سے مداخلت ہوئی تھی یا پھر
ان لوگوں نے ڈپٹی اعلان کی طرف سے غفلت برتی تھی
اس کی تلاشی نہیں لی تھی بہر حال دونوں صورتیں ہی خنجر کے
حوالے سے جان لیوا تھیں۔

مرشد محض چند لمحوں میں نچلے زینوں تک جا پہنچا وہ
پوری طرح چوکنا تھا اس کی انگلی پٹل کی لیبی سے یوں چٹکی
ہوئی تھی کہ وہ پلک جھپکنے کی دیر میں فائر کر سکتا تھا۔ وہ نیچے
پہنچا ہی تھا کہ اس کو ریڈور سے خنجر نمودار ہوا اس کے پائیس
کنڈھے سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر بھیجانی تپش تھی۔
”وہ حرامی نکل بھاگا۔“ مرشد پر نظر پڑتے ہی خنجر نے

تیر لہجے میں کہا

”گولی لگی ہے تمہیں۔“ وہ لپک کر خنجر تک پہنچ گیا۔

”معمولی زخم ہے اس نے نجانے کدھر سے پٹل نکال
کر فائر کر دیا بس وہی گولی کنڈھے سے رگڑ کھا گئی۔“ دو فائر
میں نے کیے لیکن وہ تو بندر کی طرح اچھل کود کر اس طرف
دالے صوفے کے پیچھے آگرا کرے کے دروازے سے
پھر اس نے دو فائر کیے بال بال ہی بچا ہوں میں مرشد اس
کی ٹیس کا کارکنج کر زخم کا جائزہ لے چکا تھا گولی اوپر سے
گوشت کو ادھیرتی ہوئی گزر گئی تھی زخم سے بہنے والا خون
اس کی ٹیس اور آستین کو رنگین کر رہا تھا۔

”ہاں بچت ہو گئی تم ادھر اندر دیکھو میں اس حرامی کو باہر
دیکھتا ہوں۔“ مرشد فوراً دروازے کی طرف لپکا۔

”میں بھی ساتھ آتا ہوں وہ یقیناً باہر ہی کو بھاگا ہے۔“

خنجر نے اس کی تقلید کی لاؤنج کے بیرونی دروازے سے وہ
دونوں آگے پیچھے ہی باہر نکلے تھے لازم لڑکا گیت بند کرنے
کے بعد گیت کے سامنے ہی حیران پریشان کھڑا تھا شاید
اسے فائرنگ کی آواز سنائی دی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ چند

پھر میر صاحب کی پر رعب آواز بلند ہوئی۔ ان کا لہجہ
فیصلہ کن تھا۔

”اس جتنے ہم حسن آرا سے نکاح کرنے جا رہے
ہیں۔“

”ہم آپ کو اس حماقت کی اجازت نہیں دے سکتے۔“
”ایسے میں ہم آپ سے معذرت چاہیں گے۔“

”یعنی..... یعنی آپ اس طوائف کے لیے اپنے باپ
کی نفی کر گزریں گے؟“ انہوں نے تعجب سے وہاں موجود
چاروں افراد کی باری باری شکلیں دیکھیں پھر صوفے کے
عقب سے نکل کر میر صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے
بولے۔

”اسنے خود سر ہو چکے ہیں آپ اور ہمیں اندازہ تک
نہیں ہوا کبھی ایک طوائف کا عشق اس درجہ آپ کے دماغ
پر سوار ہو چکا ہے کہ آپ یہاں اپنے باپ ہی کے فیصلے کے
خلاف کھڑے ہیں، تمیز و تہذیب اور اپنی خاندانی اقدار کو
بھی کسی موری میں بہا چکا ہے تو لیکن ہم آپ کو بتا دیں کہ
میر ظفر اللہ کے جیتے جی تو ایسا کچھ نہیں ہوگا جیسا آپ چاہ
رہے ہیں اور اگر ایسا کچھ ہوا تو یاد رکھنا کہ ایک لاش تو ضرور
گرے گی چاہے وہ لاش آپ کی ہو یا ہماری۔“ انہوں نے
میر صاحب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا پھر ایک قدم
پیچھے ہٹتے ہوئے آغا جی سے مخاطب ہوئے۔

”آپ ایسا کریں کہ ان دونوں کو۔“ اشارہ زہت بیگم
اور حسن آرا کی سمت تھا ”جہاں سے اٹھوایا ہے وہاں واپس
پھینکوا میں اور.....!“ انہوں نے رخ بدل کر ان دونوں کی
طرف دیکھا۔

”تم دونوں آج کی رات صرف سوچ کر گزرو وہاں صبح
تک اپنا فیصلہ آپ خود ہی کر لیتا۔“

ان کے لفظوں میں چھپی ہوئی ناک دھمکی کو ان دونوں
نے ہی بخوبی محسوس کیا وہ ایک بار پھر آغا جی سے مخاطب
ہوئے۔

”ان دونوں کے ساتھ ساتھ یہ قالین صوفہ اور یہ برتن
بھی یہاں سے کہیں دور پھینکوا دیں۔“ ان کے لہجے میں
نفرت بھی حقارت بھی ان کا ایک ایک لفظ حسن آرا کا کلچر
چھید کر گزرا اسے لگا جیسے اس کا وجود ایک گالی ہو ایک

مرشد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ آج بھی شراب کے نشے میں ہے البتہ اس کا جواب مرشد کے اندازے کی تائید کر گیا وہ یقیناً حجاب سرکار کے رشتوں داروں ہی میں سے تھا مرشد نے خنجر کی طرف دیکھا۔

”اور کوریڈور میں بائیں ہاتھ تیسرا دروازہ ہے باہر سے کنڈی لگی ہے دونوں کو نیچے لے آؤ۔“ اس کا اشارہ رانا اور فیروزہ کی طرف تھا خنجر سر ہلا کر فوراً میز کی طرف بڑھ گیا۔

”رانا صاحب کدھر ہیں اور تم یہاں کیا کر رہے ہو کیا چل رہا ہے یہاں؟“ زریون نے سوال کیا مرشد ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھ جیسوں کا تو رانا جیسے چنگڑوں سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے مگر آپ سید سرکار ہیں آپ کو اس طرح یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”میرے رانا صاحب کے ساتھ کاروباری معاملات ہیں ہماری دو فیکٹریوں کی کاشن رانا صاحب ہی پوری کرتے ہیں۔“

”کاروبار..... کاشن..... اور اس کے علاوہ کیا معاملات ہیں۔“

”تم کس حساب میں ہمارا غرور بولے رہے ہو۔“ زریون کے ماتھے پر ناگواری کی ٹھنکیں چمک گئیں۔

”حضور گستاخی معاف آپ مہربانی کر کے بتائیں کہ

رانا کے ساتھ آپ کے معاملات کس سطح تک ہیں آپ رانا کو کس حد تک جانتے ہیں گزشتہ کچھ دنوں سے رانا جس معاملے میں ملوث ہے کیا آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں اگر جانتے ہیں تو کیسے کہیں اور کہنا؟“ مرشد کی آنکھوں کے سامنے چند مناظر جھلملارہے تھے آپس میں گڈ بھڑ بھڑ رہے تھے۔ سب سے زیادہ واضح منظر میں حجاب سرکار کی اداسی میں رنگی معصوم صورت تھی پھر فیروزہ کے کوٹھے کے سامنے لگی نشے میں دھت زریون تھا فوجی،

ملنگی، ڈپٹی اعوان چوہدری فرزند رانا اور پھر زریون سب ایک ساتھ تھا آپس میں جڑا ہوا الجھا ہوا پتا نہیں کیوں لیکن ان لحوں مرشد کے ذہن سے اس پر اسرار خیر خواہ عورت کا خیال بھی گزرا جس کی مدد سے وہ ملنگی لوگوں کی قید سے

لحے پہلے اس نے ڈپٹی اعوان کو اندر سے پاگلوں کی طرح نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہوا دائیں ہاتھ پورچ میں ایک کاررک رہی تھی اس کار میں آنے والا متوقع طور پر رانا کا وہی کاروباری ساتھی یا واقف کار تھا جس کی ایما پر رانا نے فیروزہ کو اس کے کوٹھے سے اٹھوایا تھا مرشد نے اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اس کا سارا دھیان کسی اور طرف تھا۔

”تم ان دونوں کو سنبھالو۔“ اس نے خنجر سے کہا اور خود کوٹھی کی بنگلی سمت کی طرف دوڑ پڑا، اگلے چند منٹ میں اس نے کوٹھی کے سارے کونے کھدوے دیکھ ڈالے لیکن ڈپٹی کا کہیں کوئی نشان نہیں تھا اس کا سیدھا ساما مطلب یہی تھا کہ وہ نکل بھاگا ہے مرشد واپس لاؤنج میں داخل ہوا تو اس کے کانوں سے ایک مردانہ آواز نکلائی۔

”تم ہو کون اور رانا صاحب کدھر ہیں؟“

مرشد نے دیکھا کہ ملازم لڑکا ڈرا سہما سافر ش پر بیٹھا تھا سامنے ہی خنجر چمک لیے کھڑا تھا اور لڑکے کے قریب ہی ایک صوفے پر نووارد بیٹھا تھا اس کے چہرے پر بیزارگی کے تاثرات تھے اس کے باوجود وہ چہرہ بارعب اور خوب رو دکھائی دے رہا تھا اسے دیکھ کر مرشد چونکا تھا تو مرشد پر نظر پڑتے ہی اس نووارد کے تاثرات میں بھی تغیر آتا آیا البتہ آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہونے میں چند لمحے لگے۔

وہ کوئی اور نہیں زریون تھا زریون علی جسے اب سے پہلے وہ فیروزہ کے کوٹھے کے باہر لگی میں مل چکا تھا اور پھر حجاب سرکار کے ماموں مرید حسین کے گھر بھی دیکھ چکا تھا اب اس کی یہاں موجودی مرشد کے لیے قطعی غیر متوقع تھی مرشد کو پہچانتے ہی اس کے چہرے پر ایک لمحے میں کئی ایک رنگ لہرا گئے۔

”مرشد۔“ اس نے مرشد کی طرف تائید طلب انداز میں انگلی اٹھائی۔

”کیا آپ سید گھرانے سے ہیں؟“ مرشد نے اس کے سامنے پہنچ کر تنبیہ سے استفسار کیا اس کے سوال پر زریون کی آنکھوں میں ایک ذرا حیرانی سی ابھری۔

”آں ہاں..... مگر کیوں؟“

زندہ سلامت نکل آیا تھا اودا تے ہوئے سرکار کے دودنم
بھی کم کرا تھا۔

شاید مرشد کے انداز مخاطب سے جھلکتا ادب احترام
ہی تھا جس نے زریون کے ماتھے کی شکنیں کم کر دیں البتہ
اس کے چہرے کی سنجیدگی کچھ مزید گہری ہو گئی وہ مرشد کو
تولتی بنو لیتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم یہ سب کیوں جانتا چاہے ہو؟
کیا وہ پچی ہے تمہیں اس سب میں؟“ زریون کے سوال پر
مرشد نے سر نیچے جھکا لیا وہ دونوں کہیاں رانوں پر ٹکائے
بیٹھا تھا پتول اس کے دائیں ہاتھ میں بھول رہا تھا چند
لحے بعد اس نے سر اٹھایا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے
بولا۔

”یہ سب میری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔“
”ڈیوٹی؟“ زریون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”کیسی ڈیوٹی؟“

”دیس اتنی حساس نوعیت کا ہے کہ میں آپ کو تفصیل
نہیں بتا سکتا، اتنا بتا دیتا ہوں کہ بہت سوں کی موت کے
پروانے جاری ہو چکے ہیں اور آج رانا سرفراز کا نمبر لگا
ہے۔“

”کیا تم کسی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہو یا..... یا پھر
یونہی بکواس کر رہے ہو؟“

”کیا آپ ڈپٹی ایگزیکٹو اعلان کو جانتے ہیں؟“ مرشد
نے ایک اور سوال اٹھایا۔

”ہاں..... کس حد تک۔“

”آپ کو کوئی اندازہ ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟“
ہفتہ دس دن پہلے انہیں کچھ نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا

تھامیرا خیال ہے کہ اس کے بعد سے اب تک کسی کو بھی ان
کی خبر نہیں ہے۔“ مرشد بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس

کے اس بیان سے اتنا تو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈپٹی والی
ساری کہانی سے ناواقف ہے شاید حجاب سرکار والے

معاملے کی اصل صورت حال کا بھی اسے کوئی اندازہ نہیں
تھا۔

اسی وقت میز جیوں پر ہونے والی آہٹ نے ان کی
توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، خنجر ان دونوں کو لے آیا تھا

رانا کا کالر اس نے بائیں ہاتھ میں دیوچ رکھا تھوڑا سا
دونوں کے پیچھے آ رہی تھی، اس پر نظر پڑتے ہی زریون کی
آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی ہونٹ
مسکراہٹ کے انداز میں مسخ گئے اور وہ آہستہ سے اٹھ کھڑا
ہوا۔

رانا کو خنجر نے مرشد کے سامنے فرش پر لا بیٹھایا اس کے
دائیں گال پر سرخ سرخ لکیریں واضح دکھائی دے رہی
تھیں جو مرشد کے پھپھڑوں کی کارستانی تھی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ رانا کی حالت زار دیکھتے ہوئے
زریون نے ناگواری سے پوچھا۔

”انہیں جانتے ہو؟“ مرشد نے زریون کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے رانا سے پوچھا جبکہ خنجر نے پلٹل سے

اشارہ کرتے ہوئے زریون کو بیٹھ جانے کا کہا اور فیروزہ
مرشد کے عقب میں صوفے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

”یہی ہیں جو میں نے کہا تھا انہی کے کہنے پر میں نے
اس کو۔“ رانا نے ایک نظر مرشد کے عقب میں کھڑی فیروزہ

کے چہرے پر ڈالی ”ہیرا منڈی سے اٹھوایا تھا۔“
”ان کو تمہاری ڈپٹی اور سرکار والی کہانی کا پتا ہے؟“

”نہیں..... نہیں تو.....!“ اس نے سر اٹھ کر پریشانی
کے ساتھ مرشد اور خنجر کی طرف دیکھا ایک بے چین سی نظر

اس نے زریون پر بھی ڈالی تھی۔
”ان کا اس سب سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کسی نہ کسی حوالے سے ان کا تعلق واسطہ بنتا
ہو۔“ مرشد کے لہجے اور آنکھوں میں معنی خیز چہمن تھی

زریون کا دھیان ان پر ٹھہر گیا۔
”ہمیں اب زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے یہاں۔“ خنجر

نے وحشی آواز میں کہا لیکن مرشد نے ان کی گدی۔
”نہیں..... ایسا بالکل بھی نہیں ہے ان کے ساتھ بس

یہی ایک معاملہ طے ہوا تھا میرا۔“
مرشد چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک بار تو

اس کے ذہن میں آئی کہ حجاب سرکار والا معاملہ کھول لے
اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ زریون کا حجاب سرکار سے

کیا رشتہ بنتا ہے اور زریون کو بھی معلوم ہو جاتا کہ رانا اور
ڈپٹی کی اصلیت کیا ہے اور حجاب سرکار اس وقت کس کے

پاس پر غمال ہیں لیکن اس میں کچھ قاتل جس سب سے بڑی اور ناقابلِ برداشت قاتل خود کی اپنی ذات حتی ذات سے جزا ایک انتہائی بدنام اور ناقابلِ قبول پس منظر تھا۔ اس نے سر جھکتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔

”یہ تو صاف ہے کہ تو اور ڈپٹی ایک ہی ہیں اب فوراً سے پہلے بک دے کہ سرکار کو کہاں رکھا گیا ہے کہاں پر ہیں وہ؟“

”ہیلو۔“ زریون سے چپ نہیں رہا گیا تھا یہ کیا استوری ڈسکس ہو رہی ہے۔“

”چپ کر کے بیٹھ جا کہیں تیری استوری وی.....!“
خنجر نے پٹل سیدھا کرتے ہوئے اسے دھکمانے کی کوشش کی تو مرشد نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

”خنجر یہ سید بادشاہ ہیں۔“ خنجر نے فوراً پٹل نیچے کر لیا مرشد نے زریون کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”حضور..... چند منٹ..... صرف چند منٹ آرام و حق سے تشریف رکھیے۔“ زریون نے بے زاری سے ہنکارہ سا بھرا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا قریب ہی فرش پر ملازم لڑکا کم

صم بیٹھا تھا اس کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ شدید حیرت و بے چینی چمکی ہوئی تھی اب سے پہلے وہ رانا سر فراد کو جس کروفر میں دیکھتا رہا تھا اس کے بعد یقیناً اب

اسے رانا کی موجودہ حالت زار اور بے چارگی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اب تو رانا بی بی سرکار کہاں ہیں؟“ مرشد بھرے رانا کی طرف متوجہ ہوتا ہی طرح جانتا تھا کہ مرشد کی سرکار

سے کیا مراد ہے۔ زریون کو کوئی شک نہ تھا شاید مرشد کی سرکاری جگہ صاب بی بی اسٹیشن کرنا تو نہ دیکھ

میں طرح چمک رہا تھا۔

”جی جی چاہے قسم لے مجھے نہیں پتا۔“
”رانا صاحب۔“ زریون نے رانا کو پکارا۔

”کوئی دسکی شکسکی نہیں رکھی ہوئی آپ نے؟“ رانا نے جھکتے ہوئے انداز میں ایک طرف کو موجود فریج کی طرف اشارہ کیا۔

”ادھر..... اس میں رکھی ہے۔“
”تھک یو سوچ۔“ وہ اٹھ کر فریج کی طرف بڑھ گیا

خنجر نے مرشد کی طرف دیکھا اور مرشد زریون کو دیکھ کر وہ گیا۔

”رانا مجھے چرانے کی کوشش مت کر۔“ وہ ایک بار پھر رانا پر غرایا۔

”خدا کی قسم میں کچھ کر رہا ہوں میں نے ایک دو بار پوچھا بھی ہے مگر ڈپٹی نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا

صرف صرف خود اسی کو پتا ہے کہ اس نے اس لڑکی سرکار کو کہاں چھپا رکھا ہے۔“ مرشد چند لمحے یک یک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس نے پٹل کی نال اس کے

سر پر رکھ دی۔

”جب تجھے کسی بات کی کوئی خبر ہی نہیں ہے تو پھر تجھے مرجانا چاہیے۔“ اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ رانا بے اختیار

جبر جبری لے کر رہ گیا۔

”دل..... لیکن میں ڈپٹی کے متعلق جانتا ہوں کہ وہ کہاں پر ہے۔“ اس بار اس کی زبان کی روانی پر مرشد بے اختیار

اختیار مسکرا دیا۔

”آگے بول بتا جو جانتا ہے۔“

”وہ..... وہ نہیں ہے انہو والے دن سے لے کر ابھی تک؟“ اس بار مرشد بری طرح چونک پڑا اس نے ایک نظر

زریون کی طرف دیکھا وہ سامنے والے کونے میں فریج کے سامنے دسکی کی بوتل کو ڈائریکٹ منہ سے لگائے کھڑا تھا پتا

نہیں رانا کی آواز وہاں تک نہیں پہنچی تھی یا زریون کی توجہ ہی ان کی باتوں پر نہیں تھی مرشد نے جھپٹ کر رانا کو

گمے میں سے بول دیا۔

”کہیں..... کہیں ہے وہ اس وقت؟“ مرشد کی غصہ بالکی میں اس کی تمام قویاں بے قریبیاں مملی ہوئی

تھیں۔

”نہیں حتی طرف والی کٹھی میں اگر..... اگر وہ کل گیا ہے تو ادھر سے سیدھا اسی کٹھی میں گیا ہوگا ابھی وہیں ہوگا۔“

ایک مرشد کے رگ و پے میں خون اچھالے مارنے لگا اس نے خنجر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بھی جوش کی سننا تھا کسی اس کی آستین اور نہ میٹھاں کا ایک حصہ خون سے پوری طرح رنگین تھا پھر بھی وہ پوری طرح مستعد اور

اکتوبر ۲۰۱۷ء

تازہ دم دکھائی دے رہا تھا۔
 مرشد اٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔
 ”خجری الوقت تم فیروزہ کو لے کر مکان پر چلے جاؤ
 میں تمہیں وہیں آ کر ملتا ہوں۔“
 ”بالکل نہیں..... جدھر چلنا ہے اکتھے چلیں گے۔“
 ”بحث نہیں کرو۔“ مرشد کے لہجے میں سختی اور بے
 زاری دہرائی۔

”جیسا کہہ رہا ہوں خاموشی سے ویسا ہی کرو، تم فیروزہ
 کے ساتھ نکلو یہاں سے میں ادھر کا حساب چکنا کر آتا ہوں
 اور اگر بالفرض مجھے ایمر جنسی ادھر سے کہیں اور جانا پڑا تو تم
 صبح اسے لاہور والی گاڑی میں چڑھا دینا اور مکان پر میرا
 انتظار کرنا۔“

”اور میں.....!“ عقب سے زریون کی آواز پر مرشد
 نے پلٹ کر دیکھا زریون بوتل پکڑے اس کے پیچھے کھڑا تھا
 میں کیا کروں گا کس لیے آیا ہوں میں یہاں تم لوگوں کا یہ
 نالکہ دیکھنے..... نہیں۔“

”آپ بتائیں کس لیے آئے ہیں آپ؟“ مرشد نے
 سنجیدگی سے دریافت کیا زریون نے ایک بار بھر بوتل منہ
 سے لگالی ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور فیروزہ کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے بولا۔

”اسے کہاں بھیج رہے ہو؟“
 ”جہاں سے اسے لایا گیا ہے۔“
 ”بھیجنے کے لیے نہیں لایا گیا کم از کم آج کے آج تو
 نہیں کل صبح سوچیں گے۔“ وہ چھوٹے قدموں چلتا
 صوفے کے برابر آ کھڑا ہوا انکا ہنس فیروزہ کے چہرے پر بھی
 تھیں جہاں ناگواری پھیلی ہوئی تھی زریون براہ راست اس
 سے مخاطب ہوا۔

”دیکھ لیں فیروزہ جی ہم نے انتظار کیا تھا کہ تمام رات
 تسلی اور یکسوئی سے آپ کو سنیں دیکھ سکیں درمیان میں
 کسی قسم کی مداخلت یا بد مزگی نہ ہو ذرا سی بھی لیکن دیکھ لیں
 ہر دفعہ ہر دفعہ ارمان دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔“

”آپ جب بھی ہمارے یہاں تشریف لائے ہم نے
 آپ کو عزت سے بٹھایا اور آپ..... آپ نے ہمیں بد
 معاشوں کی مدد سے اٹھوایا عزت اور قدردانی کا آپ کے

یہاں یہی صلہ ہوتا ہے؟“ فیروزہ نے اپنے لہجے کی ناگواری
 اور خجی کو چھپانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی زریون
 کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
 ”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے ڈیئر
 فیروزہ۔“ اس نے قدرے جھک کر فیروزہ کا ہاتھ تھاما
 فیروزہ نے فوراً جھٹکے سے ہاتھ چمڑا لیا۔
 ”ہمارے اور آپ کے درمیان کس تخت کی جنگ
 ہے۔“

”جنگ نہیں..... محبت ہے محبت ہے آپ سے ہمیں۔“
 ”اس بد معاشی اور سینہ زوری کو آپ محبت کہتے ہیں
 افسوس ہے ہمیں آپ کی اس محبت پر۔“

”وہاں آپ کے ارد گرد گدھوں کی جو منڈی رہتی ہے
 اس نے ہمیں ایسی گستاخی کرنے پر مجبور کر دیا آپ ہمارے
 جذبات سمجھنے کی کوشش کریں تو کہیں پیٹھ کراتے ہیں
 چلیں اوپر چلتے ہیں۔“ زریون نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ
 تھام لیا نٹے کی خماری پوری طرح اس کی آنکھوں سے
 جھٹکنے کی تھی فیروزہ نے ہاتھ چمڑا نا چا لیکن اس بار زریون
 کی گرفت مضبوط تھی۔

”ہاتھ چھوڑیں ہمارا۔“ فیروزہ نے ہاتھ چمڑانے کے
 لیے زور لگایا خجری نے بے چینی سے مرشد کی طرف دیکھا
 جس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈی تھی یہ زریون کی
 طبیعت مزاج کا حصہ تھا یا شدید شراب کا اثر بہر حال وہ حد
 سے زیادہ بڑھ رہا تھا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی دیر میں
 مرشد کی لات یا گھونے کا نشانہ بن چکا ہوتا لیکن زریون
 کے حوالے سے مرشد اپنے ہاتھوں پیروں کو دوزخیں میں
 جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا دو حوالے زریون کا حصار تھے ایک
 یہ کہ وہ سیدزادہ تھا اور دوسرا یہ کہ وہ بڑا یازو یک سے وہ حجاب
 سرکار کا رشتے دار بھی تھا حجاب سرکار جو اسے ہر چیز سے
 بڑھ کر عزیز تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

